180-447

ہر معلم اور معلّمہ کو چاہیے کہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے جن کو اپنا کر وہ حقیقتاً معلم خیر بن سکتا ہے۔ قرآن وحدیث اکابرین و بزرگان کی تعلیمات کی روشنی میں اساتذہ کرام کے لیے ہدایات وارشادات پر مشتمل راہنما کتاب

# مثالی استاد


مُرتّب
حافظ محبوب احمد خان



ناشر
مکتبۃ العلم
۱۸۔اردو بازار لاہور۔ پاکستان

ہر معلم اور معلمہ کو چاہیے کہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے جن کو اپنا کر وہ حقیقتاً معلم خیر بن سکتا ہے۔ قرآن و حدیث اکابرین و بزرگان کی تعلیمات کی روشنی میں اساتذہ کرام کے لئے ہدایات وارشادات پر مشتمل راہنما کتاب

# مثالی استاد

مؤلفہ

حافظ محبوب احمد خان

مکتبۃ العلم
۱۸- اردو بازار ٥ لاہور ٥ پاکستان
7231788-7211788

نام کتاب ......... مثالی استاد

تصنیف ......... حافظ محبوب احمد خان

طابع ......... خالد مقبول

مطبع ......... افضل شریف پرنٹرز

ملنے کے پتے

❖ مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7224228

❖ مکتبہ علوم اسلامیہ اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور 7221395

❖ مکتبہ جویریہ ۱۸ - اردو بازار ○ لاہور ○ پاکستان 7211788

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لئے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔

(ادارہ)

# آئینۂ کتاب

| عنوان | صفحہ |
|---|---|

| عنوان | صفحہ |
| --- | --- |

عنوان | صفحہ

| عنوان | صفحہ |
| --- | --- |

| عنوان | صفحہ |
|---|---|
|  |

| عنوان | صفحہ |
|---|---|

| عنوان | صفحہ |
|---|---|
| ۱۰ | ۲۷۳ |

# اداروں کی تنظیم کے اصول

| عنوان | صفحہ |
|---|---|
| شعبہ علم | |
| شعبہ جذبات | ۲۹۵ |
| شعبہ حرکت جسمانی | |
| تدریسی اکائی کے لئے امتحان کی منصوبہ بندی | ۲۹۶ |
| مقاصد کا تعین اور درجہ بندی | |
| مقاصد کی ترتیب اور وقت کا تعین | |
| طلبہ کے رویہ میں تبدیلی کی جانچ | ۲۹۷ |
| مناسب امتحانی طریقوں کا استعمال | |
| نصاب کے اہم حصوں کی تکمیل کا جائزہ | |
| امتحان کی نوعیت سے مقصد کی عکاسی | |
| امتحان کی تیاری | ۲۹۸ |
| امتحان کا ابتدائی مسودہ بعجلت ممکنہ مرتب کیا جائے | |
| امتحان میں ایک سے زائد قسم کے سوالات ہوں | ۲۹۹ |
| امتحان کے تقریباً نصف سوالات مشکل ہوں | |
| امتحان کے ابتدائی خاکہ میں مطلوبہ تعداد سے زائد سوالات ہوں | ۳۰۱ |
| امتحان کا تنقیدی جائزہ | |
| سوالات کی عبارت سے جواب کا تعین | ۳۰۲ |
| سوال کے صرف ایک حصہ سے نہیں بلکہ پورے سوال سے جواب کا تعین ہو | ۳۰۳ |
| ایک طرح کے سوالات ایک ساتھ ہوں | |

| صفحہ | عنوان |
|---|---|

| صفحہ | عنوان |
|---|---|
| ۴۰۱ | اکابر کی تحریریں |
| | طالب علم کی بھلائی حضور ﷺ کی وصیت |
| ۴۰۲ | شاگردوں میں نشاط وشوق کی انگیخت |
| ۴۰۴ | جب نااہل دینی خدمات کے متولی بن جائیں |
| | شاگرد کے تین حقوق |
| ۴۰۶ | طلباء کی استعداد بھی ملحوظ رہے |
| ۴۰۷ | کوئی فن یا کتاب کسی طالبِ علم کے لئے مضر ہو تو روکنا چاہئے |
| | شاگردوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرنا چاہئے |
| ۴۰۸ | شاگرد کے لئے اللہ تعالیٰ سے علمِ نافع کی دعا بھی کرنی چاہئے |
| | شاگرد کی دلجوئی کے متعلق ایک مثال۔ |
| ۴۰۹ | اگر کوئی بات غصہ میں کہنے سے شاگرد کے لئے بہتر ہو تو کہے |
| ۴۱۰ | بیوی کی تربیت وتادیب کا شرعی حکم |
| ۴۱۱ | شاگردوں کی تادیب کیسی ہو |
| ۴۱۳ | نظریہ تعلیم وتربیت |
| ۴۲۲ | جامع نصاب تعلیم |
| ۴۲۵ | اقبال سیکولر تعلیم کے مخالف ہیں |
| ۴۲۶ | اصطلاح سیکولر کا مفہوم |
| ۴۲۷ | اصطلاح سیکولرزم کے واضع کا تعارف |
| ۴۲۹ | اقبال اور سیکولرازم |
| ۴۳۳ | سیکولر تعلیم کا مفہوم |

# مراجع ومصادر


۱ ماہنامہ افکار معلم
۲ مکالماتِ نبوی (حضرتِ مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہرویؒ)
۳ تعلیمی نفسیات (چودہری اللہ داد چیمہ)
۴ رہنمائے اساتذہ (موسیٰ خان)
۵ مثالی استاد (مولانا عبدالمجید حنیف)
۶ غلطیوں کی اصلاح کا نبوی طریقہ کار
۷ بہشتی زیور
۸ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی مضامین
۹ تفسیر عثمانی
۱۰ انسانیت (نعیم صدیقی)

# مُقدّمہ

اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران)

''حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان کیا جبکہ اُن میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے قبل صریح غلطی میں تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کر کے اور شریعت اسلامیہ کے مطابق زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو جہنم کی خوفناک آتش سے بچائیں اور اپنے قریبی اور جاننے والوں کو جہنم سے بچائیں اور جہنم سے اسی صورت میں محفوظ رہتا ہے کہ اس کا عقیدہ قرآن وسنت کے مطابق ہو' اعمال سنتِ نبویؐ کے مطابق ہوں اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

ہر بچہ فطرتِ انسانی کے قریب پیدا ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے والدین یا استاد کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی تربیت کرے تاکہ اس کے بچے بھی قیامت کے دن کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ ہم سب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں جواب دہ ہیں' ہم سے ہمارے بچوں کی کفالت کے بارے میں ہی سوال نہ کیا جائے گا بلکہ اس کی

تربیت اور اخلاق و کردار کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔

بچوں کے دلوں میں دلائل و حقائق کے ساتھ ایمان پیدا کرنا' انہیں قرآن مجید کی تعلیم دلانا' اسلامی عادات و آداب سکھانا اور ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت بٹھانا مسلم معاشرے کی ہمیشہ سے روایت رہی ہے اور اس میں اساتذہ کرام کا مقام سب سے بلند ہے۔

آج ہم اپنے معاشرے میں بھی دیکھ رہے ہیں کہ بچوں کی دینی و اسلامی تربیت سے صرفِ نظر کرنے کی وجہ سے بچے جوں جوں بڑے ہو رہے ہیں اساتذہ سے باغی ہو رہے ہیں۔ اساتذہ کی بڑی اکثریت اولاد کی وجہ سے پریشان ہے کہ وہ ان کا کہنا نہیں مانتے اور ان کا احترام نہیں کرتے۔ اگر بچوں کی صحیح اسلامی تربیت کی جائے گی تو وہ اپنے رب کے بھی فرمانبردار اور مطیع ہوں گے اور اس کے بعد اپنے اساتذہ کے بھی اور اس طرح دنیا میں بھی سکون اور ٹھنڈک محسوس ہوگی اور آخرت میں بھی انہیں بچوں کی دینی تربیت کا صلہ ملے گا اور اس تربیت کی وجہ سے ان کی روحانی اولاد بھی ان کے پیچھے پیچھے جنت میں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ﴾ (التحریم: ۲۱)

''اور جو لوگ بھی ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہِ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی' ہم ان کی اولاد کو بھی ان (کے درجے) تک پہنچا دیں گے' اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے''۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ آج کا استاد شاید اُس معیار پہ نہیں رہا جس کی مثال ہمارے اسلاف سے صدیوں سے چلی آ رہی ہے لیکن کیا یہ صرف ایک ہی شعبہ ہے جس میں ہم روبہ انحطاط ہے......؟ نہیں! قطعاً نہیں۔

جب معاشرہ من حیث کلی ہی انحطاط کا شکار ہو تو پھر بہت کم شعبے بچتے ہیں جن

میں اضمحلال نہیں پایا جاتا۔ لیکن ہمارے لیکن آج بھی یہ بات کافی حد تک باعث اطمینان ہے کہ اس شعبے میں آج بھی ایسی نابغہ روزگار ہستیاں باقی ہیں (خاص طور پر مدارس کے شعبے میں) جن کی وجہ سے اس شعبے کا کچھ بھرم باقی ہے۔

ان مدارس کے علماء پر فقط ایک ہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ بے جا سختی کرتے ہیں اس کے لئے تو ہم وہی حدیث بیان کئے دیتے ہیں جو کہ بندہ جب اپنا پہلا خطبہ دینے لگا تھا تو استادِ محترم نے بطورِ ہدایت ارشاد فرمائی تھی:

وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَجُلاً كَا نَ فِيْمَنْ كَا نَ قَبْلَ كُمْ اَ تَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهُ فَقِيْلَ لَهُ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ قَالَ مَا اَعْلَمُ قِيْلَ لَهٗ اُنْظُرْ قَالَ مَا اَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ اَنِّى كُنْتُ اُ بَا يِعُ النَّاسَ فِى الدُّنْيَا وَاُجَا زِيْهِمْ فَاُنْظِرُ الْمُوْ سِرَ وَاَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ فَاَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (متفق عليه وفى رواية لمسلم نحوه) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَا مِرٍ وَاَبِىْ مَسْعُوْدِ الْاَ نْصَارِىِّ فَقَالَ اللّٰهُ اَنَا اَحَقُّ بِذَا مِنْكَ تَجَاوَزُوْا عَنْ عَبْدِىْ .

صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب فضل انظار المعسر، ح ١٥٦٠

''اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں (یعنی گزشتہ امتوں میں) سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ جب اس کے پاس موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو نے کوئی نیک کام کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے یاد نہیں ہے (کہ میں نے کوئی نیک کام کیا ہو) اس سے پھر کہا گیا کہ اچھی طرح سوچ لے اس نے کہا کہ مجھے قطعاً یاد نہیں آرہا ہے ہاں (اتنا ضرور جانتا ہوں کہ) میں دنیا میں جب لوگوں سے (خرید وفروخت کے) معاملات کیا کرتا تھا تو تقاضا کے وقت (یعنی مطالبات کی وصولی میں) ان پر احسان کیا کرتا تھا بایں طور کہ مستطیع لوگوں کو تو مہلت دے دیتا تھا اور جو نادار ہوتے ان کو معاف کر دیتا تھا (یعنی اپنے

مطالبات کا کوئی حصہ یا پورا مطالبہ ان کے لئے معاف کر دیتا تھا) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس کے اسی عمل سے خوش ہو کر) اس کو جنت میں داخل کر دیا"۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک اور روایت میں جو عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے اسی کے مثل (یعنی کچھ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ) نقل کی ہے' یہ الفاظ ہیں کہ (جب اس شخص نے اپنا یہ عمل بیان کیا) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس کا (یعنی معاف کرنے کا) حق تجھ سے زیادہ رکھتا ہوں (اور پھر فرشتوں سے کہا کہ) میرے اس بندہ سے درگزر کرو"۔

اللہ عزوجل اس کتاب کو بندہ اور اس کے اعوان و انصار کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

حافظ محبوب احمد خانؔ
۱۴۲۵ھ۔ بمطابق ۲۰۰۵ء

۱

# اسلامی فلسفۂ تعلیم وطریق تربیت

## باب : ①

اسلامی فلسفہ حیات کے نقطۂ نظر سے تعلیم یہ ہے کہ جو انسان کو ہدایت الٰہی کی روشنی میں ذہنی، جسمانی اور طبعی قوتوں کے ذریعے اس طرح تصرف کے قابل بنائے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا فروغ رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ بنے اور بالآخر اُخروی فوز و فلاح حاصل ہو۔ یہ اجمالی تعریف، تعلیم کی وہ فکری اساس متعین کرتی ہے، جس پر اسلامی نظام تعلیم و تربیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ذیل میں اس سے متعلق چند اہم نکات پر مشتمل ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

**اسلام دین ہے مذہب نہیں:**

☆ فلسفہ تعلیم کے ضمن میں سب سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلام محض مذہب نہیں[1] بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ایک دین[2] یعنی ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ وہ کسی مجرد علمی فکری یا فلسفہ تک محدود نہیں رہتا، بلکہ صالح فکر اور صالح عمل کے امتزاج سے زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں کی رہنمائی کے لئے ایک جامع، متوازن اور صحت مند تحریک برپا کرتا ہے۔

☆ اسلامی فلسفہ تعلیم کا اساسی نکتہ یہ ہے کہ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی، بلکہ کائنات کی پیدائش ایک علیم و خبیر ہستی (اللہ تعالیٰ) کے منصوبے، ارادے اور علم کا تقاضا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

---

[1] مذہب تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے: عقائد۔ رسومات اور عبادات مثلاً ہندو مذہب بدھ مذہب۔ یہ مذاہب انسان کی انفرادی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہیں جبکہ اجتماعی مسائل سے صرف نظر کرتے ہیں۔

[2] دین ایک مکمل نظامِ زندگی ہوتا ہے جو مذہب سے اس طرح اختلاف رکھتا ہے کہ انفرادی زندگی کے علاوہ اجتماعیت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ مثلاً دین ایک معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور اخلاقی نظام پر مشتمل ہوتا ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (البقرہ)

''اے لوگو عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اوران لوگوں کو بھی کہ تم سے پہلے گزر چکے ہیں عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی پھر پردۂ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو۔''

حقیقت اصلیہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' علم کا حقیقی سرچشمہ بھی وہی ہے' سب سے برتر' قطعی اور دائمی' سرچشمہ علم وحی الٰہی ہے اور اس کی صورت قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات با مقصد بنائی اور اس میں انسان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے خلیفہ یا نائب کی ہے' جس کی زندگی کا اہم مقصد اللہ کی بزرگی ہے' اس حوالے سے قدرِ اعلیٰ رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾

''اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے ربّ نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔''

☆ تعلیم کی اسلامی تشکیل میں اصل فکری نقطہ یہی تصور قدر ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی امور میں اللہ کی رضا کے سامنے بلاچون و چرا سرِتسلیم خم کر دے اور خدا کا اطاعت شعار بن جائے۔ اس سلسلے میں مستقل کسوٹی خدا کا دین ہے یعنی جو کچھ دین اسلام میں ہے وہ خیر' نافع اور پسندیدہ ہے اور جو اس سے باہر ہے

وہ شر، غیر نافع اور غیر پسندیدہ ہے۔ اس تعلیم وتدریس اور مباحث و مسائل کے ضمن میں تعلیم نہ غیر جانب دار ہے اور نہ اقدار سے بے نیاز۔

دنیا کی یہ زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی دائمی ہے، جہاں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (الانعام)

''اور دنیوی زندگانی تو کچھ بھی نہیں بجز لعب ولہو کے اور پچھلا گھر متقیوں کے لئے بہتر ہے کیا تم سوچتے سمجھتے نہیں۔''

حقیقت میں اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل، تنفیذ اور تکمیل میں اصل روح قوتِ نافذہ اسلام کا تصور آخرت ہے۔ یہی اسلامی احتساب کے ماڈل کی اصل روح ہے جو معاشرے کے ہر فرد اور ہر ادارے کو صحت مند بناتی ہے۔

☆ بحیثیت مجموعی اسلام کے تعلیمی نظام فکر کا مستقل، اعلیٰ اور بالاتر مآخذ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ باقی تمام ذرائع علم چاہے وہ تعقلی ہوں یا حسیاتی ہوں اسی برتر سرچشمہ علم یعنی وحی الٰہی کے تابع ہیں۔

## مقاصدِ تعلیم:

تعلیم کا سب سے اہم نصب العین ایسے انسان کی تیاری ہے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔ اس تصور نیابت کی روشنی میں حصول تعلیم کا اصل مقصد یہ حکمت وبصیرت حاصل کرنا ہے کہ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں کون سا نقطہ نظر اور کون سا طریق عمل دین کے مطابق ہے۔ اصل میں مقاصد تعلیم کی تشکیل میں قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ سے ماخوذ اقدار ہی سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ اس حوالے سے اسلامی نظام فکر، ایسی نافع تعلیم کا داعی ہے جو تعلیم حاصل کرنے والے کو اس کے اصل مقصود یعنی خلافت ارضی کے فرائض اور تقاضوں سے واقف کرائے۔ چنانچہ یہ

نظام فکر ایسی مجرد تعلیم کا قائل نہیں، جو اسلامی تہذیب کی نمائندہ اور ترجمان نہ ہو۔ خلاصہ کے طور پر اس رہنما اصول کی روشنی میں اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل میں درج ذیل مقاصد کو اہمیت حاصل ہے:

## ایمان کی استقامت اور عمل صالح کی تربیت:

- ☆ مقصدِ حیات اور ہدایت الٰہی کے علم کا حصول۔
- ☆ قیادت عالم کے فرائض کی اہلیت۔
- ☆ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے تیاری۔
- ☆ امت واحدہ کی تشکیل۔
- ☆ مادی اور عسکری قوت کا حصول۔
- ☆ تحقیقی اور اجتہادی صلاحیتوں کی نشو ونما۔
- ☆ جہاد فی سبیل اللہ اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کی پختگی۔

## تعلیم کا نصاب کس طرح مرتب کیا جاتا ہے؟

☆ نصابِ تعلیم کی اہم علمیاتی اساس ''العلم'' ہے جو درحقیقت ایک جامع اور منفرد نظریہ تعلیم ہے جو انسان کے مادی وجود اور روحانی وجود کی جائز ضرورتوں اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس طرح بالآخر اس کے مادی یا حیاتیاتی وجود کو روحانی یا اخلاقی وجود کے تابع کر کے ایک متوازن شخصیت تیار کرتا ہے۔ روحانی، اخلاقی یا اعتقادی وجود کی ضرورتوں سے نصاب تعلیم کو بے بنیاد کرنا یا انہیں زندگی سے الگ کر کے ایک سیکولر انداز میں پیش کرنا، ایک ایسی منتشر شخصیت تیار کرنے کا باعث ہوگا، جو اسلامی معاشرے میں لازماً عدم تسویہ کا شکار ہوگی۔

☆ علم بلاشبہ ایک ''اکائی'' ہے۔ البتہ بعض مسلم مفکرین نے نصابِ تعلیم کی

وضاحت میں علوم کی درجہ بندی کی ہے' لیکن ان کا مقصود بہر حال یہ واضح کرنا تھا کہ انسانی تدبر و تفکر اور تجربہ و تحقیق ضروری ہیں' لیکن انہیں لازماً دائمی اور برتر ذریعہ علم کے تابع مرتب کرنا ہوگا۔ علم کو دو اقسام ہیں علم الادیان اور علم الابدان اسلامی نظام تعلیم میں الادیان کو برتری حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس کا مقصود خود انسان اور اس کی فوز و فلاح ہے جبکہ علم الابدان انسان کو بطور خلیفہ دنیا میں اپنے فرائض ادا کرنے میں سہولت دیتا ہے لہٰذا اسلامی نظام تعلیم ان دونوں عناصر پر مشتمل ہوگا۔ یہ نہیں کہ اسلامیات کو بطور ضمیمہ پڑھایا جائے اور باقی نصاب تعلیم پر علم الابدان کا غلبہ ہو۔ پہلی اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقدہ مکہ المکرمہ نے جہاں علم کی دو صورتوں یعنی ہدایتی یا الہامی علم اور وضعی یا اکتسابی علم کا حصول ضروری قرار دیا ہے' وہاں ہدایتی' الہامی یا دینی علم کو سب پر فوقیت دی ہے۔ اس طرح جب وضعی' اکتسابی یا دنیوی علم ہدایتی یا دینی علم کے تابع ہوں گے' تو یہی ''العلم'' کی صورت ہوگی۔ چنانچہ امام غزالیؒ کی اصطلاح میں ''فرض عین'' کا جاننا ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے اور یہی وہ نصاب ہے جو ہر مرد اور عورت پر فرض کیا گیا ہے اس تناظر میں قرآن حکیم اور مطالعۂ حدیث کو نصاب میں بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔

☆ ہر سطح کے نصاب کی تشکیل میں رہنما اصول' دین و دنیا کی وحدت' تشکیل سیرت اور مسلم معاشرے کی جائز ضروریات کی تکمیل ہیں۔ یوں اسلامی نصاب تعلیم' سیکولر اور ملحدانہ نظریات کی نفی کرتے ہوئے افراد معاشرہ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دنیا کو اس راستے پر لائیں جو معروف ہے اور اس سے روکیں جو منکرات کی طرف لے جاتا ہے۔ نصابِ تعلیم کا یہی وہ قائدانہ وظیفہ ہے جو افراد کو قیادت عالم کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل بناتا ہے۔

☆ ہر سطح کے نصاب تعلیم کی تدوین' ہر مضمون کے تدریسی لوازمہ' غرض پورے نظام

تربیت کی تشکیل وتعمیر میں درج ذیل پانچ اساسی عناصر کو پیش نظر رکھا جاتا ہے یہ اساسی عناصر وہ اہم نکات ہیں، جنہیں قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد کے طور پر بیان کیا ہے۔ان مقاصد کے حوالے سے امت مسلمہ کے ہر فرد بالخصوص تعلیم وتعلم سے وابستہ افراد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تربیت افراد کے ضمن میں ان مقاصد کو پیش نظر رکھیں ...... قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۶۴﴾ (آل عمران)

''حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان کیا جبکہ اُن میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے قبل صریح غلطی میں تھے''۔

## اوّلین ترجیحات:

ا) تلاوتِ آیات یعنی قرآن حکیم کی تلاوت۔

ب) تزکیہ یعنی اخلاقی تربیت۔

ج) تعلیم کتاب یعنی تفہیم قرآن۔

د) تعلیم حکمت یعنی خدا کی عطا کردہ قابلیتوں کو دعوت الی الخیر کیلئے بروئے کار لانا۔

ہ) ایسے امور کی تعلیم جو پہلے سے علم میں نہ تھی یعنی سمع و بصر اور افراد کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تحقیق واجتہاد کی قابلیت۔

ر) غیر مسلم نظام تعلیم کے برعکس جہاں مادی فوائد کو ترجیح دی جاتی ہے اسلام نظام تعلیم میں حاوی علوم کو ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

☆ نصابِ تعلیم میں ترجیحات کے نقطہ نظر سے قرآن وسنت کی تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے عمرانی اور طبعی علوم ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور عمرانی وطبعی علوم میں بھی عمرانی علوم کو فوقیت دی جاتی ہے' کیونکہ ان علوم کے ذریعے انسانی زندگی کے مسائل اور تہذیبی معیارات سے بحث کی جاتی ہے۔ اس سے اصل مقصد یہ ہے کہ اسلامی نصابات کی ترجیحات اور لوازمات میں تعلیم کے تہذیبی شعور کو مادی شعور پر بالادستی حاصل ہو۔ نصاب تعلیم میں سائنس' ٹیکنالوجی اور جدید عصری (مطلوب) فنی علوم کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے اور قیادت عالم کے لئے ان کا حصول اہمیت بھی رکھتا ہے' لیکن ان تمام علوم کی تحصیل' ترویج اور تحقیق میں اسلامی فکر کو لازمی حیثیت حاصل ہوگی ورنہ اس کے بغیر اس بات کا خدشہ موجود رہتا ہے کہ انسان آفاقی قدروں بالخصوص ایثار' قربانی' عدل و احسان سے دور ہو جائے اور بالآخر ظالمانہ روش اختیار کر لے۔

## اساتذہ کی تربیت:

☆ اسلامی فلسفہ تعلیم میں استاد ایک واجب الاحترام شخصیت ہے اس کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ وارث پیغمبر ہے' اسلامی نظام تعلیم میں استاد کی محوری حیثیت کے پیش نظر' اس کی تعلیم وتربیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تربیت اس بنیادی اصول پر تشکیل پاتی ہے کہ استاد کا فریضہ صرف معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دینا بھی ہے۔

## استاد کو مربی داعی اور مزکی ہونا چاہئے:

☆ علم اور تربیت کے امتزاج سے تشکیل پایا ہوا نظام ہی اعلیٰ نظام ہے۔ تربیتی نقطہ نظر سے استاد کی شخصیت بڑی منفرد اور نمایاں ہے' جس سے طلبہ اچھائی کے

معاملے میں بھی اور برائی کے معاملے میں اثر قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ استاد اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ اس کا اپنا علمی اور اخلاقی تشخص بھی مثالی ہو اور اس کے طلبہ کا معیار علم اور معیار اخلاق بھی بلند ہو اسی لئے اسلامی نظام تربیت میں استاد محض نفس مضمون اور طریقہ ہائے تدریس کا ماہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مربی' داعی' مزکی اور مصلح بھی ہوتا ہے اور حقیقت میں اس کا یہ داعیانہ کردار' اس کے دیگر وظائف پر غالب ہوتا ہے یہی وہ تناظر ہے جس میں تربیت اساتذہ کے سارے نصابی و ہم نصابی عمل کی اسلامی تشکیل کی جاتی ہے۔

☆ ہر سطح کے اداروں میں اساتذہ کے انتخاب میں علمی اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات حیات سے وابستگی اور سیرت و کردار کی پختگی کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے' بلکہ ثانی الذکر کو اوّل الذکر پر فوقیت دی جاتی ہے۔

☆ اسلامی ریاست کا کردار معلمانہ ہوتا ہے وہ اس بات کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ اساتذہ کا معاشرتی اور معاشی مقام و مرتبہ بلند ہو ان کو وہ تمام ضروری سہولتیں میسر ہوں جو ایک اسلامی فلاحی ریاست کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ اسلامی ریاست کے بجٹ میں اولیت' معلم اور متعلم کو دی جاتی ہے اور حقیقت میں ان کو فوقیت دیئے بغیر ایک مہذب ریاست کا تصور ممکن نہیں۔

## تعلیم کا معیار:

☆ اسلامی فلسفہ میں جہاں تعلیم کا تصور وسیع ہے' اسی طرح تعلیمی معیار کا تصور بھی وسیع ہے یعنی معیار کی جانچ کرتے ہوئے طالب علم کی تعلیمی استعداد ہی نہیں' بلکہ اس کی شخصیت و کردار کو بھی دیکھا جاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ اس نظام تعلیم میں عالم بے عمل کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

## بچوں کی اخلاق سازی کو اوّلیت دیجئے:

☆ دورانِ تعلیم طلبہ کے اخلاق وکردار کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ تعلیمی معیار کو جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ آیا ضروری معلومات کے ساتھ طلبہ میں اسلامی فکر اور اسلامی طرزِ عمل بھی پیدا ہوا ہے یا نہیں۔ چنانچہ طالب علم کے علمی معیار کے برتر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مضمون میں کامل استعداد رکھتا ہو بلکہ اخلاق وکردار میں بھی مثالی ہو'اس مقصد کے حصول کے لئے اساتذہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ طلبہ کی اصلاح وتعمیر اور ان کی ہمہ گیر نشو ونما کے پیش نظر ان کے جامع علمی اور اخلاق ریکارڈ مرتب کریں۔

## استاد کو قابل ہونے کے ساتھ ساتھ امین بھی ہونا چاہئے:

مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور روایات کے حوالے سے ہر چند کہ داخلی طرزِ امتحان کو اہمیت حاصل ہے' لیکن امتحانات کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ مقاصد کی تکمیل کس حد تک ہوئی؟ چنانچہ نظامِ امتحان چاہے داخلی ہو یا خارجی یا دونوں کا امتزاج' ان کا اصل مقصود یہی ہوتا ہے کہ اہداف کی تحصیل وتکمیل خوب سے خوب تر ہو۔ بہرحال اس کے لئے جہاں طریق امتحان کا مؤثر ہونا ضروری ہے' وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس نظام کو چلانے والے اساتذہ اور منتظمین بھی قابل' دیانت دار اور امین ہوں اور اس حوالے سے ان کی تربیت بھی ہوئی ہو۔

## عربی زبان کی اہمیت:

☆ اسلام کے سارے اہم مآخذ چونکہ عربی زبان میں ہیں اس لئے اسلامی تہذیب کے تحفظ اور احیاء کے لئے اور اسلام کی روح کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تعلیم کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں اس

زبان کی تعلیم و تدریس ابتداء سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے نصاب میں بالعموم لازمی رہی ہے۔

## مسجد اوّلین معاشرتی ادارہ:

☆ طلبہ تک اسلامی ثقافتی ورثہ کی منتقلی کے لئے تعلیمی ادارہ اور مسجد کے تعلق کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا یہ دونوں روایت کم از کم دینی مدارس کی سطح تک آج بھی قائم ہے جہاں مسجد ہے' اس کے ساتھ مدرسہ بھی قائم ہے اور جہاں دینی مدرسہ ہے وہاں مسجد بھی قائم ہے۔ تعلیمی اداروں میں علمی' روحانی' اخلاقی' ذہنی اور جسمانی صحت کا انتظام کیا جاتا ہے' ان سرگرمیوں کی تکمیل میں ریاست کے تمام معاشرتی اداروں کا کردار ہے' لیکن مسجد ایک ایسا معاشرتی ادارہ ہے جس کو مرکزی مقام حاصل ہے۔

اسلامی نظریۂ تعلیم کی رو سے معلم اور متعلم دونوں قابل احترام ہیں۔ اسلام نافع علم کے سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو عبادت کہتا ہے۔ نافع علم کا چھپانا اور مضر علم کا پھیلانا دونوں یکساں بد دیانتی ہے۔ اس علم میں پختگی اور نافع دونوں صفات کا ہونا ضروری ہے۔ اس حوالے سے امت مسلمہ کے ہر فرد کو لازماً تعلیم و تعلم کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ چاہے یہ گزر رسمی ہو یا غیر رسمی۔ اس تناظر میں تعلیم عامہ' عمومی خواندگی اور تعلیم مسلسل کا انتظام اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ تعلیم کے فروغ کے لئے سرکاری کوششوں کے علاوہ نجی کوششیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں' لیکن ان سب کاوشوں کی فکری اساس اسلامی نظریۂ حیات ہی ہے۔ حقیقت میں اسلامی ریاست کی مادی سہولتیں اور ابلاغ کے تمام ذرائع' تعلیم' تربیت' تزکیہ اور تبلیغ کے لئے ہی وقف ہوتے ہیں۔

## دنیاوی تعلیم مہیا کرنے والوں کی ایک غلطی:

آج اسلامی ریاستوں میں مغرب کے زیر اثر جو خواندگی کی تحریکیں اور دیگر نجی تعلیمی تنظیمیں کام کر رہی ہیں' وہ تہذیبی لحاظ سے اس لئے ناکام ہو رہی ہیں کہ انہوں نے اپنی نصابی سرگرمیوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات (جس نے ساری کائنات اور کائنات کی ہر شے پیدا کی) سے مربوط نہیں کیا۔ حالانکہ مسلمانوں کو پہلی ہدایت ہی یہ دی گئی کہ پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھو' لیکن اس کے لئے شرط یہ رکھی کہ پڑھنے اور لکھنے کا تعلق اپنے رب سے جوڑو' کیونکہ انسان کو جو کچھ حاصل ہوا' وہ اللہ ہی کی عنایت ہے۔ اس رشتہ و تعلق کے بغیر تعلیم و تعلم کی تحریکیں' اسلامی معاشرہ کے مسائل کا حل نہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

﴿اقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ﴾ (العلق)

''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا''۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا''۔

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۙ﴾ (القلم)

''قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھتے ہیں''۔

ہر شعبۂ زندگی' بالخصوص تعلیمی و انتظامی شعبہ میں قیادت کے منصب پر فائز افراد کی تربیت اور قابل افراد کا انتخاب اسلامی ریاست کی اوّلین ذمہ داری ہے' ایسے افراد کی تعلیمی اور پیشہ وارانہ قابلیت کی اہمیت اپنی جگہ' لیکن اسلامی نظام فکر میں ان کی اخلاقی پاکیزگی اور ان کے مجموعی اسلامی تشخص کو فوقیت دی جاتی ہے کیونکہ صالح علمی قیادت کے بغیر تعمیری تعلیمی انقلاب ممکن نہیں۔

# طریقۂ تعلیم و تربیت

قرآن حکیم وہ کتاب انقلاب ہے جس نے تعلیم و تربیت کے میدان میں انسانیت کے لئے نئے راستے متعارف کرائے' تاریخ عالم میں کسی معاشرے میں اتنی تیزی سے تبدیلی نہیں آئی جتنی تیزی سے تبدیلی قرآن کی بدولت عرب معاشرے میں دیکھنے میں آئی۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی کتاب نے اتنے اذہان کو متاثر نہیں کیا جتنا کہ قرآن مجید نے کیا ہے۔ لہٰذا اسلامیات کا استاد ہو یا طالب علم' فن تعلیم و تربیت کے حوالے سے قرآنی اسلوب سے استفادہ کرنا لازمی' ضروری اور بنیادی عمل ہے۔

تربیت کے لغوی معنی پرورش کرنے اور نشوونما کرنے کے ہیں۔ جس طرح جسمانی تربیت کا مطلب جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کو اوجِ کمال تک پہنچانا ہے اسی طرح اخلاقی تربیت کا مقصد طالب علم کو باوقار' مہذب' عالم باعمل' شستہ' شائستہ اور اچھے اخلاق و آداب سکھانا ہے۔ دوسرے معنوں میں تعلیم و تربیت کے معنی اخلاق حسنہ کی ترویج اور عملی مشق ہے یعنی قرآنی تعلیمات کا مطمح نظر فرد کی تربیت کرکے اسے انسانیت کے اوجِ کمال تک پہنچانا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی تعلیم کے مقاصد درج ذیل ہیں:

## قرآنی تعلیم کے مقاصد:

① اچھے اور باعمل انسان بنانا۔
② نیابت الٰہی کے لئے تیار کرنا۔
③ کردار سازی کرنا۔
④ معرفت الٰہی سے آگاہ کرنا۔

⑤ سچے مسلمان بنانا۔
⑥ اسلام کے آفاقی پیغام کی اشاعت کرنا۔
⑦ افراط وتفریط سے پاک زندگی گزارنا۔
⑧ مکمل صالح اور اسلامی معاشرے کی تشکیل۔
⑨ تسخیر کائنات اور فطرت کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا۔
⑩ معرفت نفس کا ادراک۔
⑪ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم کرنا۔
⑫ عالمگیر معاشرہ کا قیام۔
⑬ احترام انسانیت کی تعلیم دینا۔
⑭ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا شعور دینا۔
⑮ معاشرتی انصاف اور عدل کا نظام قائم کرنا۔

## قرآنی طریقۂ تعلیم:

آیئے قرآن کے طریقۂ تعلیم و تربیت کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرتے ہیں:

## لکھنے پڑھنے کی اہمیت:

"قُرْآنٌ" دراصل "قَرَأَ یَقْرَأُ" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں پھر یہ اس لفظ "پڑھنے کے معنی میں اس لیے مستعمل ہوگیا کہ اس میں کلمات اور حروف کو جمع کیا جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے یہ مصدر ہے اور "قراءۃ" کے مترادف ہے۔ پھر بعد میں اسی مصدر سے معنوی مراد لیتے ہوئے اس کا اطلاق کلام اللہ پر کیا جانے لگا۔ گویا کہ قرآن کا مفہوم یہ ہوگا "پڑھی گئی کتاب یا پڑھا گیا کلام"۔

اقرأ کے بعد جو الفاظ نازل ہوئے ﴿بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱﴾ (العلق)

یعنی اس رب کے نام کے ساتھ جس نے تجھے پیدا کیا۔

قرآن مجید میں پہلی نازل ہونے والی سورت میں فرمایا گیا کہ انسان کو ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴾ یعنی قلم سے علم سکھایا۔ اس کے بعد سورۃ ''ن'' میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم اٹھائی ہے جس سے علم سیکھنے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

## تدریس کا اصول معلوم سے نامعلوم کی طرف:

تدریس میں نامعلوم سے معلوم کی طرف کا اصول ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ پہلی ہی وحی میں اس اصول کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ﴾ (العلق)

''اسے وہ علم دیا گیا جسے وہ نہیں جانتا تھا''۔

یعنی نامعلوم سے معلوم کی طرف۔

## ذہنی تیاری:

تعلیم کے حوالے سے پہلے ذہنی تیاری کرائی جاتی ہے اور اس کے بعد تعلیم دی جاتی ہے جیسا کہ سورۃ یوسف میں ہے:

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾

''اے میرے جیل کے ساتھیو! کیا ایک خدائے قہار سے بہت سے رب بہتر ہیں''۔

تعبیر بتانے سے پہلے یوسف علیہ السلام نے ان لوگوں کو درس توحید کی طرف راغب کیا یعنی ان کی دلچسپی سے فائدہ اٹھایا۔

## تعلیم وتدریس کی بابت قرآنی اسلوب واحکامات:

آیئے اب تعلیم وتربیت وتدریس کے حوالہ سے قرآنی اسلوب اور احکامات

کے بارے میں مختصراً جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

## ① استعارات کے ذریعے بات سمجھانا:

قرآن مجید کے اسلوبِ تدریس و تربیت میں استعارات کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ ان استعارات کے ذریعے قرآن مجید اپنی بات کو واضح فرمانے کا حکم دیتا ہے مثلاً سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾

''ان کی مثال ایسے ہے جیسے انہوں نے آگ جلائی پس جب اس آگ نے ماحول روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کے نور کو سلب کر دیا۔ پس انہیں اندھیرے میں چھوڑ دیا اور دیکھ نہیں سکتے''۔

## ② امثال کے ذریعے بات کو واضح کرنا:

قرآن مجید اپنی تدریس کے دوران امثال کے ذریعے بات کو واضح کرنے کا حکم دیتا ہے اور طالب علم تک اپنا مطمحِ نظر پہنچانے کا حکم دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کم و بیش ایک ہزار آیت امثال ہیں۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (البقرہ)

''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسے ہی ہے جیسے ایک دانہ بویا اور اس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے تو اجر کو بڑھا دیتا ہے''۔

## ③ تدبر و تفکر کی تعلیم:

دوران تربیت قرآن مجید انسان کو سوچنے اور فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان اپنی بھلائی کے لئے بہتر سے بہتر کی تلاش کر سکے۔ ارشاد فرمایا:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾﴾ (الغاشیہ)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہم نے اونٹ کو کیسا پیدا کیا اور آسمان کو کس طرح بلند کیا اور پہاڑوں کو کیسے نصب کیا''۔

ان آیات میں تخلیق انسانی' حیوانی و سماوی پر غور و فکر کا حکم ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرہ)

''بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں' کشتیاں جو دریا میں لوگوں کے فائدہ کے لئے رواں ہیں اور بارش میں جس کو اللہ تعالیٰ آسمان سے برساتا اور مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے اور زمین پر اس نے ہر قسم کے جانور پھیلائے ہیں اور ہوا کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں' عقل مندوں کے لئے خدا کی قدرت کی نشانیاں ہیں''۔

## ④ حالات کے مطابق تربیت:

قرآن مجید نے حالات کے مطابق تربیت دینے کا حکم دیا ہے قرآن میں جن

انبیاء کا ذکر ہوا ہے ان میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر ایک کو اپنے ماحول کے مطابق تیار کیا گیا۔ حضرت موسیٰ کو محل میں پرورش دی گئی تا کہ جب منصب نبوت کا فریضہ ادا کرنا ہو تو موسیٰ سیاست، نظام حکومت سے بخوبی واقف ہوں اور یہ ماحول ان کے لئے اجنبی نہ ہو۔ دوسرا پہلو جو ہمیں نظر آتا ہے کہ ان کی قوم حیل و حجت کرنے والی تھی جس کی بناء پر اپنے لئے مشکلات میں اضافہ کرتی چلی گئی۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی قوم قاتل کی تلاش کر رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور ان کے سوال و جواب کے مطابق گائے کے چناؤ میں ان کی مدد کی۔

## ⑤ تاریخ سے استشہاد:

قرآن نے تاریخ سے استشہاد کو بار بار استعمال کیا ہے۔ یہ قرآن کا تیسرا بڑا موضوع ہے۔ اقوام کے عروج و زوال کے وہ اسباب جو مسلّمہ ہیں قران نے اپنے مخاطب کے لئے استعمال کیا ہے۔ واقعات کو بطور عبرت استعمال کرتا ہے تا کہ مخاطب ان قوانین کو اچھی طرح جان لے جو اس کے عروج و زوال کا باعث بن سکتے ہیں۔ قرآن مجید سابقہ علم کو یاد دلا کر نئی تربیت کے مراحل طے کرنے کا حکم دیتا ہے مثلاً کفار مکہ جو اصحاب الفیل کے واقعہ سے واقف تھے، کو اپنی قدرت کاملہ یاد دلانے کے لئے سابقہ واقفیت کا طریقۂ تعلیم اختیار فرمایا۔ ارشاد ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱﴾ (الفیل)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا''۔

اسی طرح ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۷﴾ (البقرہ)

''اے بنی اسرائیل! ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیں اور تمہیں دو جہانوں پر فضیلت بخشی''۔

## ⑥ اخلاقی تعلیم وتربیت کالازمی جزو:

تربیت کے دوران اخلاقی تعلیم ایک لازمی جزو ہے۔اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

ا) قول وفعل میں تضاد کی مذمت: ارشادِ ربانی ہے:

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف)

''جوتم کرتے نہیں کہتے کیوں ہو''۔

### حیا اسلام کا جزو لاینفک:

ب) حیا شرطِ ایمان اور تربیت کا اہم جزو ہے۔معلم کے لئے اس کی تعلیم و تدریس لازم ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (البقرہ)

''وہ (بیویاں) تمہارا لباس ہیں اور تم ان بیویوں کا لباس ہو''۔

اسی طرح حیاداروں کو فلاح کی خوشخبری دے کر حیا کی تربیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ﴾ (المؤمنون)

''یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں''۔

### جھوٹ سے بچاؤ کی تربیت:

ج) جھوٹ سے بچنے کی تربیت: جھوٹ سے بچنے کی تعلیم وتربیت ہر معاشرے کا خاصہ رہی ہے۔اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر زور دیا ہے۔اسی طرح تربیت کے دوران وعدہ وفائی' سچائی' امانت' خیانت' عیب جوئی وغیرہ کے بارے میں قرآنی اسلوب ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔

### ⑦ مقرون سے مجرد:

جدید طریقۂ تعلیم وتربیت میں مجسم اشیاء کے تصور کے ذریعے غیر مجسم تصورات کی تربیت کی جاتی ہے۔ قرآن مجید اسی طریقہ تدریس کی واضح مثالیں دیتا ہے۔ مثلاً سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اور عزیر علیہ السلام کو دوبارہ زندہ کیا جانے کی عملی مثالیں دے کر لوگوں کے لئے اس عقیدہ کی تدریس کو آسان بنایا گیا۔

### ⑧ دلیل سے بھرپور انداز:

قرآن مجید کی ایک اور تدریسی حکمت عملی دلائل سے بھرپور انداز بھی ہے تاکہ بات کو سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئے مثلاً سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے مکالمے میں جب نمرود نے کہا کہ میں بھی زندہ کرسکتا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے یہ دلیل دے کر لاجواب کر دیا کہ میرا رب سورج مشرق سے طلوع کرتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے تو اے نمرود تو اس کا اُلٹ کر کے دکھا دے تو وہ لاجواب ہوگیا۔

### عقیدہ توحید کو تمام تعلیمات سے اولیت دیجئے:

اسی طرح عقیدۂ توحید کو سمجھانے کے لئے ارشادِ ربانی ہے کہ:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الانبیاء)

''اگر اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو فساد پھیل جاتا''۔

یہ طریقہ معلم کو اس بات پر اُبھارتا ہے کہ طلبہ کو دلائل سے مطمئن کیا جائے۔

### ⑨ آسانی سے مشکل کی طرف:

قرآن مجید میں ابتدائی نازل ہونے والی آیات اور ان کا اسلوب بیان آسان ہے بعد میں نازل ہونے والی آیات کا اسلوب بیان اور احکام پہلے کی نسبت مشکل ہیں گویا معلم کا طریقۂ تعلیم وتربیت آسان سے مشکل کی جانب ہونے کا اشارہ

دیا گیا ہے۔

## ⑩ استقرائی واستخراجی طریقۂ تعلیم:

جدید طریقہ ہائے تدریس میں استخراج اور استقراء کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝﴾ (التحریم)

''اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے نوح کی بی بی اور لوط کی بی بی کا حال بیان فرماتا ہے وہ دونوں ہمارے خاص بندوں میں سے دو بندوں کے نکاح میں تھیں سو ان عورتوں نے ان دونوں بندوں کا حق ضائع کیا تو وہ دونوں نیک بندے اللہ کے مقابلہ میں ان کے ذرا کام نہ آسکے اور حکم ہوگیا کہ اور جانے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی دوزخ میں جاؤ اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے فرعون کی بی بی کا حال بیان کرتا ہے جبکہ ان بی بی نے دعا کی اے میرے پروردگار میرے واسطے جنت میں اپنے قرب میں مکان بنائیے اور مجھ کو فرعون سے اور اس کے عمل سے محفوظ رکھیے اور مجھ کو تمام ظالم لوگوں سے محفوظ رکھیے اور عمران کی بیٹی مریم کا حال بیان کرتا ہے جنہوں نے اپنی ناموس کو محفوظ رکھا سو ہم نے ان کے چاک گریبان میں روح پھونک دی اور انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کی اور اس کی

کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت والوں میں سے تھیں۔"

⑪ تدریج کا حکم:

قرآن مجید تربیت کے دوران بتدریج سکھانے کا حامی ہے مثلاً شراب کی حرمت سے پہلے ارشاد ربانی ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (البقرہ)

"آپ سے وہ جوئے اور شراب کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہیں کہ ان دونوں میں گناہ زیادہ ہے اور فائدہ کم ہے"۔

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾

"جب تم نشے کی حالت ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ"۔

کہہ کر شراب سے نفرت دلائی گئی اور بعد ازاں:

﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (المائدہ)

"بے شک شراب، جوا اور پانسے شیطانی عمل ہیں ان سے بچو"۔

کہہ کر شراب کی حرمت کر دی گئی۔

منظم انداز میں مواد پیش کرنا:

رنگوں کی ترتیب تصور کہلاتی ہے۔ الہامات کی تنظیم شاعری کہلاتی ہے الفاظ کی ترتیب مضمون کہلاتی ہے۔ لہٰذا تدریس کے عمل کو اس وقت تقویت ملتی ہے جب مواد تنظیم کے ساتھ پیش کیا جائے اور قرآن میں ترتیل بدرجہ اتم موجود ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ (المزمل)

''یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو۔''

## طالب علم کے لیے آسانی پیش کرنا:

قرآن دورانِ تدریس آسان پسندی کا قائل ہے تاکہ طلبہ کی مشکلات کا ازالہ ہو جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر)

''اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے''۔

## قیادت کے لئے علم ضروری ہے:

علم اور تدریس علم وجہ قیادت ہے۔ اس حقیقت کو قرآن البقرۃ میں یوں اُبھارتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾

''خدا نے اس کو تم پر فضیلت دی اور بادشاہی کے لئے منتخب فرمایا ہے اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا''۔

اسی طرح سورۂ محمد میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾

''تم منہ پھیرو گے وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے''۔

اسی طرح ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد)

''خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت خود نہ بدلے''۔

## مراعات کی فراہمی:

آج کل نفسیاتی طریقہ ہائے تدریس کا اہم طرۂ امتیاز مراعات کا مہیا کرنا ہے تا

کہ طلبہ کی دلچسپیوں کو مہمیز دی جا سکے۔ یہ اسلوب تدریس قرآن مجید کی نقل ہے۔

ارشاد ربانی ہے: (فلاح کے طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے):

﴿الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (المومنون)

''بے شک یہی لوگ فردوس کے وارث ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اسی طرح سورۂ یونس میں ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾

''جان لو کہ ان کے دوستوں کے لئے نہ غم ہوگا نہ خوف''۔

سورۃ الفجر میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾ (الفجر)

''اے اطمینان پانے والی روح اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی تو میرے ممتاز بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا''۔

## معتدل انداز:

کسی شخص کی معتدل طبیعت اس کے اخلاق کی بہتری کو ظاہر کرتی ہے اور اعمال میں اعتدال زندگی کو جنت نظیر بنا دیتے ہیں۔ اسلام ایسی تربیت کا داعی ہے جو اعتدال پسندی پر منحصر ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ (لقمان)

''اور زمین پر اکڑ کر نہ چل''۔

﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ (لقمان)

''تو اپنی آواز میں نرمی پیدا کر اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کر''۔

یہ اعتدال صحابہ کرامؓ کے اخلاق کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

## سوال و جواب کا تربیتی انداز:

سوال و جواب کا انداز تربیت کے عمل کی تاثیر کو بہتر بناتا ہے۔قرآن نے جن اسالیب تربیت کا ذکر کیا ہے ان میں یہ ایک اہم طریقہ ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۝۹ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ۝۱۰ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَی الْهُدٰٓی ۝۱۱ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ۝۱۲ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝۱۳ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ۝۱۴﴾ (العلق)

''کیا تو نے دیکھا کہ وہ شخص اللہ کے بندے کو نماز سے منع کرتا ہے۔کیا تو نے دیکھا کہ اگر وہ شخص ہدایت پر ہو یا پرہیزگاری کا حکم دے۔کیا تو نے دیکھا کہ اس نے ہمارے حکم کو جھٹلایا اور منہ پھیرا۔کیا اس نے نہیں جانا کہ سب کچھ اللہ دیکھتا ہے؟''

یہ سوال و جواب کا انداز طلبہ کو مستعد رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

## حرکی آمادگی پیدا کرنا:

قرآن تدریس کے دوران دلچسپی بڑھانے اور اسے قائم رکھنے کا داعی ہے۔مثلاً مناظر قیامت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ ۝۳﴾ (التکویر)

''جب سورج لپیٹ دیا جائے جب ستارے گدلے ہو جائیں اور جب پہاڑ چلا دیئے جائیں''۔

یہ انداز تدریس میں مواد مضمون پر استاد طالب علم کی گرفت مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

## اضافۂ علم کی دعا:

عمل تدریس اضافۂ علم کا باعث بنتا ہے۔ جد و جہد کے علاوہ بطور صلح اللہ رب العزت سے دعا بھی ضروری ہے کہ انسان کو عطا کردہ صلاحیتیں اس ذات باری تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں ترقی بھی وہی دیتا ہے لہٰذا قرآن حکم دیتا ہے کہ علم کے اضافہ کی دعا مانگی جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ)

''اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما''۔

## جزا وسزا کے تصور:

قرآنی عمل تدریس میں دلچسپی پیدا کرے اور مراعات مہیا کرے کیونکہ سزا و جزا کا تصور اور عمل تدریس وتربیت اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ پورا قرآن مجید اس طریقہ کا گواہ ہے۔

## بامقصد نصب العین:

قرآن بامقصد زندگی کا قائل ہے اور ہر انسان کا مقصد واحد فلاح دارین قرار دیتا ہے جس کے لئے اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ کا حکم واطاعت سے اس نصب کو حاصل کرنے اور اسے جاننے کا حکم ہے۔

## مشاورت وراہنمائی:

مشاورت ورہنمائی عمل تربیت وتدریس کے لئے معاون نفسیاتی طریقہ ہائے کار ہیں۔ قرآن نے ۱۴ سو سال قبل اس اسلوب کو رہنمائی کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾

''اور ہر کام کے لئے مشورہ کر جب تو ارادہ کرے تو پھر اللہ پر توکل کر''۔

## قسم کھانے کا قرآنی اسلوب:

یہ عام معمول ہے کہ بات کو منوانے اور یقین کے لئے قسموں کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ مواد کی صداقت مسلّم ہو جائے۔ قرآن مجید نے اس اصول کو تدریس و تربیت میں پیش نظر رکھا قرآن مجید کی سورۃ التین' سورۃ القیامہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

## تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارنے کے مختلف اسالیب:

تعلم و تعلیم اور عمل تربیت کا ایک مقصد تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارنا بھی ہے۔ قرآن نے تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارنے کے مختلف اسالیب اپنائے ہیں مثلاً دلائل کے ذریعے 'مدعا بیان کرنے کے قابل بنانے' مناظر کشی کے ذریعے اچھے اور بہت اچھے کی تمیز سکھانا وغیرہ۔ قرآن مجید کے اس اسلوب تربیت کی بدولت علماء اور فقہاء کی عظیم جماعت وجود میں آئی جس نے دینی تدریس کا کماحقہ حق ادا کیا۔

## صراطِ مستقیم کی طلب:

انسان کی دنیاوی واخروی زندگی کا دارومدار فلاح دارین پر ہے جو صراط مستقیم پر عمل کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ صراط مستقیم کی طلب ہمیشہ عملی تربیت کا خاصہ رہی ہے اسی لئے سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کی طلب کی دعا مانگی گئی۔

## مسلسل تدریس وتربیت:

عملِ تدریس و تربیت ایک مسلسل عمل ہے جس کا رکنا انسانی تہذیب کا خاتمہ ہے۔ اسی لئے قرآن نے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران)

''تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کو اچھائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو''۔

کہہ کر اس تربیتی عمل کو جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔

## اُسوۂ کامل:

تدریسی عمل صرف اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ایک نمونہ کامل، عالم باعمل اور عملی مہارت رکھنے والا یہ فرض انجام دے۔ یہ فرض قرآن کے بقول نبی کے ذمہ ہے، آپؐ کے اسوہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب)

''بے شک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ اقدس میں تمہارے لئے کامل نمونہ (عمل) موجود ہے''۔

اسی طرح:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ (احزاب)

''جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے بہت بڑی کامیابی پائی''۔

## نفسیاتی تربیت:

قرآن مجید نفسیاتی انداز تربیت کا قائل ہے تاکہ انفرادی اختلافات کا خیال رکھ کر عمل تدریس کو مکمل کیا جا سکے۔ سورۂ الفجر میں اس بات کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ انسان تکلیف میں کس طرح رب کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور تکلیف کے خاتمے پر پھر کج راہ پر گامزن ہو جاتا ہے، اسی فطری طریقے کے مطابق سزا و جزا کا تصور دیا گیا جو تدریس و تربیت کو مضبوط بنانے کا سبب بنتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾ فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ
وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ
فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ﴿١٦﴾ كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحَاضُّونَ
عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿١٨﴾ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَتُحِبُّونَ
الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾ كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَجَاءَ
رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ
يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ ﴿٢٣﴾ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ
لِحَيَاتِي ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ
أَحَدٌ ﴿٢٦﴾ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً
مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾﴾

’’بے شک آپ کا رب گھات میں ہے سو آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو اکرام انعام دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھا دی اور جب اس کو آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹا دی ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی قدر نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے اور میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو ہرگز ایسا نہیں جس وقت زمین کو توڑ توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور آپ کا پروردگار اور جوق در جوق فرشتے آدیں گے اور اس روز جہنم کو لایا جائے گا اس روز انسان کو سمجھ آئے گی اور اب سمجھ آنے کا موقع کہاں رہا کہے گا کاش میں اس زندگی کے لئے کوئی عمل آگے بھیج دیتا پس اس روز تو خدا کے عذاب کے برابر کوئی عذاب دینے والا نہ نکلے گا اور نہ اس کے جکڑنے کے برابر کوئی جکڑنے والا نکلے گا اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے اور وہ

تجھ سے خوش پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

## عملی تربیت کے لئے برمحل تدریس:

برمحل تدریس کا عمل تربیت کی بھی تکمیل کرتا ہے۔ قرآن مجید نے بارہا اس طریقہ کو اپنایا مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں سے سلوک' مال غنیمت کی تقسیم اور خدا تعالیٰ کے فوری احکامات' عبداللہ بن ابی کی موت' جنازہ' تجہیز و تکفین کا مسئلہ' ہر موقع پر قرآن کی رہنمائی مسلمانوں کے شاملِ حال رہی۔

## فلاح کی خوشخبری:

عمل تربیت و تعلیم والے رہنما کو اللہ تعالیٰ نے فلاح دارین کی خوشخبری دی۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى﴾ (یٰس)

''اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ اے میری قوم! پیغمبروں کے پیچھے چلو''۔

## علم بذریعہ قلم:

تربیت و تدریس فرض عین ہے اور اس کے تحریر کرنے اور پھیلانے کا ذریعہ قلم ہے۔ قرآن بھی ارشاد فرماتا ہے۔

اسی طرح ارشاد ہے: عَلَّمَ بِالْقَلَمِ انسان کو قلم سے علم سکھایا۔ (العلق: ۵)

## تحقیقی طریقہ تعلیم:

قرآن مجید ہر معاملہ میں تحقیق کرنے کا حامی ہے چاہے اس معاملہ کی نوعیت کیسی کیوں نہ ہو۔ یہ احتیاط محض مستقبل کی پیش بندی کی ضامن ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (الحجرات)

''جب کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے اس کی تحقیق کرلو''۔
قرآن مجید اس تحقیقی حکم کو حکمت قرار دیتا ہے اور اسے خیر کثیر کے حصول سے تعبیر کرتا ہے۔

## سعی مسلسل:

تربیتی عمل انسان کے آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے زندگی بھر جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ (النجم)

''اور بے شک انسان کے لئے کوشش کرنا ہے''۔

## جزاوسزا بلا سفارش:

قرآن جزاوسزا کا تو قائل ہے مگر نیکی اور بدی کے ساتھ اسے مشروط کردیتا ہے تاکہ ہر شخص اپنی کوشش کا پھل خود پائے اور تدریس وتربیت کا یہ اصول قرآن سے ماخوذ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ (البقرہ)

''ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے''۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی اپنے گمراہ بیٹے کے لیے سفارش نہ ماننا۔ اسی اصول کی عملی تصویر ہے۔

## اہل علم کی سیادت:

تربیت وتدریس کا فریضہ انجام دینے والے اساتذہ کو علماء میں شامل کر کے انہیں برتر مقام دیا گیا ہے۔ اور اسی طرزِ عمل کا قرآن آج بھی متقاضی ہے تاکہ استاد کو عزت ملے۔ ارشاد فرمایا:

﴿هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر)

''کیا علم رکھنے والے اور بے علم برابر ہیں (ہرگز نہیں)''۔

اسی طرح ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (الفاطر)

''بے شک اللہ سے ڈرنے والوں میں علماء شامل ہیں''۔

## والدین کی تربیتی ذمہ داری:

تدریس و تربیت کا عمل ماں کی گود سے ہو کر حلقۂ درس تک پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے صدقہ جاریہ کا اعزاز حاصل ہے مثلاً تین بیٹیوں کی صحیح تربیت کرنے والا جنتی ہے۔ (الحدیث) کہہ کر والدین کی تربیتی ذمہ داری کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہے:

﴿وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا﴾

''اور یوں کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تھا سو انہوں نے ہم کو رستہ سے گمراہ کیا تھا''۔

## استحضار/نصاب:

قرآن مجید نے جو نصاب تعلیم و تربیت مقرر فرمایا ہے وہ ہمہ جہتی شخصیت تشکیل دیتا ہے جو حقوق اللہ' حقوق العباد' عبادات' عقائد' اعمال صالحہ کرنا اور اعمال سیئہ سے بچاؤ پر مشتمل ہے۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ لا وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِى

الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (البقرة)

''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق' مغرب کو (قبلہ سمجھ کر اُن) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور معرکہ کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں''۔

اس کے علاوہ معاملات زندگی کے اصول' لین دین' تجارت' وراثت وغیرہ سب کے اصول مقرر فرما دیئے گئے ہیں۔

## فنی تعلیم کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے فنی تربیت کے حاملین کو فضیلت بخشی ہے اور اس کے اہتمام کا حکم دیا ہے۔ قرآن بار بار اس امر کی جانب توجہ دلاتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی مادی قوتیں انسان کے لئے تخلیق کی گئی ہیں لہٰذا وہ ان سے فائدہ اٹھائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا﴾ (سورۃ سبا)

''اور ہم نے داؤد کو فضیلت دی......''

اسی طرح فن دھات کاری کی بدولت ذوالقرنین نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو دشمنوں (یاجوج ماجوج) سے محفوظ کیا۔ سورۃ الکہف میں ارشاد ربانی ہے:

﴿اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ط حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا﴾

''میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ جب دونوں پہاڑوں کے درمیان انہیں برابر کردیا فرمایا پھونکو''۔

اسی حکم کی مزید وضاحت اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ:

((الْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ))

''بے شک ہنرمند اللہ کا دوست ہے''۔

## حربی تعلیم کی اہمیت:

تدریس وتربیت کا ایک پہلو دفاعِ وطن کی صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ:

ع خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر

قرآن مجید اس پہلو کو اجاگر کرنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ حکم ہے:

﴿انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾ (توبہ)

''نکلو چاہے ہلکے ہو یا بھاری اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرو''۔

اسی طرح فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (الانفال)

''اور دشمنوں کے خلاف قوت سے اور گھوڑوں سے اور ہتھیاروں سے جو کر سکو کرو اس کے ساتھ تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ڈراؤ''۔

## آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے کا انجام:

اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کے ذریعے لوگوں تک پہنچائیں اور ان تعلیمات کی تدریس وتربیت کا ذمہ بھی انبیاء کو سونپا تا کہ انسانیت بھلائی کے

راستے پر گامزن ہو سکے، یہ عمل نشو ونما سے ہے اور ہمیشہ سے رہے گا۔ اس تربیتی عمل کا منکر دنیا وآخرت میں برباد ہوگا۔ ارشاد ہے:

﴿وَتِلْكَ الْقُرٰى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا﴾ (الکھف)

''یہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ظلم کرنے کی وجہ سے تباہ کر دیا اور ہم نے انہیں وعدہ خلافی کے سبب ہلاک کیا''۔

سورۃ العصر میں بھی ایسے لوگوں کو خسارے کا حامل قرار دیا گیا ہے جو عمل تربیت سے راہ فرار اختیار کریں۔

## بامقصد کھیل کود:

قرآن تعلیم وتربیت کے معاملے میں ہم نصابی سرگرمیوں کا مخالف نہیں مگر اصل فرض سے غافل ہونے کو پسند نہیں کرتا۔ کھیل انسانی جسم و دماغی صلاحیت کے لئے لازمی ہیں قرآن بھی یہ چاہتا ہے کہ مسلمان طاقتور ہوں ذہنی وجسمانی اعتبار سے مگر واحد شرط یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد سے غافل نہ ہوں۔ مثلاً ارشاد ہے:

﴿اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (یوسف)

''اسے کل ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ خوب کھائے پیئے اور کھیلے اور ہم اس کے محافظ ہیں''۔

یہ آیت مقدسہ واضح کرتی ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بعد انہیں اجازت ملی تھی۔ نیز انہیں یعقوب علیہ السلام نے منع نہیں فرمایا تھا پس درس تربیت وتعلیم کے بعد ہم نصابی سرگرمیاں جاری رہنی چاہئیں۔

## تدریس کا مقصد:

مقاصد تدریس کا تعین عمل تدریس وتربیت کی کامیابی کا ضامن ہے۔ یہ عمل

قرآن کی نقل ہے۔ارشاد ہے:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ (آل عمران)

''انہیں آیات کی تلاوت سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے''۔

## نہی عن المنکر کا فائدہ:

عمل تدریس دنیا و آخرت میں نہی عن المنکر اہم ترین فعل ہے جو باعث نجات ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے میں برائی کو روکنے اور خیر کو پھیلانے کے لئے یہ لازمی ہے کہ تعلیم و تربیت میں اس پہلو کو نظر انداز نہ کیا جائے۔لہٰذا ارشاد ہے:

﴿وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ﴾ (الاعراف)

''ہم نے انہیں نجات دی جنہوں نے گناہ سے روکا''۔

## سائنسی طریقۂ کار:

آج کل سائنسی طریقہ کا زکا چرچا ہے جس کی بدولت توفیق کے نئے دروازے کھلے۔اس طریقہ کے متعدد مرحلے جو قرآن میں من وعن موجود ہیں قرآن کی کم و بیش ۷۵۰ آیات انسان کو تخلیق کائنات اور اس کے مادی وجود پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ انسان جس قدر تخلیق کائنات کے مقصد کو سمجھے گا اسی قدر خود سے متعارف ہوتا چلا جائے گا اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بھی صلاحیت عطا ہو۔مثلاً

۱) مشاہدہ:

ماحول پر نظر دوڑا کر قدرتِ کاملہ کا مشاہدہ بذریعہ حواس ممکن ہے۔

سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ﴾

''کہو کہ تم زمین پر سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ نے کیسے زندگی کی ابتدا کی''۔

اسی طرح ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرہ)

''آسمانوں اور زمین کی پیدائش رات اور دن کے آنے میں اور کشتیاں جو دریا میں چلتی ہیں اور نفع دیتی ہیں اور یہ کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور مردہ زمین کو روئیدگی دی اور اس میں بیج بکھیرے ہر جانور سے اور ہواؤں کے پھیرے اور حکم کے فرماں بردار بادلوں کے اور زمین اور آسمان کے درمیان جو نشانیاں ہیں وہ عقل مندوں کے لئے راہ ہدایت ہیں۔

ب) استنباط:

مشاہدہ سے نتیجہ نکالنا یعنی استنباط قرآن کا حکم ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ﴾

''اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو''۔

ج) تجربات/عملی کام:

قرآن مجید عمل کا قائل ہے۔ ارشاد ہے:

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴿۲﴾﴾ (الصف: ۲)

''ایسا کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں''۔

د) قوانین:

حقائق کا مشاہدہ کرانا' بنیاد کا اخذ کرانا یا بیان کرانا بھی قرآن کا خاصہ ہے۔ مثلاً

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:

﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَـكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝۱۳۲ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝۱۳۳ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔـلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۳۴﴾

''اور اسی کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی میرے بیٹو اللہ تعالیٰ نے دین کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے کسی اور حالت پر جان مت دینا کیا تم خود موجود تھے جس وقت یعقوب کا آخری وقت آیا جس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم لوگ میرے بعد کس چیز کی پرستش کرو گے انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق پرستش کرتے آئے ہیں یعنی وہی معبود جو وحدہ لاشریک ہے اور ہم اسی کی اطاعت پر رہیں گے یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی۔''

میں اہم اصول ''تمہارا اجر تمہارے لئے'' کو مثالیں دے کر اخذ کرایا گیا ہے۔

## تکرار:

اعمال و افعال کی تکرار سے پختہ عادات جنم لیتی ہیں، تعمیر سیرت و کردار ہوتی ہے اور شخصیت پروان چڑھتی ہے۔ قرآن نے عمل تربیت و تدریس کے دوران تکرار کو اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید میں ۷۰۰ مرتبہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے حکم کی تکرار اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ (الحجر)

''اور ہم نے تمہیں دہرائی جانے والی آیات اور قرآن عظیم عنایت فرمایا''۔

## معلم کی شفقت زبان کی نرمی:

دورانِ تدریس و تربیت قرآن معلم سے شفقت کا طالب ہے یعنی معلم کی شفقت اور شیریں بیانی اس عمل کی تکمیل کے لئے اہم ذریعہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران)

''اے محمدؐ! یہ اللہ کی طرف سے رحمت ہے کہ آپؐ نرم دل ہیں اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ سے چھٹ جاتے''۔

گویا شفقت معلم اور معلم کی شیریں زبانی طلبہ کے لئے تالیف قلب کا ذریعہ ہے۔

## معلم کا اسلوب بیان/نرم خوئی:

قرآن مجید نے تعلیم و تربیت کے دوران شیریں اسلوب بیان اور نرم خوئی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرہ)

''اور لوگوں سے احسن طریقہ سے گفتگو کرو''۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف سے پیغام ربانی دے کر بھیجتے وقت ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾: (اے موسیٰؑ! فرعون کے سامنے) قول لین سے کام لینا۔

## انکشافی انداز:

دورِ حاضر میں انکشافی طریقۂ تربیت طلباء اور اساتذہ دونوں میں یکساں مقبول ہے اور تعلیم و تربیت کے میدان میں طلبہ کی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ قرآن مجید اسی

انداز میں زور بیان کے ساتھ مناظرِ قیامت بیان کرتا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝﴾ (انفطار)

''جس وقت آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے جھڑ جائیں گے''۔

یہ انداز حقائق کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے جو عمل تربیت کی روح ہے۔

## تربیت کردار و اخلاق:

اخلاق و کردار شخصیت پر بھرپور اثر ڈالتے ہیں اسی لئے قرآن تربیت اخلاق اور تزکیۂ نفس کو فن تعلیم و تربیت کا لازمی جزو قرار دیتا ہے۔سورۃ البقرۃ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۝﴾

''جو اِن کو تیری آیات پڑھ کر سنائے' اِنہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیۂ نفس کرے''۔

## دِل نشین انداز:

تعلیم و تربیت کا نصاب دلچسپ ہو تو طلباء کا دل موہ لیتا ہے اور ان کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے قرآن مجید میں آیاتِ مقدسہ کے بیان کا دل نشین انداز بیان اسی عمل کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہے۔ پس استاد عمدہ الفاظ و تراکیب اور خوبصورت استعارات کے استعمال سے سبق کو مؤثر بنا سکتا ہے مثلاً قرآن مجید میں سورۃ الرحمٰن کی آیات مقدسہ سامعین پر مسحور کن اثر ڈالتی ہیں۔

## طریقہ عمل کی وضاحت:

قرآن مجید تعلیم و تربیت کے دوران عمل اور طریقۂ عمل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے نیز عملی کام سکھانے والے کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔ مثلاً وضو کرنے کا طریقہ یوں سکھایا گیا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾(المائدہ:٦)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے کھڑے ہوتو اپنے چہرہ کو دھولو اور اپنے ہاتھ کو کہنیوں تک اور سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولو''۔

یہ طریقہ عملی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور آپ ؐ کے عمل کو باعث تقلید فرمایا ہے۔

ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

''بے شک تمہارے لئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہستی میں نمونہ عمل موجود ہے''۔

## انفرادی اختلافات:

انفرادی اختلافات کا خیال رکھ کر تعلیم وتربیت کے عمل کو بہترین بنایا جا سکتا ہے۔ یہی خاصہ قرآن کا بھی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل)

''ان کے ساتھ وہ طریقہ اختیار کرو جو ان کے لئے بہتر ہے''۔

## بحث وتمحیص:

کلاس روم میں بحث وتمحیص اور سوال وجواب کا طریقہ تربیتی عمل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾

''تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہو یہ اللہ کے حکم سے ہے''۔

اسی طرح فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا﴾ (الکھف)

''آپ کہیے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارہ میں ہیں۔''

## رہنمائی میں کوتاہی پر تعزیر:

عمل تربیت و تدریس میں کوتاہی برتنے والا معلم مجرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم رسولوں کو بھی دیا ہے۔ البتہ رسول کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوتے بلکہ یہ تعلیم ان لوگوں کو دی گئی ہے کہ وہ جس منصب کی ذمہ داری اٹھائیں اسے پوری طرح ادا کریں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ﴾ (المآئدہ)

''اے رسول! آپ تبلیغ کر دیں جو کچھ آپ کی طرف بھیجا گیا اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا''۔

## سائنسی مضامین کی تدریس اور قرآن:

قرآن میں جا بجا سائنسی مضامین اور عنوانات کا واضح ثبوت موجود ہے مثلاً بیالوجی کے متعلق ۳۶۸، کیمسٹری کے متعلق ۴۷، ریاضی کے متعلق ۱۹، گنتی کا باقاعدہ نظام، فزکس کی ۳۱ آیات کی موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن سائنسی مضامین کی تدریس کا شدومد سے حامی ہے۔ قرآن نے آج تک جتنے بھی سائنسی اصول بیان کیے ہیں ان میں سے کوئی بھی سائنس غلط ثابت نہیں کر سکی بلکہ قرآن نے سائنس کو بہت کچھ دیا ہے۔ جس کی مثال امبریالوجی کی دنیا کے بہت بڑے ڈاکٹر کیتھ این مور کا قبولِ اسلام ہے۔ قرآن، بائبل اور سائنس ڈاکٹر بوریس بوکائے کی کتاب قرآن کی صداقت پر گواہ ہے۔

## حاصل کلام:

جدید نظریات تعلیم و تربیت' مونٹی سوری کا طریقہ' سائنسی اندازِ فکر وغیرہ قرآن سے ماخوذ ہیں۔ ان حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان کا یقین بڑھ جاتا ہے کہ یہ:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۝٢﴾ (البقرہ)

''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں''۔

## متفرق حکم:

اسی عملِ تربیت کے دوران طلباء کو ترغیب دینے اور ان کی دینی استعداد کے مطابق ان کی رہنمائی کرنے کا حکم ہے۔

# ۲

# تعلیم اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

## باب:②

صحیح فن وتربیت کارنبوت کا ایک اہم جزو ہے اور دیگر امور زندگی کی طرح اس معاملے میں بھی آپ ﷺ ہی کا اسوۂ حسنہ ہم سب کے لئے مستند اور قابل تقلید ہے۔ اس بات کی تصدیق قرآن حکیم کی اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران)

''حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان کیا جبکہ اُن میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے قبل صریح غلطی میں تھے''۔

چند ارشادات نبوی:

☆''بے شک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔(بخاری)

☆''مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے تا کہ اخلاقی اچھائیوں کو تمام وکمال تک پہنچاؤں''۔(مؤطا امام مالک)

☆''عالم نبیوں کے وارث ہیں اور انبیاء کا ورثہ دینار اور درہم نہیں بلکہ ان کا ورثہ علم ہے جس کا وارث انہوں نے عالم کو بنایا ہے''۔(بخاری)

### معلم کی شخصیت اور اوصاف:

طلباء کی تعلیم وتربیت میں معلم کی اپنی شخصیت اور اس کے ذاتی اوصاف بہت حد تک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔طلبہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان سے مسلسل متاثر

ہوتے ہیں اور یہ تاثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ زندگی بھر نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔
اسوۂ حسنہ ﷺ کی روشنی میں ایک معلم کو ذیل کے اوصاف کا حامل ہونا چاہئے:

## دِلکش شخصیت:

حضور ﷺ کی شخصیت بڑی دلکش اور مؤثر تھی' جو دیکھتا بے اختیار کھنچا چلا آتا تھا۔ معلم کو بھی اپنے اندر ان اوصاف کی جھلک لانی چاہئے تا کہ طلبہ اس سے بدکنے کی بجائے قریب آئیں۔

## تعلیم و عمل:

حضور ﷺ کی ظاہر و باطن یکساں تھی۔ جن باتوں کی تعلیم دی خود اس پر عامل رہے' زبان سے جو کچھ فرمایا اس پر عمل کر کے دکھایا' زندگی کے ہر معاملے میں آپ ﷺ کا اسوہ قابل تقلید تھا اور ہے۔

## علم و حکمت:

حضور ﷺ کی ذات گرامی علم و حکمت کی حامل تھی۔ معلم کو بھی صاحب علم و حکمت ہونا چاہئے کیونکہ صحیح پختہ علم کے بغیر طلبہ کو مؤثر تعلیم نہیں دی جا سکتی اور حکمت کے بغیر سلیقے سے ان کی تربیت نہیں کی جا سکتی' فن تعلیم و تربیت کا کام تو غیر معمولی حکمت اور دانائی چاہتا ہے۔

## عفو و درگزر:

عفو و درگزر اور تحمل و بردباری میں حضور ﷺ اپنی مثال آپ تھے۔ معلم کو بھی بچوں سے واسطہ پیش آتا ہے جن سے ہمہ وقت غلطیاں سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے' اس لئے وہی معلم کامیاب ہوتا ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں' چڑچڑے غضب ناک لوگ کبھی اچھے معلم نہیں ہو سکتے۔

## خوش اخلاق:

حضور ﷺ کی خوش اخلاقی اور ملنساری کا یہ عالم تھا کہ اپنے پرائے، دوست، دشمن اور ان لوگوں سے جنہیں آپ ﷺ ناپسند بھی کرتے تھے نہایت نرمی، خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے، دوسروں کی دلداری کا آپ ﷺ کو بہت حد خیال رہتا تھا، دل پر خواہ کچھ بیت رہی ہو، مسکراتے ہوئے ملتے، خوش طبعی کا اہتمام کرتے اس سے سبق ملتا ہے کہ معلم کو بھی بہت ہی خوش اخلاق، ملنسار اور خوش طبع ہونا چاہئے۔

## سادگی:

لباس میں سادگی، تواضع اور بے تکلفی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم طہارت و نفاست کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ معلم کو بھی فیشن اور نقالی سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ سادگی اور صفائی ہی میں علم کی شان ہے۔

## نظم وضبط:

آپ ﷺ کی شخصیت میں غیر معمولی انضباط اور برتاؤ میں حد درجہ یکسانی و ہمواری تھی۔ جسے بھی واسطہ پڑتا وہ باآسانی اندازہ لگالیتا کہ آپ کی پسند ناپسند کیا ہے؟ ہماری کن باتوں کا آپ ﷺ پر ردعمل کیا ہوگا؟ معلم میں بھی یہ صفات ضروری ہیں تاکہ طلبہ معلم کے جذبات کا پورا احترام کرسکیں ورنہ باوجود خواہش عجیب کشمکش کا شکار ہوجاتے ہیں، انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ معلم کس بات سے خوش اور کس بات پر ناخوش ہوتا ہے؟

## پُر امیدی:

حضور ﷺ کی سیدھی سچی تعلیم کا جواب نادانوں نے اینٹ پتھر سے دیا مگر آخر وقت آپ ﷺ ان کی طرف سے مایوس نہ ہوئے بلکہ پُر امید ہی رہے، بالآخر کامیابی نے آپ ﷺ کے قدم چومے۔ معلم کو بھی تعلیم وتربیت کی طرف سے نہ تو خود مایوس

ہونا چاہئے اور نہ طلبہ یا سرپرستوں کو مایوسی کا شکار ہونے دینا چاہئے۔

## توکل:

ایثار، قناعت اور توکل میں حضور ﷺ اپنی نظیر آپ تھے۔ معلم کو بھی خصوصاً آج کل کے دور میں ان صفات کا حامل ہونا چاہئے۔ تعلیم و تربیت جیسے کارِ خیر میں برکت انھی صفات کے ذریعے سے ہو سکتی ہے جسے صرف دنیا عزیز ہو اس کو اس کوچے میں قدم نہ رکھنا چاہئے۔

## احساسِ ذمہ داری:

حضور ﷺ کے احساسِ ذمہ داری، لگن اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''شاید آپ اپنے کو ان کے پیچھے ہلاک کر دیں گے''۔

تعلیم و تربیت انتہائی محنت طلب کام ہے۔ معلم بھی اپنے فرائض کو ان صفات کے بغیر بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔

## دور اندیشی:

صورت حال کیسی بھی پیچیدہ ہو، معاملات کو آپ ﷺ بڑی دور اندیشی اور سہولت سے سلجھا دیتے، آپ ﷺ کے چند جملے آگ پر پانی کا کام کرتے اور ہر فریق مطمئن ہو جاتا۔ معلم کو بھی آئے دن درجات میں اور باہر بھی طرح طرح کے معاملات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اگر نمٹنے کی صلاحیت نہ ہو تو معلم کو بڑی دشواری پیش آئے گی۔

## جبر و تشدد سے پاک تدریس:

بچوں سے آپ ﷺ کو غیر معمولی انس اور طبعی مناسبت تھی۔ ان کی بچگانہ حرکات پر آپ ﷺ بہت زیادہ رعایت کرتے تھے، آپ نے کبھی بھی کسی بچے کو نہیں

پیٹا اور معمولی سزا کے لئے کہا بھی ہے تو آخری چارہ کار کے طور پر۔ معلم کو بھی اپنے اندر ان صفات کو پروان چڑھانا چاہیے۔

## متوازن اور صحیح لب ولہجہ:

حضور ﷺ کی آواز نہ بہت بلند تھی' نہ بہت پست بلکہ میانہ ہوتی تھی' جو کانوں کو بہت خوش گوار محسوس ہوتی تھی' البتہ حسب ضرورت اتنی بلند آواز سے بولتے کہ مخاطب سن سکے۔ معلم کو بھی اپنی آواز نہ اتنی بلند رکھنی چاہیے کہ کانوں کو بری لگے نہ اتنی پست کہ سنائی نہ دے۔

## سادہ اور سلیس زبان:

طلبہ کی تعلیم وتربیت میں معلم کی زبان کو بھی بہت زیادہ دخل حاصل ہے' کیونکہ یہی تو وہ آلہ ہے جس کے ذریعے سے معلم طلبہ تک اپنی بات پہنچاتا ہے۔ حضور ﷺ بہت ہی سادہ' عام فہم اور سلیس زبان استعمال فرماتے' کوئی بھی مسئلہ ہوتا ایسی زبان میں بیان کرتے کہ ان پڑھ لوگ بھی آسانی سے سمجھ جاتے۔

## طلبہ کی توجہ کا خیال رکھنا:

طلبہ کو آمادہ کر کے یا ان کا تجسس ابھار کر سبق پیش کیا جائے۔ حضور ﷺ کوئی سوال کر کے یا کوئی ادھوری بات کہہ کر لوگوں کے تجسس کو ابھار دیتے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتے تب کوئی بات پیش فرماتے مثلاً آپ کا سوال کہ ''سب سے بڑا سخی کون ہے؟'' اور پھر جواب دیا یا منبر پر چڑھتے ہوئے تین بار ارشاد فرمایا کہ:

''ہلاک ہوا وہ' ہلاک ہوا وہ' ہلاک ہوا وہ''۔

## طریقۂ تعلیم (تدریسی حکمت عملی)

حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ سبق کا مقصد متعین اور معلم اور متعلم دونوں پر اچھی طرح واضح ہو۔ حضور ﷺ جو کچھ سکھانا چاہتے تھے اس کا

بنیادی مقصد آپ ﷺ کی نظر میں تو خیر متعین ہی ہوتا تھا۔ مواد کی پیشکش کے لئے اسوہ حسنہ کی روشنی میں مندرجہ ذیل طریقوں میں سے موقع ومحل کے مطابق اور مناسبت سے کوئی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

## بات چیت کا طریقہ:

حضور ﷺ باتوں باتوں میں بہت سی معلومات بہم پہنچاتے تھے۔ یہ طریقہ بہت ہی دلچسپ' سادہ' فطری اور مفید ہے' طلبہ نہایت بے تکلفی سے اپنا مطلب بیان کر دیتے ہیں۔ معلم کو ان کے خیالات' جذبات' مشکلات اور مسائل کا آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی اصلاح وتربیت کا فطری موقع ہاتھ آتا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

① گفتگو زیادہ سے زیادہ بے تکلفی کی فضا میں ہو۔ البتہ شائستگی کو برقرار رکھا جائے۔

② پوری توجہ اور خندہ پیشانی سے بات سنی جائے۔

③ بات کاٹی نہ جائے اور ایک وقت میں ایک ہی شخص بات کرے۔

④ موضوع سے بالکل ہٹی ہوئی' خلافِ واقعہ بات کی مناسب انداز میں اصلاح کی جائے۔

⑤ بات چیت میں الفاظ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے ادا کئے جائیں۔

## سوال وجواب کا طریقہ:

بہت سی باتیں حضور ﷺ اس طریقے سے بھی ذہن نشین کراتے تھے' جو کچھ بتانا ہوتا تھا' اسے پہلے سوالات کی شکل میں پیش کرتے اور پھر صحیح جواب ارشاد فرماتے۔ دوسروں کو بھی آزادی سے پوچھنے کا موقع دیتے' البتہ فضول اور لایعنی سوالات سے منع فرماتے تھے۔ اس ضمن میں آپ ﷺ کے اُسوہ سے حسب ذیل رہنمائی

ہوتی ہے۔

① سوالات مختصر اور جامع ہوں اور واضح الفاظ میں کئے جائیں تا کہ مخاطب اچھی طرح سمجھ جائیں کہ ان سے پوچھا کیا جا رہا ہے۔

② سوال کرنے کا انداز ایسا ہو کہ ہر ایک کان کھڑے کر لے، ہمہ تن متوجہ ہو جائے اور اس کا ذہن جواب سوچنے پر پوری طرح آمادہ ہو جائے۔

③ سوال کرنے کے بعد سوچنے کا موقع دیا جائے پھر خندہ پیشانی سے جواب سنا جائے۔

④ غلط جواب کی تصحیح کر دی جائے اگر جواب بالکل نہ ملے یا سوال لوٹا دیا جائے تو خود ہی وضاحت سے جواب دے کر مطمئن کر دیا جائے۔

⑤ طلبہ کو بھی سوالات کرنے کے مواقع دیئے جائیں کیونکہ جو زیادہ پوچھتا ہے وہ زیادہ سیکھتا ہے۔

⑥ غیر متعلق لیکن مفید اور ضروری سوال ہو تو بات ختم کرنے کے بعد علیحدہ سے جواب دے دیا جائے۔

## اخباری، اطلاعی یا بیانیہ طریقہ:

کسی چیز کے بارے میں کچھ بتانا ہوتا یا کوئی واقعہ سنانا ہوتا تو آپ ﷺ کبھی کبھی سادہ اخباری یا اطلاعی انداز بیان اختیار فرماتے تھے لیکن آپ کا بیان مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہوتا تھا۔

① آپ ﷺ بیان کو زیادہ طویل نہ کرتے تھے بلکہ اختصار ملحوظ رکھتے تا کہ لوگ اکتا نہ جائیں۔

② الفاظ میں ایسی منظر کشی فرماتے کہ ان دیکھی حقیقتیں ایسی معلوم ہوتیں گویا سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

③ بات کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے نہایت موزوں اور برمحل تشبیہات و

تمثیلات سے کام لیتے تھے' جس سے اس کا ہر پہلو باآسانی سمجھ میں آجاتا تھا۔

④ موقع ومحل کی مناسبت سے لب ولہجہ' اتار چڑھاؤ اور الفاظ پر زور دیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ جو کچھ پیش فرماتے' اس کی اہمیت اور شدت پورے طور پر ذہن نشین ہوجاتی تھی۔

⑤ چہرے بشرے' حرکات وسکنات' جذبات وتاثرات آپ ﷺ جو تاثر دینا چاہتے ان کا تاثر پہلے آپ ﷺ اپنے اوپر محسوس فرماتے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی اس کیفیت کا سامعین پر بھی گہرا اثر پڑتا۔

## لیکچر یا خطابت کا طریقہ:

حضور ﷺ کا عام اندازِ بیان خطیبانہ تھا۔ اجتماعی تعلیم وتربیت میں آپ ﷺ تقریباً اس طریقے سے کام لیتے تھے۔ بہت ہی مختصر اور جامع خطبہ ارشاد فرماتے۔ آپ ﷺ حسب ضرورت مندرجہ ذیل طریقہ اپناتے۔

① عملی نمونہ پیش فرماتے' کر کے دکھاتے یا ہاتھوں' انگلیوں کے اشاروں سے بتاتے۔

② کبھی کبھی ریت پر نشانات لگا کر اپنا مدعا بیان کرتے۔

③ کسی جانی پہچانی چیز سے تشبیہ دے کر بات ذہن نشین کراتے۔

④ کسی موزوں کہانی' واقعہ یا تمثیل سے مدد لیتے۔

## متعلمین سے برتاؤ:

متعلمین کے ساتھ بھلائی سے پیش آنے کی حضور ﷺ نے وصیت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ کا اسوۂ مبارکہ یہ تھا:

① مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے ملتے اور نرمی سے پیش آتے۔

② ان کی عزتِ نفس کا ہمیشہ خیال رکھتے' آپ ﷺ نے کبھی کسی کی تحقیر وتذلیل

نہیں کی۔

③ ان کی دلداری کے لئے خوش طبعی اور مہذب ظرافت سے بھی کام لیتے۔

④ بیمار ہوں تو عیادت کے لئے جاتے' مزاج پوچھتے اور دعا فرماتے۔

⑤ ان کی استعداد' ذوق اور دلچسپی کی رعایت فرماتے۔

⑥ ہر ایک کی بات غور سے سنتے۔

⑦ کوئی ادب کی حدود سے تجاوز کرتا تو کمال حلم سے برداشت فرماتے۔ ناپسند بات پر تغافل فرماتے اور ٹال جاتے۔

⑧ ان کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیتے' لغو اور فضول سوالات سے منع فرماتے۔

⑨ کوئی خامی دیکھتے تو عمومی انداز میں ٹوکتے۔

⑩ ان کے دکھ درد میں کام آتے۔

⑪ ان کے ساتھ روابط میں غیر معمولی یگانگت' قرابت اور لگاؤ کا ثبوت دیتے۔

⑫ مجلس کے ایک ایک فرد پر توجہ فرماتے۔

# ۳

# عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وخلافتِ راشدہ رضی اللہ عنہم

# کا نظامِ تعلیم

## باب : ③

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو لوگوں کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان کا ''نور'' عطا کرتی ہے۔ روایت سے ہم ظہور اسلام سے قبل کے زمانے کو عربوں کی جاہلیت کا دور کہتے ہیں' لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عہد جاہلیت کے عربوں کی اپنی کوئی ثقافت نہ تھی' ان کے اپنے کوئی علوم وفنون نہ تھے جو ان کے لئے مایہ فخر وناز ہوں۔ شاعری اور سخن فہمی میں انہیں فطری ملکہ حاصل تھا' میدان جنگ میں بھی وہ رجز پڑھتے ہوئے قدم رکھتے تھے' عکاظ کے میلے میں شعروسخن کے باقاعدہ مقابلے ہوتے تھے جس میں شعراء تیغ زباں کے جوہر دکھاتے تھے' معاشرے میں شعراء کو اعلیٰ مقام حاصل تھا' ہر قبیلہ اپنے اپنے شاعروں پر ناز کرتا تھا' شاعری کے بعد خطابات کا درجہ تھا' فصاحت' بلاغت اور طاقت زبان عربوں کی فطرت میں داخل تھی' وہ اپنے بچوں کو اس کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے' اپنے آپ کو ''عرب'' یعنی فصیح البیان اور دوسری اقوام کو ''عجم'' یعنی گونگا' ژولیدہ بیان کہتے تھے' عربوں کو اپنے نسب پر بھی بڑا فخر تھا اور وہ اس کے تحفظ کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ علم الانساب ان کے ہاں ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر قبیلے کے اپنے نساب ہوتے تھے جنہیں مختلف قبائل کے نسب نامے حفظ ہوتے تھے۔ آج کل کے مفہوم میں تاریخ کا تصور عربوں کے ہاں موجود نہ تھا' لیکن ''اخبار عرب'' یعنی عرب کی قدیم تاریخی داستانوں کو حفظ کرنے کا ان میں عام رواج تھا جنہوں وہ بڑے بڑے مجمعوں میں سناتے تھے' نجوم اور قیافہ شناسی سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ طب میں بھی وہ خاصی مہارت رکھتے تھے' بیطار اونٹ اور گھوڑوں کی بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔

عہد نبوی میں ایام جاہلیت کے ان علوم وفنون کی دینی نقطہ نظر سے چھان بین کی

گئی' جو علوم اسلامی تعلیمات کے منافی نہ تھے انہیں بدستور قائم رکھا گیا جو اس کے منافی تھے انہیں مطلقاً ممنوع قرار دے دیا گیا' جن کی اصلاح ممکن تھی ان کی اصلاح کی گئی۔ چنانچہ نجوم اور کہانت کی قطعی ممانعت کر دی گئی۔ شاعری کے مخرب اخلاق حصے مثلاً فخاری' ہجو نگاری' فحاشی اور عریانی کو یک قلم خارج کر دیا گیا لیکن اخلاقی اور حکیمانہ شاعری کو بدستور قائم رکھا گیا' عہد جاہلیت کے مشہور حکیم شاعر امیہ بن ثابت کو اپنی حکیمانہ شاعری کی وجہ سے دربار نبوی کا شاعر ہونے کا فخر حاصل تھا۔

دور جاہلیت کے علوم کی تطہیر عہد نبویہ کے نظام تعلیم کا خارجی پہلو تھا۔ اس کا داخلی پہلو ''کتاب و حکمت'' کی تلقین تھی جس کا مرکز مسجد نبوی تھی' اس مسجد سے ملحق ایک چبوترہ تھا جہاں نبی اکرم ﷺ رونق افروز ہوتے اور حکمت' نصیحت اور بحث کے پیرائے میں کتاب مبین کی تعلیم دیتے' قرآنی احکام بتانے کے ساتھ ساتھ ان کی تفسیر بھی بتاتے جاتے' جس کی تعلیم مکمل ہو جاتی اسے تبلیغ کے لئے بھیج دیتے۔ ابتدائے اسلام میں قراء معلم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہجرت سے قبل نبی اکرم ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ مدینے ہجرت کرنے کے بعد وہاں ایک پورا نظام تعلیم قائم ہو گیا۔ مسجد نبوی سے ملحق اصحاب صفہ کی ایک مستقل درسگاہ تھی۔ سعید بن العاصؓ اور عبادہ بن الصامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے انہیں صفہ میں اس کام پر مامور کیا کہ وہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے اور قرآن کی تعلیم دیں۔ صفہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا جو اس غرض کے لئے وقف تھا کہ باہر سے تعلیم کے لئے آنے والوں اور مقامی بے گھر طلباء کے لئے دارالاقامہ کا کام دے اور مدرسے کا بھی' اس درسگاہ میں قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں' فن تجوید سکھایا جاتا تھا' کتابت کی بالخصوص تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ وحی اور صلح و جنگ کے معاہدوں اور دعوت اسلام کے خطوط لکھنے کے لئے کتابت کا جاننا ضروری تھا۔ اسی طرح یہودیوں سے خط و کتابت کے لئے حضرت

زید بن ثابتؓ نے عبرانی زبان سیکھی۔ وہ فارسی' رومی' قبطی اور حبشی زبان بھی جانتے تھے۔ خواندگی کو فروغ دینے کی مہم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں جب ساٹھ ستر مکے والے گرفتار کر کے مدینے لائے گئے تو نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کی رہائی کے لئے جو مالدار نہیں تھے لیکن خواندہ تھے' یہ فدیہ مقرر کیا کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

مدینے میں صفہ واحد درسگاہ نہ تھی۔ خود نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں یہاں کم از کم نو مسجدیں تھیں۔ ہر مسجد درسگاہ کا کام دیتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رسول اکرم ﷺ نے دین کی تعلیم کے علاوہ نشانہ بازی' تقسیم ترکہ' ریاضی' مبادی طب' علم ہیئت اور علم انساب کے مطالعے پر بھی زور دیا۔ حالات کے مطابق عورتوں کی تعلیم کا بھی انتظام تھا' وہ جو سوالات کرتیں آنحضرت ﷺ ان کا جواب دیتے' اسی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ عورتیں عہد رسالت میں بھی اور اس کے بعد بھی گھریلو کام کی انجام دہی کے ساتھ غزوات و جہاد میں شریک ہوتیں' زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کرتیں' میدان جنگ میں ان کو پانی پلاتیں اور مردوں کے جہاد میں مصروف ہونے کی صورت میں گھروں میں پہرے دار کے فرائض ادا کرتیں۔ حضرت عائشہؓ فقہ اور دیگر اسلامی علوم نیز ادب' شاعری اور طب میں بڑا دخل رکھتی تھیں۔ بعد میں صحابہ نے ابتدائی تعلیم عام کرنے کے لئے ایک زبردست مہم چلائی جس میں شاعری' خطابت اور مبادیات ریاضی کو بطور انتخابی مضامین شامل کیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ساتھ خواندگی کی جو مہم شروع کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصے میں صحابہ کرام نے معمولی نوشت و خواندہ بقدر تعلیم حاصل کر لی۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں ان علوم و فنون کا دائرہ وسیع ہوا جو عہد نبوی میں رائج تھے اور تبلیغ کی ضرورتوں اور دوسری اقوام کے تیزی سے حلقہ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوئے انہیں حاصل کرنے کے لئے نئے علوم و فنون ایجاد

ہوئے جن میں نحو' اصول فقہ اور حدیث کی صحت کو جانچنے کے لئے علوم سرفہرست آتے ہیں' سیر و مغازی کی بنیاد پر خطابت علم انساب اور علم الفرائض کو فروغ ہوا۔

علم انساب عربوں کا پرانا علم تھا۔ خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ اس کے مانے ہوئے عالم اور اپنے زمانے کے مشہور نساب تھے۔ حضرت عمرؓ نے وظائف دینے کے سلسلے میں قبائل عرب کا نقشہ مرتب کرایا جس سے انساب کے علم کی تحریر و تدوین کا آغاز ہوا۔ حضرت علیؓ شعر و سخن کے بڑے ناقد تھے' حضرت علیؓ کے نام سے تو ایک پورا دیوان منسوب ہے گو یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن جوزی نے سیرت میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو مکاتب قائم کئے تھے ان میں آگے چل کر ادب' نعت اور شعر وغیرہ کی تعلیم دی جانے لگی۔ خود حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنی اولاد کو اچھے اشعار یاد کراؤ۔ تبلیغ' معاشرتی معاملات اور جنگ اور صلح کی شرائط طے کرنے کے سلسلے میں فن خطابت کو بالخصوص ترقی ہوئی۔ حضرت علیؓ کے مجموعہ خطبات ''نہج البلاغہ'' سے اس زمانے کی خطابت کے معیار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ علم الفرائض یعنی میت کے ترکے کی تقسیم کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔ میراث کی تقسیم کے لئے حساب کا جاننا ضروری تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک رومی حساب دان سے اس علم کے اصولوں کو مرتب کرایا۔ حضرت زید بن ثابتؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ اس علم کے بڑے ماہر تھے۔ عربی عربوں کی زبان تھی۔ وہ بغیر اعراب اور قواعد کے اسے صحیح پڑھ لیتے تھے' لیکن جب دوسری قومیں مسلمان ہوئیں تو وہ قرآن پڑھنے میں غلطی کرتی تھیں اس لئے حضرت علیؓ کی ہدایت پر ابو الاسد دلی نے نحو کے چند ابتدائی قاعدے وضع کئے جن سے بعد میں رفتہ رفتہ نحو کا جامع اور مبسوط علم وجود میں آیا۔

فقہ نے خلفائے راشدین کے دور میں جنم لیا۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں جب کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوتا تھا تو اس کے حل کے لئے وحی نازل ہوتی تھی یا آپ ﷺ خود اس کا حل بتا دیتے تھے' اس لئے اس زمانے میں فقہ کی ضرورت نہ تھی۔ آپ ﷺ

کی وفات کے بعد قرآن اور حدیث کی بنیاد پر فقہ کا نیا علم وجود میں آیا۔ صحابہ کرامؓ ان ہی سے نئے مسائل کا استنباط کرتے تھے۔ جب ان دونوں میں مسئلے کا حل نہ ملتا تھا تو عقل سے کام لیتے تھے جسے فقہی اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو فقہ اور اجتہاد میں غیر معمولی درک تھا' انہوں نے اصول فقہ کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں ترقی کرتے کرتے ایک مستقل اور مبسوط فن کی حیثیت حاصل کر لی۔

حضرت عمر نے دینی اور لسانی علوم کی تعلیم کے لئے ایک وسیع نظام قائم کیا۔ تمام مفتوحہ ممالک میں قرآن کے درس کے لئے تنخواہ دار معلم مقرر کئے۔ ابو درداءؓ کے حلقۂ درس میں طلباء کی تعداد سولہ سولہ سو تک پہنچ جاتی تھی' جنہیں وہ دس دس کی جماعت میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود ان کی نگرانی کرتے تھے۔ زیادہ تر شرعی احکام سورۂ بقرہ' سورۂ نساء' سورۂ مائدہ' سورۂ حج اور سورۂ نور میں ہیں' اس لئے ان کا سیکھنا لازمی قرار دیا۔ بدوؤں کے لئے قرآن کی ابتدائی تعلیم لازمی بلکہ جبری کر دی' ابو سفیانؓ کی قیادت میں ایک معائنہ ٹیم اس غرض سے مقرر کی کہ وہ مختلف قبائل میں جا کر ہر شخص کا امتحان لے اور جسے قرآن کی کوئی سورت بھی یاد نہ ہو اسے سزا دے' طلباء کے لئے وظائف مقرر کئے' قرآن مجید کی صحیح قرأت اور اعراب کی غلطیوں سے بچنے کے لئے عربی زبان اور ادب کی تعلیم لازمی کر دی اور یہ حکم جاری کیا کہ جو شخص لغت کا عالم نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھے' حدیث کی صحت کی تحقیق کے اصول مقرر کئے اور غلط روایات کی اشاعت کا سد باب کیا' اصول حدیث کی طرح اصول تفسیر کی بنیاد ڈالی' قرآن عربی زبان میں ہے اور سب سے مستند کلام دور جاہلیت کے عرب شعراء کا کلام ہے۔ اس لئے مفسر قرآن صحابہ کو قرآن کی جن الفاظ کے معانی میں شبہ ہوتا تھا وہ اس کی تحقیق دور جاہلیت کے عرب شعراء کے کلام سے کرتے تھے۔ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہا کرتے تھے کہ جب اللہ کے کلام میں کسی لفظ کے معنی سمجھ میں نہ آئیں تو اسے اشعار عرب میں تلاش کرو' اس لئے شاعری کا ذوق اس دور میں

بھی قائم رہا۔ الجاحظ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم صادر کیا تھا کہ ''اپنے بچوں کو تیراکی، گھوڑے کی سواری، مشہور کہاوتوں اور عمدہ اشعار کی تعلیم دو''۔

## تعلیم کا مقصد

تعلیم کے مفہوم کی طرح تعلیم کے مدعا میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو عموماً اسی لئے تعلیم دلاتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کمانے' کھانے کے قابل ہو جائیں ''تعلیم برائے معاش'' ہی ان کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ اگرچہ زبان سے اس کا اعتراف کم ہی لوگ کرتے ہیں' بلاشبہ کمانا کھانا انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور بہر حال اس بات کی کماحقہ فکر ہونی چاہئے کہ بچہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے لیکن انسانیت کا تقاضا صرف یہی تو نہیں ہے تنہا اسی کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دے دینے سے بچہ معاشی حیوان تو ضرور بن جائے گا انسان ہرگز نہیں بن سکتا اور مسلمان کے نزدیک تو جان سے بھی زیادہ ایمان عزیز ہوتا ہے ایسی صورت میں معاش ہی کو مقصد زندگی ٹھہرا کر تعلیم و تربیت کے نظام کو اس کے گرد گھمانا دراصل بچے پر احسان نہیں صریح ظلم ہے۔

اسی طرح بیشتر اساتذہ بھی تعلیم کا مقصد زبان سے خواہ کچھ بیان کریں مگر عملاً ''تعلیم برائے علمیت'' ہی کے قائل نظر آتے ہیں' وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ اپنی ساری توجہ لکھنے پڑھنے' اپنی علمی لیاقت بڑھانے اور اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرنے پر مرکوز رکھیں' شخصیت کے دیگر پہلو (جسمانی' عملی' اخلاقی وغیرہ) ان کی نظروں سے عموماً اوجھل رہتے ہیں' حالانکہ متوازن اور کامیاب زندگی کے لئے یہ پہلو بھی اتنے ہی اہم ہیں بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ توجہ کے لائق ہوتے ہیں۔ علمی لیاقت میں اضافہ بلاشبہ نہایت ضروری بھی ہے اور غیر معمولی توجہ بھی چاہتا ہے لیکن شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز یا علمیت پر قربان کر دینے کے نتائج بھی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور اعلیٰ علمی

لیاقت رکھنے والے لوگ صحت' اخلاق یا عمل کے اعتبار سے ناقص رہ کر دوسروں کے لئے مفید ثابت ہونے کے بجائے انتہائی نکمے اور مضر ثابت ہوتے ہیں۔

تعلیم کے متعدد اور مقاصد بھی پیش کئے جاتے ہیں جن میں خاص خاص یہ ہیں:

① مذہب کا بے نفس خادم بنانا۔
② مملکت کا اچھا شہری بنانا۔
③ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہم آہنگی کے ساتھ سنوارنا۔
④ انفرادیت کی نشوونما اور خودی کی تکمیل کرنا۔
⑤ زندگی بسر کرنے کے لئے پورے طور سے تیار کرنا یعنی طلبہ کو اس لائق بنانا کہ وہ:

☆ اپنی ذات کا تحفظ کرسکیں۔
☆ عالم کو ضروریات زندگی فراہم کرسکیں۔
☆ اولاد اور کنبے کی پرورش ونگہداشت کرسکیں۔
☆ سماجی تعلقات کو استوار رکھ سکیں۔
☆ فرصت کے اوقات کو اچھی طرح گزار سکیں۔

⑥ اخلاق اور سیرت وکردار کو سنوارنا۔
⑦ صحت مند جسم میں صحت مند دل ودماغ پروان چڑھانا وغیرہ۔

تعلیم کے مذکورہ مقاصد کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

## تعلیم کا صحیح مقصد:

یعنی طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا' ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور انہیں ذہنی' جسمانی' عملی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں' کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں نیز

انفرادی، عائلی اور اجتماعی حیثیت سے ان پر جو ذمہ داریاں ہیں ان کے خالق و مالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ان سے وہ کما حقہ عہدہ برآ ہو سکیں۔

تعلیم کا یہی صحیح، جامع اور بنیادی مقصد ہے کیونکہ:

اللہ نے سب کو پیدا کیا ہے وہی سب کو پالتا پوستا اور سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ وہی سب کا مالک، معبود، حاکم اور بادشاہ ہے، اس کی سلطنت بے پایاں اور لا محدود ہے، ہماری یہ لمبی چوڑی زمین اس کی بے پایاں مملکت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے، اللہ نے اس کو طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے، ان نعمتوں کو ہمارے تصرف میں دے کر ہمیں یہاں آباد کیا ہے۔

یاد رکھو......! کائنات کی ساری چیزوں کا حقیقی مالک وہی ہے ہمیں جو کچھ ملا ہے اس کی امانت ہے۔ ہم اس کے بندے اور غلام ہیں۔ اس نے ہمیں زندگی گزارنے کا مفصل طریقہ بتا دیا ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس کی نعمتوں کے شکر گزار ہوں۔ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور اس کی سلطنت میں اس کی مرضی پوری کریں۔ اس نے ہم پر طرح طرح کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے اس نے ہمیں ایک طاقتور جسم عطا فرمایا ہے۔ جسم کے اندر مختلف قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، گرد و پیش میں طرح طرح کے وسائل و ذرائع مہیا کئے ہیں۔ اس کی عطا کی ہوئی کوئی چیز بے کار نہیں ہے۔ ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں، صلاحیتوں اور ساز و سامان کو اس کی مرضی کے مطابق صرف کریں یعنی اس کے شکر گزار اور صالح بندے بن کر رہیں۔

ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تعلیم و تربیت میں مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رہیں:

① جسمانی صحت: اللہ تعالیٰ نے جو سڈول جسم عطا فرمایا ہے اس کی صحت و نشو و نما کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچانا۔

حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی کرانا' جسمانی محنت' ورزش یا کھیل اور صفائی ستھرائی کا عادی بنانا اور احتیاطی تدابیر بتانا۔

۲ فطری قوتوں اور صلاحیتوں کی نشو ونما: اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو فطری قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں وہ سب اس کے لئے نہایت ضروری اور کارآمد ہیں۔ان سب کو پروان چڑھانے کی فکر رکھنا ان کے مناسب استعمال کے ضمن میں مدد اور رہنمائی کرنا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ تو دبانا اور کچلنا اور نہ ان کو نظر انداز کرنا۔

۳ فطری خواہشات ومیلانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور پسندیدہ نیز مفید مشاغل میں دلچسپی پیدا کرنا: اسلامیات' زبان و ادب' معاشرتی علوم اور بیرون نصاب مصروفیات وغیرہ کے ذریعے یہ کام کیا جائے تاکہ بچے اپنے فرصت کے اوقات پسندیدہ اور مفید مشاغل میں صرف کرنے کے عادی بنیں۔

۴ صحیح انداز سے سوچنے اور برے بھلے' حق و باطل میں تمیز کرنے کی کسوٹی فراہم کرنا تاکہ غلط افکار اور باطل نظریات کا شکار نہ ہوں۔

۵ انفرادی' عائلی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا صحیح علم اور انہیں انجام دینے کی عملی تربیت کرنا۔

۶ قدرت کے کارخانہ کا علم بہم پہنچانا اور اس کے پوشیدہ اور کھلے ہوئے خزانے کا صحیح مصرف بتانا۔

۷ لکھنا پڑھنا اور دیگر معلومات فراہم کرنا۔

۸ ٹھوس سیرت وکردار کا حامل بنانا۔

یہ ہیں وہ اعلیٰ اور پاکیزہ مقاصد جو بچوں کی تعلیم و تربیت میں بڑوں کے پیش نظر ہونے چاہئیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بچوں کو قبل از وقت بالغ بنانے کی کوشش کی جائے یا ان کی بچپن کی خصوصی دلچسپیوں اور میلانات کو نظر انداز کر کے تعلیم

وتربیت کا پروگرام بنایا جائے۔ مستقبل کی فکر میں لوگوں سے عموماً ایسی چوک ہو جاتی ہے چنانچہ بچوں پر اس کا شدید ردعمل ہوتا ہے' ان کی شخصیت میں بغاوت یا منفعت کے جراثیم پلنے لگتے ہیں اور ان کی ذہنی وجسمانی صلاحیتیں ٹھٹھرنے لگتی ہیں' اس لئے ان اعلیٰ مقاصد کو ہر وقت اپنے سامنے ضرور رکھا جائے لیکن بچوں سے نہ تو بہت اونچی توقعات وابستہ کی جائیں اور نہ کوئی چیز قبل از وقت ان پر تھوپی جائے' بلکہ تعلیم و تربیت کا پروگرام مرتب کرتے وقت ان کی بچگانہ خصوصیات اور دلچسپیوں کا حتیٰ الامکان لحاظ رکھا جائے اور انہیں راستوں سے بتدریج یہ مقصد بروئے کار لائے جائیں۔

۴

# محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور معلم

## باب: ④

ایک مسلمان کے لئے تو حضور ﷺ کی ذات میں اسوہ کامل ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس سے انسانیت آپ ؐ کی ذات مبارکہ سے روشنی حاصل نہ کر سکے اور آپ ﷺ کی ذات تو مجسم علم ہے۔ آپ ؐ نے خود کو **انما بعثت معلما** بتا کر اہل علم کی قدردانی کی۔ اس باب میں آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے اس رخ کو بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ بطور معلم آپ ﷺ کا ایک خصوصی انداز تھا۔ تعلیم انفرادی ہو یا اجتماعی معلم کو کچھ اصول وقواعد پیش نظر رکھنا پڑتے ہیں۔ آپ ﷺ جس وقت عرب معاشرہ کو تعلیم دینے کے لئے متعین کیے گئے تو اس وقت یہ معاشرہ جہالت کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور تباہی کا سمندر ان کے سامنے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ لوگ اپنے آپ کو اہل زبان سمجھتے تھے کیونکہ شاعری ان میں بہت مقبول تھی اور دوسرے لوگوں کو یعنی غیر عربی کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے وہ طریق تعلیم اپنایا جس نے ان لوگوں کے ذہنوں کو یکسر بدل کے رکھ دیا اور وہ بدو سے دنیا کے امام بنے۔ ذیل میں چند اہم نکات دیئے جا رہے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ بحیثیت معلم آپ ﷺ کے طریق تعلیم میں کون سی خصوصیات تھیں اور آپ ﷺ تعلیم و تبلیغ میں کن پہلوؤں اور طریقوں کو پیش نظر رکھتے تھے جن کی بنا پر جہالت میں ڈوبی ہوئی قوم بتدریج ایک ایسی قوم میں ڈھل گئی جس کے افراد نے اس دنیا کی راہنمائی کا بیڑا اُٹھایا۔

### واضح مقاصد:

طلباء کو جو بھی پڑھایا جاتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی واضح مقصد ہونا چاہیے بغیر مقصد کے پڑھایا جانے والا سبق صرف وقت کا ضیاع اور قومی خزانے پر ظلم ہے۔ ایک استاد

کے لئے ضروری ہے وہ تعلیم بغیر مقصد کے نہ دے اسے خود بھی علم ہو کہ پڑھائے جانے والے سبق کے مقاصد کیا ہیں؟ اور طلباء کو بھی ان مقاصد کا علم ہوتا کہ وہ سبق میں دلچسپی سے حصہ لیں یہ نہ ہو کہ استاد بغیر مقصد کے سبق پڑھائے جارہے ہیں اور طلباء اس کو فضول سمجھ کر اپنی شرارتوں میں مگن رہیں سبق کے واضح مقصد سے استاد اور طلبہ دونوں کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔ مرزا ثنی محمد سبق کے واضح مقاصد کے بارے میں اپنی کتاب ''علم التعلیم'' میں یوں رقمطراز ہیں: سبق کا مقصد متعین اور معلم و متعلم دونوں پر اچھی طرح واضح ہو۔ حضور اکرم ﷺ جو کچھ بتانا یا سکھانا چاہتے اس کا بنیادی مقصد آپ ﷺ کی نظر میں متعین ہوتا تھا اور آپ ﷺ کے سامعین پر بھی اس کا مقصد اچھی طرح واضح ہو جاتا کہ وہ کیا کچھ کس مقصد کے لئے سن رہے ہیں۔ معلم کو بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہئے تا کہ دوران سبق معلم و متعلم دونوں کا پورا وقت اور توجہ اس کے حصول کی کوشش میں صرف ہو اور اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچ جائیں۔ دراصل تعلیم کی بنیاد ہی مقاصد پر رکھی گئی ہے جو بھی قوم تیار کی جاتی ہے وہ مقاصد کے متعین ہونے کے بعد تعلیم کی مدد سے تیار ہوتی ہے۔ پہلے تعلیم کے مقاصد متعین کئے جاتے ہیں اور ان مقاصد کے تحت نصاب بنایا جاتا ہے تا کہ مطلوبہ افراد مہیا ہو سکیں لہٰذا ایک استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ آنحضور ﷺ کے طریق تعلیم کو اپناتے ہوئے اپنے طلباء کو سبق کے واضح مقاصد سے آگاہ کرے۔

دوسری اقوام کے نزدیک انسان کا مقصد بہتر زندگی گزارنا ہے بہتر کے مفہوم میں مادی بہتری کا مفہوم نمایاں ہے ان کی جدوجہد کا مقصود مادی سہولتیں اور آسائشیں فراہم کرنا ہے، تعلیم ان کے نزدیک عیش وآرام کی زندگی گزارنے کا وسیلہ ہے تعلیم ایک قسم کا کاروبار ہے جس میں محنت یا دولت اور وقت اس لئے صرف کئے جاتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں بیش از بیش مادی فوائد اور آسائشیں حاصل ہوں اور زندگی بڑے مزے سے گزرے۔ مادی نظام تعلیم انسان کو حصولِ دولت کے لئے

سرگرم عمل بناتا ہے۔

اسلام کے نزدیک تعلیم کا مقصد ذریعۂ روزگار نہیں یہ مقصد حیات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے تعلیم سے ہدایت الٰہی کا علم حاصل ہوتا ہے، تعلیم سے انسان خلافت ارضی کے فرائض تقاضوں اور ذمہ داریوں سے انسان کو رضائے الٰہی کے واجبات اور تفہیمات کا پتہ چلتا ہے۔ تعلیم انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر فائز کرتی ہے اور پھر انسان کو فرائض خلافت ادا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ تعلیم انسان کے نزدیک کارعبادت ہے تعلیم انسان کو حیوانیت کی پستی سے اٹھا کر انسانیت کی بلندی پر پہنچاتی ہے۔ فکرونظر کے اس عظیم فرق کی وجہ سے اسلامی نظام تعلیم میں استاد اور شاگرد کے نقطۂ نظر میں، فکروفہم میں، طریقۂ کار میں اور طرزِ عمل میں عظیم الشان فرق واضح ہوجاتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد اور شاگرد دونوں اخلاص اور للٰہیت سے سرشار نظر آتے ہیں دونوں پر تقویٰ اور پرہیزگاری کی فضا نظر آتی ہے، قناعت، توکل اور استغناء کا ماحول نظر آتا ہے اس کے برعکس دوسری طرف مغربی نظام تعلیم میں استاد اور شاگرد دونوں کا مطمح نظر منفعت اور آغاز پرستی ہوتی ہے۔

اس طویل بحث سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں مقاصد کے بغیر تعلیم دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ استاد کو چاہئے کہ وہ سبق کے مقاصد سے آگاہ ہو اور اس کے شاگرد بھی اس سے آگاہی حاصل کریں نیز ان مقاصد کے حصول کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔

## جذبہ شوق وتجسس:

کسی بھی کام میں کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آمادگی وتجسس پایا جائے۔ اگر اس کام کو کرنے کے لئے کرنے والا آمادہ نہیں تو وہ کبھی بھی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ دوسری اہم چیز تجسس ہے یعنی جذبہ شوق۔ کوئی بھی کام کرنا مقصود ہوتو اسے انہی دو چیزوں کے پیش نظر کیا جاتا ہے اگر اس کے پیچھے تجسس کا جذبہ شوق

نہ ہوتو اس وجہ سے دلچسپی برقرار نہیں رہتی اور بجائے کامیابی کے ناکامی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ البتہ اگر تجسس کا جذبہ کارفرما ہوتو کامیابی یقینی ہو جاتی ہے لہٰذا استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلبہ میں آمادگی وتجسس کا جذبہ پیدا کرے۔

حضور ﷺ اپنے صحابہ کرام میں آمادگی وتجسس کا جذبہ بڑے احسن طریقے سے پیدا فرماتے تھے۔ آپ ﷺ اکثر سوالیہ انداز اختیار کرتے مثلاً فرماتے کیا تمہیں جنت کا ایسا آسان طریقہ نہ بتا دوں ؟اسی طرح فرماتے برباد ہوا وہ شخص جس نے رمضان المبارک کو پایا اور اپنی بخشش سے محروم رہا۔ مرزا انجی محمد آنحضور ﷺ کی اس خوبی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

طلباء کو آمادہ کر کے یا ان کا تجسس ابھار کر سبق پیش کیا جائے''۔

حضور ﷺ کوئی سوال کر کے یا کوئی ادھوری بات کہہ کر لوگوں کا تجسس ابھار دیتے اور اپنی طرف اچھی طرح متوجہ کر لیتے تب کوئی بات پیش فرماتے مثلاً آپ ﷺ کا سوال کہ سب سے بڑا سخی کون ہے؟ یا منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا: ہلاک ہوا وہ ہلاک ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک طلباء متجسس یا ذہنی طور پر آمادہ نہ ہوں سبق کی طرف متوجہ ہو ہی نہیں سکتے اور طلبہ کی توجہ ودلچسپی اور راہنمائی کے بغیر معلم کی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

حضور اکرم ﷺ نے ہمارے سامنے وہ طریقۂ تعلیم پیش کیا کہ جس کو اپنا کر ہم اپنے معلمین کی راہنمائی بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ طلباء میں آمادگی وتجسس پیدا کرنا استاد کا اولین فرض ہے اور استاد فرض کو نبھانے میں سست نہیں بلکہ بغیر توجہ کے سبق پڑھا کر فارغ ہو جاتے ہیں خواہ طلباء کو سمجھ آئے یا نہ آئے لیکن ہمارے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ آنحضور ﷺ کے طریق تعلیم کو اپنا کر انہیں اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

## دلچسپی کا عنصر:

تعلیم کے حصول کے لئے دلچسپی کا عنصر نہایت اہمیت کا حامل ہے اگر سبق کے دوران طلباء دلچسپی نہ لیں تو وہ استاد کے لیکچر کو پس پردہ ڈال کر خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ طلباء کی دلچسپی برقرار رکھنا استاد کا اولین فرض ہے کیونکہ اس کے بغیر حصول علم ناممکن ہے۔ حضور اکرم ﷺ طلباء کی دلچسپی ہمیشہ برقرار رکھا کرتے تھے، موقع محل کی مناسبت سے جو طریقۂ تدریس آپ ﷺ بہتر خیال فرماتے اس کو اختیار کر لیتے؛ لیکن دلچسپی کا خاص خیال رکھتے، کبھی سوالیہ انداز اختیار کر کے دلچسپی اور تجسس پیدا کرتے اور کبھی کسی بیان کا خصہ بنا کر طلباء کو متوجہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے طلباء کو بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے اور ہمیشہ اسباق دلچسپ ترین انداز میں پیش کرتے۔ پروفیسر سخی محمد مرزا دلچسپی رکھنے کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> معلم کو دورانِ سبق یہ خیال رکھنا چاہئے کہ طلباء کی توجہ نہ بھٹکے ان میں اکتاہٹ نہ پیدا ہونے پائے حضور ﷺ اس کا بڑا خیال رکھتے اگر اس کے آثار محسوس فرماتے تو تھوڑی دیر کے لئے موضوع تبدیل کر لیتے یا جتنا بتا چکے ہوتے اتنے پر ہی اکتفا کرتے مواد کی پیش کش کے لئے موقع محل کی مناسبت سے مندرجہ ذیل طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کرتے۔

① بات چیت کا طریقہ۔
② اطلاعی یا بیانیہ طریقہ۔
③ سوال و جواب کا طریقہ۔
④ لیکچر یا خطابت کا طریقہ۔

معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی طلباء کی دلچسپی کو برقرار رکھے اور حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل پیرا ہو کر اپنے طلباء کی راہنمائی کرے۔ حضور ﷺ

ہمیشہ اپنے طلباء کی دلچسپیوں کا خاص خیال رکھتے لیکن آج معلم صرف سبق پڑھانے تک محدود ہے جس کی بنا پر طلباء عدم توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور نتائج انتہائی بھیانک ہوتے ہیں طلباء کی دلچسپی پیدا کرنا استاد کا اہم ترین مقصد ہے۔))

## الدین یسر کا تصور:

اسلام دین یسر ہے آسانی کا دین ہے' اس میں تدریج ہے' شراب کو پہلے کم نفع زیادہ نقصان والی کہا گیا۔ نماز کے قریب شراب کو پہلے پی کر نشے کی حالت میں آنے سے روکا گیا۔ آخر میں انتہائی مشکل قدم مؤمن سے اٹھانے کے لئے یوں کہا گیا اب مؤمنوں پر ہمیشہ کے لئے شراب حرام کر دی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام نے اسے برضا ورغبت ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

لہٰذا طالب علم کو شروع سے ہی مشکل میں نہ ڈالیں کہ کہیں وہ گھبرا کر دل نہ چھوڑ بیٹھے بلکہ آہستہ آہستہ مشکل الفاظ' پیروں اور واقعات کو واضح کریں کہ دین سے برگشتہ ہونے سے' بچے طلبہ اگر غیر محسوس طور پر مشکلات پر قابو پائیں گے تو روحانی سکون میسر آئے گا۔ اسلام کا قانون اس حیثیت کی ترجمانی کرتا ہے کہ ہر انسان کے معیار کے مطابق گفتگو کی جائے اسی طرح دل بڑھتا ہے اور دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ آسان اور مشکل کا معیار اپنے لحاظ سے متعین نہ کریں بلکہ طلباء کے علم کی روشنی میں کریں ورنہ تدریس کامیاب نہیں ہوگی اور طلبہ ٹھونسی جانے والی حقیقتوں سے منکر ہو جاتے ہیں۔ ٹائم ٹیبل میں اسباق کی ترتیب اس طرح کریں کہ بعد میں مشکلات کے کانٹے نہ چننا پڑیں سبق کے شروع میں آسانی رکھنا انتہائی ناگزیر ہے۔

## آسانی پیدا کرنا:

دورانِ تدریس بعض موضوعات ایسے بھی ہیں جو نہایت ہی مشکل ہوتے ہیں ان کا سمجھنا طلباء کے بس سے باہر ہوتا ہے اس قسم کے موضوعات اگر طلباء کو زبانی

بتائے جائیں تو وہ شدید بوریت پیدا کرتے ہیں۔ استاد کو چاہئے کہ پھر سبق کو آسان بنا کر طلباء کے سامنے پیش کرے سب سے پہلے گھر پر خود تیاری کرے مشکل الفاظ کی توضیح وتشریح آسان الفاظ میں کرے پھر طلباء کو وہ سبق پڑھایا جائے تاکہ ان کے لئے سمجھنا آسان ہو حضور ﷺ طلباء کو مشکل میں نہیں ڈالتے تھے بلکہ ان کے لئے آسانیاں پیدا فرماتے تھے آپ ﷺ ان کی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے سبق کو احسن طریقے سے پیش فرماتے جتنا آسانی سے یاد ہوسکتا اتنا سبق پڑھاتے۔ طلباء کے لئے آسانی کرنے کے بارے میں پروفیسر سخی محمد مرزا اپنی کتاب علم التعلیم میں یوں رقم طراز ہیں کہ معلم کو چاہئے کہ طلباء کے لئے حتیٰ الامکان آسانیاں پیدا کرے یعنی انی مشکلات میں نہ ڈالے کہ وہ گھبرا کر ہمت ہار دیں ایک حدیث مبارک ہے:

''آسانیاں بہم پہنچاؤ' مشکلات میں نہ ڈالو''۔

بتدریج آسان سے مشکل کی طرف بڑھیں تاکہ بچے باآسانی مشکلات پر قابو پاتے جائیں۔

حضور ﷺ کی حدیث مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ طلباء کو مشکل میں نہیں ڈالتے تھے بلکہ ان کے لئے آسانی پیدا فرماتے تھے لیکن صد افسوس! آج کے معلم پر کہ وہ صرف لیکچر دینے پر ہی اکتفا کرتا ہے اور اکثر اساتذہ کرام تو طلباء کے سوال پوچھنے پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ کو چاہئے کہ وہ حضور ﷺ کے احسن طریقۂ تدریس کو اپناتے ہوئے طلباء کے لئے سبق کو آسان بنا کر پیش کریں۔ کتاب العلم میں امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے: **باب من ترك بعض الاختيار مخافة ان يقصر هم بعض الناس عنه فيقصوا فی الله ضة** یہ باب ہے ان کے بیان میں جنہوں نے بعض علوم کے بیان کو اس لئے چھوڑا کہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ لہٰذا وہ مشقت میں پڑ جائیں گے۔

کامیاب استاد وہ ہے طالب علموں ذہنی صلاحیت کو دیکھ کر گفتگو کرے۔

## طلبہ کو اکتاہٹ سے بچانا:

استاد ایک قوم کا مکمل طور پر معمار ہوتا ہے اگر استاد بچوں کا صحیح طور پر اندازہ کر کے پڑھائے تو اس کی تدریس نہایت مؤثر ہوگی۔ بعض دفعہ اساتذہ بچوں کی ذہنی حالت کا اندازہ لگائے بغیر پڑھاتے چلے جاتے ہیں اور بچے بوریت (اکتاہٹ) محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں طلبہ اور معلم کی ہم آہنگی بالکل ناممکن ہے یہ تدریس کا ایک خاص اصول ہے کہ پڑھاتے وقت معلم کا اولین فرض ہے کہ وہ طلبہ کی اکتاہٹ یعنی بوریت کا خاص خیال رکھے ورنہ طلباء میں بے چینی پیدا ہو جائے گی اور تعلیم کا عمل نہیں ہو سکے گا۔

حضور ﷺ کا جو طریقہ تدریس تھا' وہ انتہائی اچھا اور دلچسپ ہوا کرتا تھا کہ صحابہ کرامؓ بوریت یا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی تدریس کے دوران صحابہ کی دلچسپیوں کا اور ان کی ذہنی استعداد کا خیال رکھتے ہوئے ان کو بوریت محسوس نہیں ہونے دیتے تھے ایک مسلمان استاد کو بھی چاہئے کہ وہ طلباء کی بوریت کا خیال رکھے۔

## سبق کی مثالوں سے وضاحت کرنا:

سبق کی وضاحت کے لئے مثالوں کا پیش کرنا بہت ضروری ہے۔ سبق کے اندر تو بعض نکات اتنے واضح ہوتے ہیں کہ ان کے لئے مثالوں کا ہونا ضروری نہیں ہوتا البتہ اگر مثالیں دے دی جائیں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے لیکن کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سمجھنا مثالوں کے بغیر ممکن ہی نہیں مثلاً چھوٹے بچوں کو اگر دودھ دہی والے جانوروں کے متعلق پڑھانا ہے تو ان کو کم از کم بکری' گائے اور بھینس وغیرہ کی مثال دینا پڑتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ مثالوں کی مدد سے اسباق کی وضاحت فرمایا کرتے تھے۔

مؤمن کے گناہوں کی معافی کو خزاں میں پتوں کے جھڑنے سے تشبیہ دیتے تھے کہ مؤمن کے گناہ اسی طرح جھڑ جائیں گے جس طرح موسم خزاں میں درختوں کے پتے جھڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ مثالوں سے وضاحت فرمائی ہے۔ سورۃ الحشر میں ارشاد ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾

''اگر ہم اتارتے یہ قرآن پہاڑ پر تو دیکھتا وہ دب جاتا پھٹ جاتا' اللہ کے ڈر سے اور یہ مثالیں ہم سناتے ہیں لوگوں کو شاید وہ دھیان کریں''۔

اسی طرح قرآن پاک میں جگہ جگہ مثالیں موجود ہیں مسلمان جنت اور دوزخ کے تصور سے واقفیت رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مثالوں سے سبق نہیں سیکھتا قرآن نے جنت کی وضاحت بہترین مثال سے کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ﴾ (الرحمٰن)

''اس میں میوہ ہے اور کھجوریں جن کے میوے پر غلاف اور اناج جس کے ساتھ بھس ہے''۔

قرآن پاک اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ بات مکمل کھل کر سامنے آتی ہے کہ مثالوں سے کسی چیز کی وضاحت کتنی ضروری ہے۔ معلم کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے سبق کو اچھی طرح سے تیار کرے اگر ٹھوس چیزیں مل جائیں تو ان کو پیش کرے ورنہ اصلی چیزوں کے ماڈل چارٹس وغیرہ پیش کر کے وضاحت کرے' اس لئے آج کے ماہرین تعلیم تدریسی معاونات کو ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کی مدد سے سبق کی وضاحت ہو جاتی ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے کئی سو برس پہلے اس اصول پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔

## تعلیم میں تدریج کا خیال رکھنا:

تعلیم و تدریس کا عمل فطری طریقے سے ہی انجام پا سکتا ہے یعنی طلباء کو درجہ بدرجہ ہی سکھایا جا سکتا ہے۔ چاہے عمل تکمیل کا معاملہ ہو یا عمل تربیت کا' ہاتھوں پر سرسوں جمانے کی توقع بالکل غیر فطری ہے۔ ایک نبی اور رسول بھی نظام ربانی کو چند دنوں میں آزادانہ طور پر رائج نہیں کر دیتا خود نبی کو عرب کے نظامِ زندگی میں پورا اسلامی انقلاب برپا کرنے میں دس سال لگے تھے اس دوران میں پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کی اپنی حکومت میں چند سال تک شراب نوشی ہوتی رہی' سود لیا اور دیا جاتا تھا' جاہلیت کا قانون میراث جاری رہا' پرانے قوانین نکاح و طلاق جاری رہے لیکن آپ ﷺ نے آہستہ آہستہ معاشرے سے تمام برائیوں کو نکالا اور عرب کے بدو دنیا کی راہنمائی کے لئے منتخب ہو گئے۔ پروفیسر سخی محمد مرزا کہتے ہیں:

علمی تدریس میں آپ ﷺ تدریج کا اصول اختیار کرنے کی تلقین فرماتے۔ ایک حدیث میں قبائل میں جا کر تعلیم و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ چھوٹتے ہی دین کے سارے تقاضے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں ڈرانہ دیا جائے پہلے انہیں اساسی کلمہ کا قائل بنایا جائے' پھر اگر وہ توحید اور رسالت کو مان لیں تو ان کو نماز کی دعوت دی جائے' پھر اس کے بعد روزہ' زکوٰۃ اور حج کی دعوت دی جائے۔

اساتذہ کو بھی تعلیم و تربیت میں تدریج کے اصول پر کاربند ہونا چاہئے اور عملی تکمیل اور عملی تربیت دونوں صورتوں میں درجہ بدرجہ تکمیلی مراحل طے کرنے چاہئیں۔ جس طرح بچہ بولنا سیکھنے سے پہلے پڑھنا نہیں سیکھ سکتا اسی طرح اعلیٰ علمی اور عملی مدارج پر پہنچنے سے پہلے ابتدائی مدارج طے کرنا پڑتے ہیں رسمی طور پر اصلی تعلیمی ڈگری حاصل کرنے کے لئے بھی کئی سال لگتے ہیں جب کہ علمی گہرائی حاصل کرنے کے لئے اس سے بھی زیادہ عرصہ اور محنت درکار ہوتی ہے۔ حکماء حضرات فرماتے ہیں:

سب کچھ ایک ساتھ بتا دینے کی بجائے سبق کو مناسب اجزاء میں تقسیم کر لیا

جائے پھر طلباء کو آمادہ کر کے ایک جزیشن کیا جائے اور اسی جزو کے ذہن نشین ہو جانے کی طرف سے اطمینان کر کے اگلا جزو لینا چاہیئے۔ حضرت معاذؓ والی حدیث سے اس ضمن میں راہنمائی ملتی ہے اس طرح پورا سبق با آسانی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

## معلوم سے نامعلوم کی طرف

آنحضور ﷺ کے طریق تعلیم کا ایک سنہری اصول یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ ہمیشہ معلوم سے نامعلوم کی طرف بڑھتے تھے سب سے پہلے کسی ایسی چیز کا ذکر کرتے جس کے متعلق صحابہ کرام کو پہلے سے علم ہوتا پھر اس کو بتا دینا کہ مثالوں کی مدد سے نامعلوم چیزوں کے بارے میں سمجھاتے کبھی سوالیہ انداز اختیار کرتے تو کبھی خطیبانہ انداز مثلاً ایک دفعہ ایک صحابی کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ موسم خزاں ہے؟ اس نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ! موسم خزاں کی وجہ سے اس کے پتے جھڑ گئے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح اس درخت کے پتے جھڑتے ہیں مؤمن کے گناہ بھی بالکل اسی طرح سے جھڑیں گے اور اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔

آنحضور ﷺ کے طریق تعلیم کی ہر خصوصیت اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے اللہ تعالیٰ نے تیئس برس تک حضور ﷺ پر قرآن پاک کا نزول کیا۔ قرآن پاک کی آیتیں بھی وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت اس لحاظ سے آتی رہیں کہ عرب قوم کو ان کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی یعنی جو بات نامعلوم ہوتی تھی اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ آنحضور ﷺ کو اپنے فرشتے حضرت جبرائیل کے ذریعے اطلاع فراہم کر دیتے اور متعلقہ مسئلہ کے بارے میں قرآنی آیات نازل ہو جاتیں۔

حضور ﷺ کے طریق تعلیم کی اس خصوصیت پر عمل کرتے ہوئے ہمارے

اساتذہ کو بھی چاہئے کہ وہ بھی معلوم سے نامعلوم کی طرف بڑھیں بچوں سے معلوم کے بارے میں پوچھیں پھر اس کو بنیاد بنا کر نامعلوم مواد کو اخذ کروائیں اس طرح سے بچوں میں دلچسپی کا عنصر بھی جنم لیتا ہے اور اس موضوع کا مواد طلبہ کے ذہنوں میں اچھی طرح سما جاتا ہے۔

## وضاحت وتشریح

تدریس کے عمل میں توضیح وتشریح کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔علم حاصل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے صرف کتابیں پڑھ لینا یا پڑھا دینا علم کا نام نہیں ہے بلکہ علم سے مراد کسی چیز کا صحیح علم حاصل کرنا ہے۔عالم اس فرد کو کہتے ہیں جو چیزوں کے بارے میں جانتا ہو ان کے بارے میں وضاحت کرسکتا ہو توضیح وتشریح کے بغیر علم کا فہم حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضور ﷺ اپنے طلبہ کو جو بھی بات بتاتے اس کی وضاحت کرتے' توضیح اور تشریح فرماتے تاکہ وہ اس طریقے سے ان باتوں کو سمجھ جائیں اگر کسی بات کی سمجھ نہ آتی تو اس کی دوبارہ وضاحت کردیتے۔آپ ﷺ کی پوری زندگی توضیح وتشریح میں صرف ہوئی۔آپ ﷺ کی احادیث مسائل کی واضح تشریح اور حل پیش کرتی ہیں۔

حضور ﷺ اپنی بات کو واضح اور اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرماتے۔

① عملی نمونہ پیش فرماتے' کرکے دکھاتے' یا ہاتھوں کی انگلیوں کے اشاروں سے بتاتے تھے۔

② کبھی کبھی ریت پر نشان بنا کر مدعا واضح فرماتے تھے۔

③ کسی جانی پہچانی چیز سے تشبیہ دے کر بات ذہن نشین کراتے۔

④ مقابلہ کرکے فرق اچھی طرح واضح فرماتے۔

⑤ حسب ضرورت ایک بات کو مکرر بیان فرما کر خوب ذہن نشین کرادیتے۔

معلم کو حضور اکرم ﷺ کے ان طریقوں پر عمل کر کے سبق کی تشریح پیش کرنا چاہئے تاکہ طلبہ نہ سمجھنے کی وجہ سے بوریت محسوس نہ کریں۔ اگر سبق نہ آئے تو دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ بوریت لے لیتی ہے۔ لہٰذا ایک معلم کا احسن طریقہ وہی ہونا چاہئے جو حضور اکرم ﷺ کا ہے۔

## طریقہ ہائے تدریس

درس و تدریس کا آغاز سرچشمۂ علم و عرفان خداوند تعالیٰ کے حضور دعا مانگنے سے ہوتا ہے تاکہ تدریس علم کی جدوجہد میں استاد اور شاگرد دونوں مقصد تعلیم و تدریس کا اعادہ کرلیں وہ ہے خوشنودی رب تعالیٰ۔ اس دعا سے دوران تدریس انتہائی سنجیدگی کی فضا طاری رہتی ہے اور استاد کے طریقۂ تدریس کو درس و تدریس میں اہم مقام حاصل ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ موقع محل کی مناسبت سے جو بہتر طریقہ اختیار کرتے اسی کو اپنا لیتے تھے۔ اگر لیکچر کا طریقہ بہتر ثابت ہوتا تو لیکچر دیتے اور اگر اس میں بوریت ہوتی تو سوال و جواب کا طریقہ اختیار کر لیتے۔ آپ نے جن جن طریقوں کو اپنایا وہ (ہم دوبارہ تحریر کئے دیتے ہیں کہ) مندرجہ ذیل ہیں:

① بات چیت کا طریقہ۔
② اطلاعی یا بیانیہ طریقہ۔
③ سوال و جواب کا طریقہ۔
④ لیکچر یا خطابت کا طریقہ۔

آنحضور ﷺ نے ان طریقہ ہائے تدریس کی مدد سے صحابہ کرام کو تعلیم دی، استاد کو چاہئے کہ وہ آنحضور ﷺ کے ان طریقوں پر عمل کر کے بہترین معلم ہونے کا ثبوت فراہم کرے۔

۵

# اصلاح کا طریقہ کار

## باب: ۵

لوگوں کو دین کی باتیں بتانا اور دین کی تعلیم دینا بہت بڑی نیکی ہے' جس سے نہ صرف تعلیم دینے والے کو فائدہ پہنچتا ہے' بلکہ اس کی خیر و برکت ہر خاص و عام تک پہنچتی ہے۔ پھر یہ عمل انبیاء و رُسل کی وہ میراث ہے جس میں سے تبلیغ و تربیت کا فریضہ انجام دینے والے ہر شخص کو حصہ نصیب ہوا ہے۔

''لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینے والے پر اللہ بھی رحمت نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے' بلکہ آسمان و زمین میں رہنے والی تمام مخلوقات اسے دعائیں دیتی ہیں' حتیٰ کہ بل میں موجود چیونٹی بھی اور مچھلی بھی اس کے لئے دعا کرتی ہے''۔
(سنن الترمذی' کتاب العلم)

تعلیم کے بہت سے طریقے اور مختلف ذرائع ہیں۔ ان میں ''غلطی کی اصلاح'' بھی شامل ہے' اصلاح' تعلیم کا ایک لازمی جزو ہے اور انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

غلطیوں کی اصلاح اُس ''خیر خواہی'' میں شامل ہے جو ہر مسلمان کا فرض ہے اور اس کا ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے فریضہ سے گہرا تعلق ہے' جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

علاوہ ازیں وحی الٰہی میں بھی غلطیوں کی اصلاح پائی جاتی ہے اور یہ قرآنی طریقۂ کار ہے' کیونکہ قرآن مجید میں اوامر ونواہی بھی نازل ہوئے ہیں' اس میں بعض امور کو سابقہ حالت پر برقرار بھی رکھا گیا ہے' بعض امور کی تردید کی گئی ہے اور غلطیوں کی اصلاح بھی کی گئی ہے۔

بعض اوقات کسی صحابی سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے

اس کی وضاحت فرمائی۔قرآن مجید میں اس طرح کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔مثلاً حضرت حاطب بن ابی بلتعہ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی کہ انہوں نے قریش کے نام خط لکھ دیا کہ نبی اکرم ﷺ ان پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۗ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۗ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝﴾ (الممتحنة)

''اے مؤمنو! اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔تم چھپ کر ان سے دوستی (کرنے کی کوشش) کرتے ہو حالانکہ وہ اس دین حق سے منکر ہیں جو تمہارے پاس آیا ہے وہ رسول کو اور تمہیں صرف اس لئے (وطن سے) نکالتے ہیں کہ تم اپنے مالک اللہ پر ایمان لائے ہوئے اور مجھے خوب معلوم ہے جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو کچھ علی الاعلان کرتے ہو۔اور تم میں سے جو شخص یہ کام (کافروں سے دوستی) کرے گا وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا''۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے غلطیوں کی اصلاح اور خاموش نہ رہنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ کے نازل کردہ نور کی روشنی میں برائی کی روک ٹوک اور غلطی کی اصلاح کے اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے اور آپ ﷺ نے اس کام میں کسی قسم کی سستی سے کام نہیں

لیا۔ اسی قسم کے دلائل سے علمائے کرام نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ ''نبی ﷺ کے حق میں بیان اور وضاحت کو ضرورت کے وقت سے مؤخر کرنا جائز نہیں''۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی جن افراد کے درمیان گزری' ان سے سرزد ہونے والی غلطیوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل انتہائی اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ آنحضرت ﷺ کو اللہ کی تائید و نصرت حاصل تھی اور آپ ﷺ کے اقوال و افعال کی تائید یا تصحیح وحی کے ذریعے ہوتی رہتی تھی' اس لئے حضور ﷺ کے اختیار کردہ اسالیب زیادہ محکم اور زیادہ مفید ہیں' ان کے استعمال سے یہ امید زیادہ ہے کہ لوگ اصلاح کرنے والے کی بات مان لیں۔ تربیت کا فریضہ انجام دینے والا کوئی بھی فرد اگر ان طریقوں اور اسالیب پر عمل پیرا ہوا تو اس کا یہ عمل زیادہ صحیح اور بہتر ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے' ان لئے نبوی طریق کار اور اسالیب پر عمل کرنے سے آنحضرت ﷺ کی اقتداء کا شرف بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اخلاص کی موجودگی میں یہ چیز اجر و ثواب کے حصول کا باعث ہے۔

نبویؐ طریق کار کا مطالعہ کرنے سے دنیا میں پائے جانے والے متعدد اسالیب کی ناکامی اور غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر اسلوب تو واضح طور پر غلط ہیں اور ان کی بنیاد غلط نظریات پر رکھی گئی ہے' مثلاً بے قید آزادی کا نظریہ...... یا وہ نسل در نسل منتقل ہونے والے غلط خیالات پر مبنی ہوتے ہیں' مثلاً آباء و اجداد کی اندھی تقلید۔

یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس نبوی منہج کو عملی طور پر اختیار کرتے ہوئے بہت حد تک اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ حالات و واقعات اور نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اسلوب زیادہ مناسب معلوم ہو وہی کام میں لایا جائے اور فقیہانہ نظر رکھنے والا شخص ملتے جلتے حالات و کیفیات پر گہری نظر ڈال کر مناسب اسلوب کا انتخاب کر سکتا ہے۔

# اصلاح سے قبل پیش نظر رکھے جانے والے بعض اُمور

اصل موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ بعض ایسی باتیں بیان کر دی جائیں جن کا دوسروں کی غلطیوں کی اصلاح کرنے سے پہلے اور اصلاح کے دوران خیال رکھنا ضروری ہے:

## ① غلطی کی اصلاح سے مقصود......فقط رضائے الٰہی:

جب کسی کی غلطی کی اصلاح کا ارادہ کیا جائے تو ضروری ہے کہ اس عمل سے مقصود اللہ کی رضا کا حصول ہو' کسی سے برتری کی خواہش نہ ہو' نہ کسی پر اپنا غصہ نکالنے کا جذبہ کارفرما ہو' نہ یہ کوشش ہو کہ عوام کی نظروں میں کوئی مقام حاصل ہو جائے۔

اگر نصیحت کرنے والے کی نیت صحیح ہو تو اسے ثواب بھی ملے گا اور اللہ کے حکم سے بات میں اثر بھی پیدا ہو گا اور سننے والے اس کی بات مانیں گے۔

## ② خطاء فطری ہے؟

ارشادِ نبوی ہے:

**((کل بنی آدم خطاء وخیر الخطائین التوابون))**

(سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة)

''تمام بنی آدم خطا کار ہیں اور بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں''۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے' اسے یاد رکھنے سے ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ تربیت کرنے والے استاد اور واعظ کو افراد سے اعلیٰ ترین مثالی کردار یا معصوم عن الخطا ہونے کی توقع رکھ کر ان پر محاسبہ نہیں کرنا چاہئے' نہ دوبارہ غلطی ہو

جانے پر یا بڑی غلطی سرزد ہو جانے پر ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا درست ہے کہ ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان کے ساتھ حقیقت پر مبنی رویہ رکھنا چاہئے اور یاد رکھنا چاہئے کہ انسان فطری طور پر لاعلمی، غفلت، نقص خواہشِ نفس اور نسیان جیسے عوارض کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اچانک کوئی غلطی سامنے آ جانے کی صورت میں داعی جذبات میں آ کر توازن سے محروم نہیں ہو جائے گا، ورنہ غلطی کرنے والے کی طرف سے نامناسب ردِعمل پیش آ سکتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے مبلغ اور استاد کو یہ بات یاد رہے گی کہ وہ خود بھی ایک انسان ہے، اس سے بھی اسی غلطی کا صدور ممکن ہے جو دوسرے شخص نے کی ہے۔ چنانچہ وہ غلطی کرنے والے کے ساتھ سختی کی نسبت نرمی کا معاملہ اختیار کرنے کو ترجیح دے گا، کیونکہ اصلاح مقصد اصلاح ہے، انتقام یا سزا نہیں۔

لیکن مذکورہ بالا گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ ہم غلطی کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کی طرف سے یہ معذرت کریں کہ وہ نوجوان ہیں یا اُن کا دور گناہوں پر اُبھارنے والے عوامل اور فتنوں سے بھرپور ہے، بلکہ برائی سے روکنا اور محاسبہ کرنا چاہئے، لیکن شریعت کی میزان کے مطابق۔

## ③ شرعی مسائل میں تحقیق:

حضرت محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت جابرؓ نے صرف ایک چادر اوڑھ کر، اسے سر کے پیچھے گرہ لگا کر نماز پڑھی۔ حالانکہ ان کے کپڑے (قریب ہی) تپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا: ''آپ ایک چادر میں نماز پڑھتے ہیں؟'' انہوں نے فرمایا: ''میں نے اس لئے یہ کام کیا ہے تاکہ تجھ جیسا احمق دیکھ لے، نبی اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہم میں سے کس کے پاس دو کپڑے

ہوتے تھے؟''۔ (صحیح بخاری' کتاب الصلوٰۃ)

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''یہاں احمق سے مراد بے علم ہے...... حضرت جابرؓ کا مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے' اگرچہ دو کپڑے پہن کر نماز پڑھنا افضل ہے۔ ان کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ کام جان بوجھ کر بیانِ جواز کے مقصد سے کیا ہے' تاکہ بے علم یا ویسے ہی میری پیروی کرلے' یا مجھے ٹوکے تو میں اسے بتاؤں کہ یہ جائز ہے۔ انہوں نے کلام میں سختی اختیار فرمائی تاکہ علمائے کرام کو ٹوکنے سے منع فرمائیں' اور اس لئے بھی تاکہ لوگ شرعی مسائل میں تحقیق کیا کریں''۔

## ④ بڑی غلطی کی اصلاح کا اہتمام زیادہ ہونا چاہئے:

چنانچہ جن غلطیوں کا تعلق عقیدہ سے ہے' ان کی اصلاح کا اہتمام آداب وغیرہ سے تعلق رکھنے والی غلطیوں کی نسبت زیادہ ہونا چاہئے۔ نبی اکرم ﷺ نے شرک کی ہر قسم سے تعلق رکھنے والی غلطیوں کی چن چن کر اصلاح کی' کیونکہ شرک سب سے خطرناک چیز ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

① حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ جس دن جناب رسول اللہ ﷺ کے فرزند حضرت ابراہیمؑ کی وفات ہوئی' اس دن سورج گرہن تھا' بعض لوگوں نے کہا: یہ تو ابراہیمؑ کی وفات کی وجہ سے بے نور ہو گیا ہے' اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**((ان الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ ' لا ینکسفان لموت احد ولا لحیاتہ' فاذا رایتموھا فادعوا اللہ وصلوا حتی ینجلی))**

''سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں' انہیں کسی کے مرنے

جینے سے گرہن نہیں لگتا تم جب انہیں گہنایا ہوا دیکھو تو گرہن ختم ہونے تک اللہ سے دعا اور نماز میں مشغول رہو''۔(صحیح بخاری' کتاب الکسوف)

② حضرت ابو واقد لیثیؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ جہاد کے لئے حنین تشریف لے جا رہے تھے' راستے میں آپ کا گزر مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے ہوا جو ''ذاتِ انواط'' کے نام سے معروف تھا' وہ لوگ اس پر (برکت حاصل کرنے کے لئے) اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ بعض مسلمانوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! جس طرح ان کا یہ ''ذاتِ انواط'' ہے اسی طرح ہمارے لئے بھی کوئی درخت مقرر فرما دیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

**((سبحان الله' هذا كما قال قوم موسى اجعل لنا الها كما لهم آلهة والذى نفسى بيده لتركبن سنة من كان قبلكم))**

''سبحان اللہ! یہ تو ایسی ہی بات ہے جس طرح موسیٰ کی قوم نے کہا: جس طرح ان لوگوں کے معبود (بت) ہیں ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دیجئے' قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' تم (مسلمان) ضرور اپنے سے پہلوں (غیر مسلموں) کے طریقوں پر چلو گے''۔

(سنن الترمذی' کتاب الفتن)

③ واقد سے مروی ایک اور روایت میں ہے کہ صحابہ کرام جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حنین کی طرف روانہ ہوئے۔ (راستے میں) کافروں کی ایک بیری تھی' وہ اس کے پاس (مجاور بن کر) بیٹھتے اور اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے' اسے ذاتِ انواط کہا جاتا تھا۔ صحابی ارشاد فرماتے ہیں: ہم ایک بڑی ہری بھری بیری کے پاس سے گزرے تو ہم نے کہا: یا رسول اللہ! ہمارے لئے بھی ایک ذاتِ انواط مقرر فرما دیجئے۔ اس پر جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

**((قلتم والذى نفسى بيده كما قال قوم موسى ﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا**

كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ انها لسنن لتركبن سنن من كان قبلكم سنة سنة))

''قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم نے وہی بات کی ہے جیسے موسیٰ کی قوم نے کہا تھا: ''جس طرح ان لوگوں کے معبود ہیں ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دیجئے''۔ موسیٰ ؑ نے فرمایا: تم تو جہالت کی بات کر رہے ہو''۔ یہی تو وہ طور طریقے ہیں، تم گزشتہ اقوام کی ایک ایک رسم اپنا لو گے''۔
(مسند احمد)

④ حضرت زید بن خالد جہنی سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: جناب رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی، رات کو بارش ہوئی تھی، نماز سے فارغ ہو کر آنحضرت ﷺ صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا: اللہ کو اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اس صبح میرا کوئی بندہ مجھ پر ایمان لانے والا بن گیا، کوئی کفر کرنے والا، جس نے تو یہ کہا: ہمیں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ملی ہے، وہ مجھ پر ایمان رکھنے والا ہے اور ستاروں کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اور جس نے کہا: ''فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے، وہ میرے ساتھ کفر کرنے والا اور ستارے پر ایمان رکھنے والا ہے''۔

⑤ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! جو کچھ اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں وہی ہوتا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تو نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا؟ بلکہ وہی ہوتا ہے جو اکیلا اللہ چاہے''۔
(مسند احمد)

⑥ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک قافلہ میں حضرت عمر کو

اپنے باپ کی قسم کھاتے پایا تو جناب رسول اللہ ﷺ نے سب لوگوں کو بلند آواز سے مخاطب کر کے فرمایا:

**((الا ان اللہ ینھاکم ان تحلفوا بآبائکم ' فمن کان حالفا فلیحلف باللہ والا فلیصمت))**

''سنو! اللہ تمہیں اپنے باپوں کی قسمیں کھانے سے منع فرماتا ہے' جسے قسم کھانا ہو وہ اللہ کی قسم کھائے' ورنہ خاموش رہے''۔ (صحیح بخاری' کتاب الاداب)

⑦ حضرت ابو شریح ہانی بن یزیدؓ سے روایت ہے' کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ وہ ایک آدمی کو عبدالحجر (پتھر کا غلام) کہہ کر بلاتے ہیں' حضور ﷺ نے اس سے کہا: ''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے کہا ''عبدالحجر (پتھر کا بندہ)''۔ فرمایا: ''نہیں' تو عبداللہ (اللہ کا بندہ) ہے''۔ (الاذاب المفرد)

## ⑤ مقام و مرتبہ کا لحاظ رکھنا:

بعض اوقات ایک شخص کی ایسی سختی برداشت کر لی جاتی ہے جو دوسروں کی طرف سے ہو تو برداشت نہیں کی جاتی' کیونکہ اس کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کو نہیں ہوتا' یا اس کو وہ اختیار حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً باپ کو بیٹے پر' استاد کو شاگرد پر' محتسب کو عام آدمی پر وہ اختیار حاصل ہے جو دوسروں کو نہیں ہے۔ اپنے سے بڑی عمر والے سے اس انداز سے بات نہیں کی جاتی جس طرح ہم عمر سے یا چھوٹے سے کی جاتی ہے۔ رشتہ دار اور اجنبی برابر نہیں۔ صاحب اختیار کی حالت وہ نہیں' ہے جو اختیار نہ رکھنے والے کی ہے۔ اس فرق کو پیش نظر رکھ کر اصلاح کرنے والا ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھ سکتا ہے اور معاملات کو صحیح طور پر پرکھ سکتا ہے' تاکہ غلطی سے منع کرنے یا اصلاح کرنے کی کوشش میں اس سے بڑی غلطی پیدا نہ ہو جائے۔ تنبیہ کس درجہ کی ہو اور اس میں سختی یا نرمی کا کیا معیار رکھا جائے' اس کا

دارومدار اس بات پر ہے کہ غلطی کتنی بڑی ہے اور غلطی کرنے والے کے دل میں منع کرنے والے کا کیا مقام اور کس درجہ کا رعب ودبدبہ ہے؟

مذکورہ بالا تفصیل سے دو امور مستنبط ہوتے ہیں:

(اول): جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کوئی مقام ومرتبہ اور اقتدار واختیار عطا فرمایا ہے اُس کا فرض ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور لوگوں کی تربیت کا کام انجام دے اور اس بات کا احساس کرے کہ اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے' اور لوگ دوسروں کی نسبت اس کی بات زیادہ مان سکتے ہیں' اور وہ جو کچھ کر سکتا ہے دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔

(دوم): امر ونہی کا فریضہ انجام دینے والے کو چاہئے کہ اپنے مقام کا غلط اندازہ نہ لگائے' اور خود کو اپنے حقیقی مقام سے بلند تر مقام پر رکھ کر اس انداز سے کام نہ کرے جو اس کے لئے مناسب نہیں' کیونکہ اس طرح لوگ اس سے دور ہٹیں گے اور اصل مقصد کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جس عظیم مقام سے سرفراز فرمایا تھا اور عام لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ کی جو ہیبت عطا فرمائی تھی' آنحضرت ﷺ تنبیہ اور تربیت میں اس سے فائدہ اٹھاتے تھے اور بعض اوقات آپ ﷺ کا طرز عمل ایسا ہوتا تھا کہ اگر کوئی اور شخص وہ انداز اختیار کرے تو اس سے صحیح فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے:

حضرت یعیش بن طهفہ غفاری نے اپنے والد طهفہ سے روایت کیا' انہوں نے فرمایا: جو نادار حضرات نبی اکرم ﷺ کے مہمان ہوا کرتے تھے (ایک بار) ان میں (شامل ہو کر) میں بھی آنحضرت ﷺ کے ہاں مہمان ہوا' آنحضرت ﷺ رات کو اپنے مہمانوں کی دیکھ بھال کی غرض سے تشریف لائے تو مجھے پیٹ کے بل لیٹے دیکھا' آنحضرت ﷺ نے مجھے قدم مبارک سے ٹھوکا دیا اور فرمایا: ''اس انداز سے نہ لیٹو' اللہ

تعالیٰ اس انداز سے لیٹنے کو ناپسند فرماتے ہیں''۔ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ قدم مبارک سے ٹھوکا دے کر جگایا اور فرمایا:''یہ اہل جہنم کا لیٹنے کا انداز ہے''۔

(سنن الترمذی' کتاب الادب)

نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبہ کے پیش نظر آنحضرت ﷺ کے لئے تو اس انداز سے تنبیہ کرنا بالکل مناسب تھا' لیکن عام آدمی کے لئے اسے اختیار کرنا قطعاً مناسب نہیں۔یعنی اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو پیٹ کے بل سوئے ہوئے دیکھتا ہے تو یہ درست نہیں کہ اسے پاؤں کی ٹھوکر مار کر جگا دے' اور پھر یہ امید رکھے کہ وہ اس کی بات مان لے گا اور شکریہ بھی ادا کرے گا''۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے خاص صحابہ کرامؓ کو کسی اعرابی یا اجنبی کی نسبت زیادہ سختی سے تنبیہ فرماتے تھے اور یہ سب کچھ حکمت میں شامل ہے اور تنبیہ کرتے وقت حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی مثال ہے۔

## ⑥ لاعلم اور جانتے بوجھتے غلطی کرنے والے میں فرق رکھنا:

اس کی ایک واضح مثال حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ کا واقعہ ہے۔وہ صحرائی زندگی گزارنے والے آدمی تھے' جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ نماز کے دوران بات چیت کرنا حرام ہے وہ فرماتے ہیں:

''میں جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک نمازی کو چھینک آ گئی۔میں نے (نماز کے دوران ہی) کہہ دیا:''یرحمك الله'' صحابہ کرام نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے کہا: ہائے میں مر جاؤں! تم لوگ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ انہوں نے اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر مجھے خاموش کرانا چاہا' میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کرانا چاہتے ہیں تو (میرا جی چاہا کہ انہیں جواب دوں) لیکن (اپنے آپ پر ضبط کر کے) میں خاموش ہو گیا' جب رسول اللہ ﷺ نے نماز مکمل کر لی تو...... میرے باپ آپ پر قربان' میں نے کوئی معلم آنحضرت ﷺ سے بہتر

انداز میں تعلیم دینے والا نہیں دیکھا...... اللہ کی قسم، حضور ﷺ نے نہ مجھے جھڑکا! نہ مارا، نہ برا بھلا کہا، بس یہ فرمایا:

((ان ھذہ الصلاۃ لا یصلح فیھا شیء من کلام الناس، انما ھو التسبیح والتکبیر وقراء ۃ القرآن))

''اس نماز میں لوگوں والی باتیں کرنا درست نہیں، اس میں تو تسبیح و تکبیر اور تلاوت ہوتی ہے''۔ (صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ)

یعنی جاہل کو تعلیم دینے کی ضرورت ہوتی ہے، جسے کوئی شبہ یا غلط فہمی ہوا سے مسئلہ کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے، غافل کو یاد دہانی چاہئے اور غلطی پر اصرار کرنے والے کو نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا یہ کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا کہ مسئلہ سے واقف اور ناواقف سے تنبیہ کی جائے، بلکہ جاہل پر سختی کرنے سے عام طور پر اس کے دل میں نفرت اور انکار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، لیکن اگر پہلے حکمت کے ساتھ نرمی سے سمجھایا جائے تو ایسا نہیں ہوتا۔ مسئلہ سے ناواقف شخص اپنے آپ کو غلطی پر تصور نہیں کر رہا ہوتا، لہٰذا جب اس پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے: بھائی! مجھ پر حملہ کرنے سے پہلے آپ نے مجھے مسئلہ تو بتایا ہوتا۔

بعض اوقات غلطی کرنے والا غیر شعوری طور پر درست راہ سے ہٹ گیا ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات وہ خود کو صحیح راستے پر تصور کر رہا ہوتا ہے، لہٰذا اس چیز کا لحاظ رکھا جانا چاہئے۔ مسند احمد میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے کھانا تناول فرمایا، پھر نماز کی اقامت ہوئی تو آنحضرت ﷺ نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، آپؐ نے اس سے پہلے وضو کیا ہوا تھا، لیکن مَیں (دوبارہ) وضو کے لئے پانی لے آیا۔ حضور ﷺ نے مجھے جھڑک دیا۔ فرمایا: ''پیچھے رہو'' مجھے اس سے بہت تکلیف ہوئی۔ نماز کے بعد میں نے حضرت عمرؓ کو یہ بات بتائی۔ انہوں نے عرض

کیا: اے اللہ کے نبی! مغیرہؓ آپ کی سرزنش کی وجہ سے بہت دلگیر ہیں وہ ڈرتے ہیں کہ آپ کے دل میں ان سے ناراضگی تو نہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میرے دل میں تو اس کے لئے اچھے جذبات ہی ہیں' لیکن وہ میرے پاس وضو کے لئے پانی لے آیا تھا' حالانکہ میں نے صرف کھانا کھایا تھا' اگر میں وضو کرتا تو میری اتباع میں سب لوگ (کھانا کھا کر) وضو کیا کرتے (جس سے امت کے لئے مشقت ہوتی)''۔

(مسند احمد)

یہاں یہ امر ملحوظ رہنا چاہئے کہ یہ صحابہ کرام اُس عظیم مقام پر فائز تھے کہ آنحضرت ﷺ کے انہیں غلطی پر متنبہ کرنے سے ان کے دلوں میں کوئی ناپسندیدگی یا ذہنی بُعد جیسے منفی اثرات پیدا ہونے کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا ان پر مثبت اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ اگر آنحضرت ﷺ ان میں سے کسی سے عدم التفات کا اظہار فرماتے تھے تو وہ اپنے آپ کو قصوروار تصور کرتا اور ذرا ڈرا سہارہتا تھا' وہ اُس وقت تک پریشان رہتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا کہ آنحضرت ﷺ کی ناراضگی دور ہو چکی ہے۔

اس واقعہ میں یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب مغیرہؓ پر عتاب فرمایا تو اس کی وجہ حضرت مغیرہؓ کی شخصیت سے ناراضگی نہیں' بلکہ آنحضرت ﷺ کی عام مسلمانوں پر شفقت اور مسئلہ کی وضاحت تھی' تاکہ وہ غیر واجب کو واجب سمجھ کر مشکل میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

شاگرد اور پیروکار کے دل میں استاد اور قائد کا مقام بہت بلند ہوتا ہے' لہٰذا جب وہ کسی شاگرد یا پیروکار کو تنبیہ کرتا ہے یا اس کے کسی کام کو غلط قرار دیتا ہے تو اس کے دل میں اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات تربیت کا فریضہ انجام دینے والا شخص عام لوگوں کے فائدہ کے پیش نظر اپنے کسی ساتھی کو تنبیہ کرتا ہے اور مقصود دوسرے لوگوں سے متعلق کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے دل

میں منفی اثر باقی رہنے دیا جائے بلکہ دوسرے طریقوں سے اس کا تدارک ہونا چاہئے تا کہ وہ اثر ختم ہو جائے۔ مثلاً پیروکار کسی مناسب طریقے سے اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے اگرچہ کسی کے واسطہ سے ہی ہو۔ حضرت مغیرہؓ نے حضرت عمرؓ کے ذریعہ اپنے جذبات آنحضرت ﷺ تک پہنچائے۔ اس کے جواب میں قائد کی طرف سے موقف کی وضاحت کر کے یہ واضح کیا جانا چاہئے کہ وہ اس سے حسن ظن رکھتا ہے اور اس کے دل میں اس کا ایک مقام ہے۔

## ⑦ اجتہاد کی بناء پر اور جان بوجھ کر ہونے والی غلطی میں فرق:

پہلی قسم کی غلطی کا مرتکب تو یقیناً ملامت کا مستحق نہیں' بلکہ وہ اپنے اخلاص واجتہاد کی بنا پر ثواب پائے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اذا حكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران' واذا حكم فاخطأ فله اجر واحد)) (سنن الترمذی' کتاب الاحکام)

''فیصلہ کرنے والا جب فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد صحیح ہو جائے تو اسے دوگنا ثواب ملے گا اور اگر اس سے فیصلہ میں غلطی ہو گئی تو اسے اکہرا ثواب ملے گا''۔

اس کے برعکس جو شخص جان بوجھ کر غلطی کرے یا غلطی میں خود اس کی کوتاہی کا دخل ہو تو اس کا یہ حکم نہیں۔ پہلے آدمی سے خیر خواہی کا سلوک کرتے ہوئے اسے صحیح مسئلہ بتایا جائے گا' دوسرے کو وعظ و نصیحت کر کے غلطی سے روکا جائے گا۔

وہ اجتہاد جس میں غلطی کرنے والے کو معذور قرار دیا جا سکتا ہے' اس کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد کرنے والا اس کا اہل ہو اور اس پر عمل ہو سکتا ہو۔ اس کے برعکس جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دیتا ہے یا لوگوں کے حالات کی رعایت نہیں کرتا' اس کا اجتہاد درست نہیں۔ اسی لئے زخمی شخص کو غسل کا فتویٰ دینے والے صحابہ کرام کو آنحضرت ﷺ نے سختی سے تنبیہ فرمائی تھی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

''ہم لوگ سفر میں تھے' ہم میں سے ایک صاحب کو پتھر لگا جس سے ان کے سر میں زخم آ گیا۔ اس کے بعد انہیں نیند میں نہانے کی حاجت ہوگئی' انہوں نے اپنے ہم سفر صحابہ کرام سے مسئلہ پوچھا اور کہا: کیا آپ کے علم کے مطابق میرے لئے تیمّم کرنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے خیال میں تو آپ کو یہ اجازت حاصل نہیں' کیونکہ پانی موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے غسل کیا جس کے نتیجے میں وہ فوت ہو گئے۔ جب ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو یہ واقعہ بھی عرض کیا گیا' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **((قتلوہ قتلھم اللّٰہ' الا سالوا اذ لم یعلموا؟ فانما شفاء العی السؤال))**
''انہوں نے اسے قتل کر دیا' اللہ انہیں قتل کرے' اگر انہیں معلوم نہیں تھا تو انہوں نے (کسی صاحبِ علم سے) پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیونکہ لاعلمی کا علاج سوال کرنا ہے''۔
(سنن ابی داوٗد' کتاب الطہارۃ)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے:

**((القضاۃ ثلاثۃ' واحد فی الجنۃ واثنان فی النار' فاما الذی فی الجنۃ فرجل عرف الحق فقضی بہٖ' ورجل عرف الحق فجار فی الحکم فھو فی النار ورجل قضی للناس علی جھل فھو فی النار))** (سنن ابی داوٗد' کتاب الاقضیۃ)

''فیصلہ کرنے والے تین طرح کے ہیں' ان میں سے ایک جنتی ہے اور دو جہنمی ہیں' جنت میں تو وہ جائے گا جس نے حق کو سمجھ کر اس کے مطابق فیصلہ کیا' البتہ جس نے حق کو سمجھ لیا' پھر غلط فیصلہ کیا' وہ جہنم میں جائے گا۔ اسی طرح جس نے حق کو سمجھے بغیر بے علمی کے باوجود فیصلہ کر دیا وہ بھی جہنم میں جائے گا''۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے اس تیسری قسم کے آدمی کو معذور قرار نہیں دیا۔

تنبیہ میں شدت کا درجہ متعین کرنے میں جن امور کا دخل ہے' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس ماحول کو مدنظر رکھا جائے جس میں غلطی کا صدور ہوا ہے۔ مثلاً اس

ماحول میں اکثر لوگ سنت پر عمل کرنے والے ہیں یا بدعت کا رواج ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس ماحول میں وہ غلطی کتنی عام ہے' یا اس کے جواز کا فتویٰ دینے والا کوئی نام نہاد یا متساہل عالم تو موجود نہیں جس کے علم پر اس غلطی کا ارتکاب کرنے والا اعتماد کرتا ہو۔

## ⑧ خیر خواہی' تنبیہ کرنے سے رکاوٹ نہیں بن سکتی:

حضرت عمرو بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے والد سے سنا' وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ہم لوگ صبح کی نماز سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود کی ڈیوڑھی پر (انتظار میں) بیٹھ جایا کرتے تھے' جب وہ گھر سے باہر تشریف لاتے تو ہم ان کے ساتھ مسجد میں جاتے۔ (ایک دن) ہمارے پاس حضرت ابوموسیٰ اشعری تشریف لائے اور فرمایا: کیا ابھی تک ابوعبدالرحمٰن (ابن مسعود) باہر نہیں آئے؟ ہم نے کہا: جی نہیں' وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے حتیٰ کہ وہ باہر تشریف لے آئے' جب وہ آئے تو ہم سب اکٹھے ہی اُٹھ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ ابوموسیٰ نے کہا: ابوعبدالرحمٰن! میں نے ابھی ابھی مسجد میں ایک کام دیکھا ہے جو مجھے عجیب سا محسوس ہوا ہے' ویسے الحمدللہ میں نے اچھی چیز ہی دیکھی ہے۔ ابن مسعود نے کہا: وہ کام کیا ہے؟ انہوں نے کہا: زندگی رہی تو عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے' پھر فرمایا: میں نے مسجد میں کچھ لوگ نماز کے انتظار میں حلقے بنا کر بیٹھے دیکھے ہیں' ان کے سامنے کنکریاں پڑی ہیں' ہر حلقہ میں ایک آدمی ہے' وہ کہتا ہے: سو بار اللّٰہ اکبر پڑھو' وہ سو بار اللّٰہ اکبر کہتے ہیں۔ پھر کہتا ہے: سو بار لا الٰہ الا اللّٰہ کہو' وہ سو بار لا الٰہ الا اللّٰہ کہتے ہیں۔ پھر کہتا ہے: سو بار سبحان اللّٰہ کہو' وہ سو بار سبحان اللّٰہ کہتے ہیں (اسی طرح ذکر میں مشغول ہیں)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: پھر آپ نے انہیں کیا کہا؟ انہوں نے کہا: میں نے کچھ نہیں کہا' بلکہ آپ کی رائے اور حکم کا انتظار کیا۔ انہوں نے فرمایا: آپ نے انہیں یہ حکم کیوں

نہیں دیا کہ وہ اپنے گناہ شمار کریں اور انہیں یہ ضمانت کیوں نہ دی کہ ان کی کوئی نیکی ضائع نہیں ہوگی؟

اس کے بعد وہ (مسجد کی طرف) چل پڑے۔ ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلے' حتیٰ کہ آپ ان حلقوں میں سے ایک حلقے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور فرمایا: میں تمہیں یہ کیا کرتے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! یہ کنکریاں ہیں' ہم ان کے ساتھ گن کر تکبیر' تہلیل اور تسبیح کرتے ہیں۔ ابن مسعود نے فرمایا: ''اپنے گناہ شمار کرو' میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہاری کوئی نیکی ضائع نہیں ہوگی۔ اے محمد ﷺ کی امت! تم پر افسوس ہے' کتنی جلدی تم ہلاکت کے راستے پر چل پڑے ہو' ابھی تو تمہارے نبی ﷺ کے صحابہ بکثرت موجود ہیں' ابھی تو آنحضرت ﷺ کے کپڑے بھی نہیں پھٹے' ابھی تو آنحضرت ﷺ کے برتن بھی نہیں ٹوٹے' قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یا تو تم محمد ﷺ کے راستے سے بھی زیادہ ہدایت والے راستے پر ہو' یا گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو''۔ انہوں نے کہا: ابوعبدالرحمٰن! اللہ کی قسم! ہمارا ارادہ تو صرف نیکی کا ہے۔ فرمایا: ''بہت سے لوگ نیکی کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن انہیں نیکی تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ کچھ لوگ ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نہیں آگے جائے گا (دل پر قرآن کا کوئی اثر نہیں ہوگا) اللہ کی قسم! معلوم نہیں شاید ان میں سے اکثر تم لوگ ہی ہو'' یہ کہہ کر ان کے پاس سے چلے آئے۔ حضرت عمرو بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہم نے جنگ نہروان میں دیکھا کہ ذکر کے وہ حلقے قائم کرنے والوں میں سے اکثر افراد خارجیوں کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف لڑ رہے تھے''۔

(سنن الدارمی)

## ⑨ تنبیہ کرنے میں انصاف اور غیر جانبداری کا خیال رکھنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا﴾ (الانعام) ''جب تم بات

کرو تو انصاف کرو''۔ اور فرمایا: ﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (النساء) ''جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو''۔

حضرت اسامہ بن زید وہ شخصیت ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کو بہت محبت تھی اور ان کے والد سے بھی بہت محبت تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرنے کی کوشش کی تو جناب رسول اللہ ﷺ نے انہیں سختی سے تنبیہ فرمائی۔ چنانچہ حضرت عائشہ نے بیان فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں فتح مکہ کے ایام میں جس عورت نے چوری کی تھی' اس کے بارے میں خاندانِ قریش کے افراد کو بہت فکر ہوئی (کہ اب اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا)۔ انہوں نے کہا: اس کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کون عرض کرے گا؟ تب انہوں نے کہا: یہ جرأت تو صرف اسامہ بن زید ہی کر سکتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو بہت پیارے ہیں۔ جب اس خاتون کو آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو حضرت اسامہ بن زیدؓ نے اس کے بارے میں عرض کیا۔ اس پر جناب رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ (غصے کی وجہ سے) متغیر ہو گیا اور فرمایا: ''کیا تو اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں شفاعت کرتا ہے؟'' اسامہ نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے) عرض کیا: یارسول اللہ! میرے لئے اللہ سے مغفرت کی دعا فرمایئے۔

شام کو جناب رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا' پہلے اللہ کی شایانِ شان تعریف فرمائی: پھر ارشاد فرمایا:

((اما بعد فانما اهلك الذين من قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه واذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد' واني والذى نفسى بيده لو ان فاطمة بنت محمد

**سرقت لقطعت یدھا))**

''اللہ کی حمد وثنا کے بعد واضح ہو کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ ان میں جب کوئی اونچا آدمی چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے' اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کر لیتا تھا تو اس پر حد نافذ کر دیتے تھے۔ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا''۔

پھر آپ ﷺ نے اس چوری کرنے والی عورت کے بارے میں حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ (صحیح البخاری' کتاب الانبیاء)

حضرت اسامہؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے رویہ سے آپؐ کا عدل وانصاف ظاہر ہوتا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نظر میں شریعت انسانوں کی محبت سے بالاتر مقام کی حامل تھی اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان اس شخص کو تو معاف کر سکتا ہے جس کی غلطی کا تعلق اس کی ذات سے ہو' لیکن جس کی غلطی کا تعلق شریعت کے احکام سے ہو' اسے نہ معاف کر سکتا ہے نہ اس سے نرمی کر سکتا ہے۔

## ⑩ غلطی کی اصلاح کے نتیجہ میں بڑی غلطی وجود میں نہ آجائے:

شریعت کا یہ قاعدہ معروف ہے کہ بڑی برائی کو دور کرنے کے لئے چھوٹی برائی کو برداشت کرنا پڑتا ہے' اس لئے اصلاح کرنے والے کو بعض اوقات ایک غلطی پر خاموشی اختیار کرنا پڑتی ہے تاکہ اس سے بڑی غلطی کا ارتکاب نہ ہو جائے۔

نبی اکرم ﷺ کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ منافق کفر پر قائم ہیں' اس کے باوجود آپ ﷺ خاموش رہے اور ان کی طرف سے دی جانے والی تکلیفوں پر صبر کرتے رہے' تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ محمد ﷺ اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں اور خاص طور پر اس لئے بھی حضور ﷺ خاموش رہے کہ عام لوگ ان منافقین کی حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے کعبہ شریف کو ابراہیم کی مقرر کردہ

بنیادوں پر تعمیر کرنے کے لئے اسے گرانے سے صرف اس لئے اجتناب کیا کہ قریش کے اکثر لوگ حال ہی میں اسلام میں داخل ہوئے تھے اور آنحضرت ﷺ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ان کی سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئے گی' اس لئے عمارت کو اسی طرح رہنے دیا' حالانکہ وہ اصل ابراہیمی تعمیر سے رقبہ میں کم تھی' اس کا دروازہ بھی اونچا بنا دیا گیا تھا اور عام لوگ کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سب امور ایسے تھے جیسے نہیں ہونے چاہئیں تھے' اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے باطل معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع فرما دیا تھا حالانکہ یہ ایک نیک کام ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں مشرکین اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کر سکتے تھے' جو سب سے بڑی برائی ہے۔

بعض اوقات داعی ایک برائی کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے' یا اس پر تنقید کو وقتی طور پر مؤخر کر دیتا ہے' یا اس سے منع کرنے کا طریق کار تبدیل کر دیتا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ایک بڑی غلطی یا گناہ کا سدِ باب ہو سکتا ہے' اس اقدام کو کوتاہی یا پسپائی کا نام نہیں دیا جا سکتا' بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو اور اس کے دل میں کسی کی ملامت کا خوف نہ ہو اور وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ دین کی مصلحت کے لئے اس سے رکا ہو۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک غلطی سے منع کرتے ہوئے اس سے بڑی غلطی کے ارتکاب کی ایک وجہ ایسا جوش بھی ہے جس کے ساتھ حکمت کو مدنظر نہ رکھا گیا ہو۔

## ⑪ غلطی کرنے والے کی فطری کمزوری کا احساس:

بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو مکمل طور پر ختم کرنا ممکن نہیں ہوتا' کیونکہ ان کا تعلق کسی فطری معاملہ سے ہوتا ہے' البتہ ان غلطیوں کو کم یا ہلکا کیا جا سکتا ہے' کیونکہ زیادہ باریک بینی کے نتیجے میں کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔

## ⑭ دین کی مخالفت اور کسی کی ذات پر حملہ میں فرق:

چونکہ ہماری نظر میں ہمارے دین کی قدر و قیمت ہماری ذات اور شخصیت کی قیمت سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم دین کی حمایت و دفاع میں اپنی شخصیت کے دفاع کی نسبت زیادہ غیرت کا مظاہرہ کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک شخص کو گالی دی جاتی ہے تو اسے غصہ آتا ہے لیکن جب دین کی توہین یا مخالفت کی جاتی ہے تو اسے یا تو غصہ آتا ہی نہیں، یا وہ جواب دیتا بھی ہے تو بڑے کمزور لہجے میں شرماتے اور جھجکتے ہوئے بات کرتا ہے یہی دینی غیرت کی کمزوری کی دلیل ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپؐ اپنی ذاتِ اقدس سے متعلق دوسروں کی غلطیوں سے اکثر چشم پوشی فرماتے تھے، خصوصاً جاہل بدوؤں کی تالیفِ قلب کے لئے ان کی نامناسب حرکتیں معاف فرما دیتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلا جا رہا تھا، آنحضرت ﷺ نے موٹے کنارے والی نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ایک بدو پیچھے سے آیا اور آپؐ کی چادر مبارک پکڑ کر اسے زور سے کھینچا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی گردن مبارک پر چادر کے کنارہ کی رگڑ سے نشان پڑ گیا، پھر وہ بولا: یا محمد! آپؐ کے پاس اللہ کا جو مال ہے اس میں سے مجھے بھی دلوائیے، جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور ہنس دیئے، پھر اسے کچھ مال دلوا دیا''۔ (صحیح البخاری، کتاب اللباس)

البتہ اگر غلطی کا تعلق دین سے ہوتا تو نبی اکرم ﷺ اللہ کی خاطر غضب ظاہر فرماتے تھے۔ اس کی مثالیں آگے آئیں گی۔

## پیش نظر رکھے جانے والے بعض دیگر امور:

غلطیوں کے بارے میں ہمارے رویہ میں کچھ اور چیزوں کا خیال رکھنا بھی

ضروری ہے۔ مثلاً:

☆ بڑی غلطی اور چھوٹی غلطی میں امتیاز کریں۔ خود شریعت نے بھی کبیرہ گناہوں اور صغیرہ گناہوں کو ایک درجہ میں نہیں رکھا۔

☆ گناہ کے عادی شخص اور شاندار ماضی والے ایسے انسان کے درمیان فرق ہوتا ہے جس کی غلطی اس کی عظیم نیکیوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ماضی میں کارنامے انجام دینے والے شخص کی ایسی بات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے جو اگر کوئی اور کرے تو نظر انداز نہیں کی جاتی' اس کی وضاحت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس واقعہ سے ہو سکتی ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم لوگ جناب رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جب ہم مقام ''عرج'' پر پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے پڑاؤ ڈالا' ہم بھی سواریوں سے اتر آئے۔ حضرت عائشہ جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں اپنے والد محترم کے پاس بیٹھ گئی۔ جناب رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق دونوں کا سامان ایک ہی اونٹ پر تھا' جو حضرت ابو بکر کے ایک غلام کی ذمہ داری میں تھا' حضرت ابو بکر بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ (کچھ دیر بعد) غلام آ پہنچا لیکن اونٹ اس کے ساتھ نہیں تھا' ابو بکرؓ نے فرمایا: ''تمہارا اونٹ کہاں ہے؟'' اس نے کہا: ''وہ تو رات کو گم ہو گیا''۔ ابو بکر نے غلام سے فرمایا: ''ایک اونٹ بھی تجھ سے گم ہو گیا؟'' اور اسے مارنے لگے' رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا: ''ان احرام والے (حاجی صاحب) کو دیکھو' کیا کر رہے ہیں؟'' ابن ابی رزمہ نے فرمایا: ''جناب رسول اللہ ﷺ صرف یہی بات فرماتے رہے: ''دیکھو یہ حاجی صاحب کیا کر رہے ہیں'' اور مسکراتے رہے۔

☆ بار بار غلطی کرنے والے اور پہلی بار غلطی کرنے والے میں فرق ملحوظ رکھا جائے۔

☆ یکے بعد دیگرے غلطی کا ارتکاب کرنے والے میں اور طویل عرصے بعد دوبارہ غلطی کرنے والے میں فرق کا خیال کیا جائے۔

☆ سرعام غلطی کرنے والے اور چھپ کر ہی غلطی کرنے والے میں فرق مدنظر رکھا جائے۔

☆ جس شخص کا ایمان کمزور ہو اور اس کی تالیف قلب کی ضرورت ہو اس پر سختی نہ کی جائے۔

☆ غلطی کرنے والے کے مقام و مرتبہ کو پیش نظر رکھا جائے۔

☆ غلطی کے اثرات مٹانے کی کوشش کرنے کی بجائے اصل غلطی اور اس کے سبب کو دور کیا جائے۔

☆ غلطی کو مبالغہ کے ساتھ بڑھا چڑھا کر پیش نہ کریں۔

☆ غلطی کو ثابت کرنے میں تکلف سے کام نہ لیں اور یہ کوشش نہ کریں کہ غلطی کرنے والا اپنی زبان سے اپنی غلطی تسلیم کرے۔

☆ غلطی کی اصلاح کے لئے مناسب حد تک وقت دیں۔ خاص طور پر ایسے شخص کو اصلاح کا کافی موقع دیں جو طویل عرصہ تک اس غلطی کا عادی رہا ہے۔ ساتھ ہی اسے وقتاً فوقتاً تنبیہ کرتے رہیں اور دیکھیں کہ کس حد تک اصلاح ہو رہی ہے۔

☆ غلطی کرنے والے کو یہ احساس نہ پیدا ہونے دیں کہ آپ اسے اپنا مخالف سمجھتے ہیں، یہ امر پیش نظر رکھیں کہ اپنے موقف کی تائید حاصل کر لینے سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ایک شخص آپ کا ساتھی بن جائے۔

# نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ مختلف اسلوب

## ① غلطی کی فوری اصلاح:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہ فرمانے میں جلدی کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ آپؐ کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ جب وضاحت کی ضرورت ہو آپؐ اُس وقت بیان کرنے کے بجائے اسے ملتوی کر دیں۔ آپؐ اس بات کے مکلف تھے کہ لوگوں کو حق بتائیں، نیکی کی طرف رہنمائی فرمائیں اور برائی سے روکیں۔ لوگوں کی غلطیوں کی فوری اصلاح کی مثال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیش آنے والے متعدد واقعات ذکر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اس صحابی کا واقعہ جنہوں نے نماز اچھی طرح نہیں پڑھی تھی، بنو مخزوم کی خاتون کا واقعہ، ابن لتبیہ کا واقعہ، حضرت اسامہ کا واقعہ اور اُن تین حضرات کا واقعہ جنہوں نے عبادت میں جائز حد سے بڑھ کر شدت سے کام لینے کا ارادہ کیا تھا۔ ان واقعات کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی ان شاء اللہ۔

غلطی پر تنبیہ کرنے میں تاخیر کی صورت میں بعض اوقات اصلاح کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بعض اوقات موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے، یا بعد میں بات کرنے کی کوئی مناسبت نہیں بنتی، یا ذہنوں میں واقعہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے تاثیر میں فرق آ جاتا ہے۔

## ② ازالہ کے لئے شرعی حکم بیان کرنا:

حضرت جرہد سے روایت ہے کہ ان کے پاس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے، اس وقت ان کی ران سے کپڑا ہٹا ہوا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((قط فخذك ، فانها من العورة)) ''اپنی ران ڈھانک لو، یہ پردے کے اعضاء

میں شامل ہے''۔ (سنن الترمذی' کتاب الادب)

## ③ اس شرعی اصول کی طرف توجہ دلانا جس کی مخالفت ہوئی ہو:

بعض اوقات پیش آمدہ حالات میں شرعی اصول ذہن سے اتر جاتا ہے' لہٰذا اس اصول و قاعدہ کے اعلان و اظہار سے غلطی کرنے والا راہ راست پر واپس آتا ہے اور غفلت کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار منافقوں نے مہاجر اور انصاری صحابہ کرامؓ کے درمیان فتنہ کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی' جس کی وجہ سے ایک خطرناک حادثہ پیش آتے آتے رہ گیا' اس موقع پر جناب رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل زیر بحث نکتہ کی ایک بہترین مثال ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ایک غزوہ میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے' آپ ؐ کے ساتھ کافی تعداد میں مہاجرین بھی روانہ ہوئے تھے' مہاجرین میں ایک صاحب مزاحیہ طبیعت کے حامل تھے' انہوں نے (ہنسی ہنسی میں) ایک انصاری صحابی کو پاؤں سے ٹھوکر ماردی' انصاری صحابی کو شدید غصہ آیا حتیٰ کہ انہوں نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ انصاری نے کہا: اے انصاریو! اس پر مہاجر نے کہا: اے مہاجرو! نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''یہ جاہلیت والوں کی سی پکار کیوں؟'' پھر فرمایا: ''بات کیا ہوئی؟'' آنحضرت ﷺ کو مہاجر کے انصاری کو ٹھوکر مارنے کی بات بتائی گئی' نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **((دعوها فانها من الخبيثة))** ''یہ بات ترک کر دو' یہ ناپاک ہے''۔

(صحیح بخاری' کتاب المناقب)

## ④ غلطی کا سبب بننے والی غلط فہمی کی اصلاح:

صحیح بخاری میں حضرت حمید بن ابی حمید طویل رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ سے یہ حدیث سنی' انہوں نے فرمایا: تین آدمی

امہاتؓ المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے (پردے کے پیچھے سے) نبی اکرم ﷺ کی (نفل) عبادت کے متعلق سوال کیا' جب انہیں بتایا گیا (کہ رسول اللہ ﷺ اس انداز سے عبادت کرتے ہیں) تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ عبادت تھوڑی ہے' تاہم انہوں نے کہا: ہماری آنحضرت ﷺ سے کیا نسبت؟ ان کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں (وہ تو اگر زیادہ عبادت نہ بھی کریں تو کوئی بات نہیں' ہمیں تو بہت زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے) ان میں سے ایک بولا: میں ہمیشہ رات بھر نماز (تہجد) پڑھا کروں گا' دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا' کسی دن ناغہ نہیں کروں گا' تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا' کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان باتوں کا علم ہوا تو) آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:

**((انتم الذین قلتم کذا و کذا؟ اما واللہ انی لا خشاکم للہ واتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج))**

''تم لوگوں نے یہ یہ باتیں کی ہیں؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ خوفِ خدا اور تقویٰ رکھتا ہوں' لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں' (رات کو) نماز (تہجد) بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' اور میں نے نکاح بھی کیے ہوئے ہیں''۔ (صحیح بخاری' کتاب النکاح)

صحیح مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے کہ چند افراد نے امہات المؤمنین سے آنحضرت ﷺ کے وہ اعمال دریافت کیے جو آپ ﷺ گھر میں انجام دیتے تھے۔ (بعد میں) ایک نے کہا: میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا' ایک نے کہا: میں گوشت نہیں کھاؤں گا' ایک نے کہا: میں بستر پر نہیں سوؤں گا (جب نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوا) تو آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

**((ما بال اقوام قالوا کذا و کذا؟ لکنی اصلی وانام واصوم

**وافطر واتزوج النساء' فمن رغب عن سنتي فليس مني))**

''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ فلاں فلاں بات کہتے ہیں۔ لیکن میں (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' (نفلی) روزہ بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں' اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں...... پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (کوئی تعلق) نہیں (رکھتا)''۔ (صحیح مسلم' کتاب النکاح)

اس واقعہ میں مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں:

☆ نبی اکرم ﷺ ان حضرات کے پاس تشریف لائے' دوسرے لوگوں کو شریک کئے بغیر صرف ان حضرات سے بات کی اور جب عام لوگوں کو یہ مسئلہ بتانا چاہا تو ان حضرات کی طرف اشارہ کئے بغیر اور اُن کا نام لئے بغیر بات کی' ان کو رسوا نہیں کیا' بلکہ یوں فرمایا: ''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ فلاں فلاں بات کہتے ہیں؟'' اس سے ان پر شفقت اور ان کی پردہ پوشی مقصود تھی' اور سب لوگوں کو مسئلہ بتانے کا مقصد بھی حاصل ہو گیا۔

☆ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے حالات اس مقصد سے معلوم کرنا درست ہے کہ ان کے اچھے کاموں کی پیروی کی جائے اور یہ حالات معلوم کرنا اپنے نفس کی تربیت میں شامل ہے جو عقلمندی کی نشانی ہے۔

☆ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مفید اور شرعی مسائل اگر مردوں کے ذریعے معلوم کرنے میں کسی وجہ سے دشواری محسوس ہو تو خواتین کے ذریعے معلوم کرنا بھی جائز ہے۔

☆ اپنے نیک اعمال کا ذکر کرنا جائز ہے بشرطیکہ ریاکاری کا خطرہ نہ ہو اور بتانے سے دوسروں کو فائدہ ہو۔

☆ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ عبادت میں اپنی جان پر سختی کرنے سے اکتاہٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں عبادت سرے سے چھوٹ جاتی

ہے اس لئے بہتر کام وہ ہوتا ہے جس میں میانہ روی اختیار کی جائے''۔

☆ عملی غلطی کی بنیاد تصور کی غلطی ہوتی ہے۔ جب بنیادی تصورات صحیح ہوں تو غلطیوں کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث سے یہ واضح ہے کہ ان صحابہ کرامؓ نے جو رہبانیت اور سخت کوشی اختیار کرنا چاہی تھی اس کی وجہ یہ غلط فہمی تھی کہ نجات کی اُمید تبھی ہو سکتی ہے اگر نبی اکرم ﷺ کی عبادت سے زیادہ عبادت کی جائے' کیونکہ نبی اکرم ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کی بشارت مل چکی ہے' جب کہ ان لوگوں کو یہ شرف حاصل نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس غلط تصور کی اصلاح کر دی اور انہیں بتا دیا کہ آپ ﷺ اگر چہ مغفور ہیں' پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرنے والے اور تقویٰ رکھنے والے ہیں اور انہیں حکم دیا کہ عبادت میں آپ ﷺ کی سنت اور طریقہ پر ہی قائم رہیں۔

## ⑤ نصیحت اور بار بار تخویف کے ذریعے غلطی کی شدت کا احساس دلانا:

حضرت جندب بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے مقابلے میں مسلمانوں کا ایک لشکر روانہ فرمایا' دونوں لشکروں کا باہم سامنا ہوا' (جنگ کے دوران ایسا ہوا کہ) مشرکین میں سے ایک مرد جس مسلمان کو چاہتا قتل کر دیتا۔ (اس کے ہاتھ سے متعدد مسلمان شہید ہو گئے) ایک مسلمان نے اسے غافل پا کر اس پر حملہ کیا' حضرت جندب نے فرمایا: صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے کہ وہ مسلمان اسامہ بن زید تھے' جب انہوں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے (فوراً) کہہ دیا: لا الله الا الله۔ صحابی نے (پھر بھی) اسے قتل کر دیا' (واپسی پر) ایک صحابی نے آ کر رسول اللہ ﷺ کو (فتح کی) خوش خبری دی' آنحضرت ﷺ نے ان سے حالات پوچھے' انہوں نے بتائے اور اُس صحابی کی بات بھی بتائی کہ انہوں نے یہ کام کیا' آنحضرت ﷺ نے اس صحابی کو بلا کر پوچھا: ''تم نے اس شخص کو کیوں قتل کر دیا؟'' انہوں نے عرض کیا: ''اس نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا اور فلاں فلاں شخص کو

شہید کیا'' انہوں نے کئی حضرات کے نام لئے اور کہا ''میں نے اس پر حملہ کیا' اُس نے جب تلوار دیکھی تو لا الٰہ الا اللّٰہ کہہ دیا''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر تم نے اسے قتل کر دیا؟'' انہوں نے کہا: ''جی ہاں''۔ آپؐ نے فرمایا: ''قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللّٰہ حاضر ہوگا تو تم کیا کرو گے؟'' انہوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! میرے لئے گناہ کی معافی کی دعا کیجئے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللّٰہ حاضر ہوگا تو تم کیا کرو گے؟'' حضور ﷺ بار بار یہی فرماتے رہے: ''قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللّٰہ حاضر ہوگا تو تم کیا کرو گے؟''

وعظ و نصیحت کے ذریعے غلطی کی ایک صورت اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت یاد دلانا بھی ہے۔ اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔

امام مسلم نے حضرت ابومسعود بدریؓ سے روایت کی ہے' انہوں نے فرمایا: میں اپنے ایک غلام کو کوڑا لے کر مار رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی: ''ابو مسعود! تجھے معلوم ہونا چاہئے'' غصے کی شدت کی وجہ سے میں توجہ نہ کر سکا کہ یہ کس کی آواز ہے؟ جب وہ قریب آ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ ہیں جو فرما رہے ہیں: ''ابومسعود! تجھے معلوم ہونا چاہئے''۔ میں نے کوڑا ہاتھ سے پھینک دیا۔ ایک روایت میں ہے: ''آنحضرت ﷺ کی ہیبت کی وجہ سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر پڑا'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابومسعود! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تجھے اس غلام پر جس قدر اختیار حاصل ہے' اللہ تعالیٰ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے'' میں نے عرض کیا: ''حضور! آج کے بعد میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا''۔ ایک روایت میں ہے: میں نے کہا: ''یا رسول اللہ! یہ اللہ کے لئے آزاد ہے'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر تو (اس غلطی کی تلافی) نہ کرتا تو آگ تجھے جھلسا دیتی'' یا فرمایا: ''آگ تجھے چھو لیتی''۔

## ⑥ غلطی پر شرمسار شخص پر شفقت کا اظہار:

جو شخص اپنی غلطی پر انتہائی شرمسار ہو' اسے شدید افسوس ہو رہا ہو اور واضح طور پر نظر آ رہا ہو کہ وہ دل سے تائب ہو چکا ہے' اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس پر رحمت و شفقت کا اظہار کیا جائے۔ جیسے اس واقعہ میں ہوا:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آ گیا' اس نے کہا: ''یا رسول اللہ! میں تباہ ہو گیا'' آپؐ نے فرمایا: ''کیا ہوا؟'' اس نے عرض کیا: ''میں روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس چلا گیا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تیرے پاس کوئی غلام یا لونڈی ہے جسے تو آزاد کر سکے؟'' اس نے کہا ''جی نہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تو مسلسل دو ماہ روزے رکھ سکتا ہے؟'' اس نے کہا ''جی نہیں''۔ فرمایا: کیا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے؟'' اس نے کہا ''جی نہیں''۔ نبی اکرم ﷺ وہیں تشریف فرما رہے۔ (سائل بھی حاضر رہا) اسی اثناء میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں کھجوروں کا ایک ٹوکرا پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سائل کہاں ہے؟'' اس نے کہا ''جی میں ہوں''۔ فرمایا: ''یہ لے جاؤ اور انہیں صدقہ کر دو''۔ اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اپنے سے زیادہ غریب آدمی کو دوں؟ اللہ کی قسم دونوں پتھریلے علاقوں کے درمیان (یعنی پورے مدینہ میں) ہم سے زیادہ غریب کوئی گھر نہیں''۔ نبی اکرم ﷺ کھل کر مسکرائے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے (داڑھوں سے پہلے والے) نوکیلے دانت نظر آنے لگے' پھر فرمایا: ''اپنے گھر والوں کو کھلا دو''۔ (صحیح بخاری' کتاب الصوم)

یہ شخص جو ایک غلطی کا ارتکاب کرنے کے بعد مسئلہ پوچھنے آیا تھا' مذاق نہیں کر رہا تھا' نہ اپنے گناہ کو معمولی سمجھ رہا تھا' بلکہ اسے اپنی غلطی کا جس شدت سے احساس تھا وہ اس کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ ''میں تباہ ہو گیا'' اس لئے وہ شفقت کا مستحق ہوا۔

## ⑦ کسی کو غلطی پر قرار دینے میں جلدی نہ کریں:

حضرت عمرؓ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو خود انہی کے الفاظ میں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جناب رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایک بار میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ میں ان کی قراءت توجہ سے سننے لگا' میں نے دیکھا کہ وہ کئی الفاظ اس انداز سے پڑھ رہے ہیں جس طرح مجھے رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھائے تھے' میرا جی چاہا کہ انہیں نماز ہی میں پکڑ لوں' لیکن میں نے صبر کیا' حتیٰ کہ انہوں نے سلام پھیر لیا' تب میں نے انہیں ان کی چادر سے پکڑ کر کہا: ''آپ کو یہ سورت کس نے سکھائی ہے جو میں نے آپ کو پڑھتے سنا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''مجھے رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی ہے'' میں نے کہا: ''آپ غلط کہتے ہیں جس طرح آپ نے پڑھی ہے مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس سے مختلف انداز سے پڑھائی ہے'' میں انہیں پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں لے گیا اور عرض کیا: ''میں نے انہیں سورۃ الفرقان کے کئی الفاظ اس طرح پڑھتے سنا ہے جس طرح آپ نے مجھے نہیں پڑھائے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انہیں چھوڑ دیجئے'' اور فرمایا: ''ہشام! پڑھیے!'' انہوں نے اسی طرح پڑھی جس طرح میں نے انہیں پڑھتے سنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسی طرح نازل ہوئی ہے'' پھر فرمایا: ''عمر! آپ پڑھیے'' میں نے اس طرح پڑھی جس طرح آنحضرت ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے' یہ قرآن سات طریقوں پر نازل ہوا ہے' لہٰذا جو طریقہ آسان معلوم ہو اسی طرح پڑھ لیا کرو''۔

(صحیح بخاری' کتاب فضائل القرآن)

## ⑧ واقعہ میں تربیت سے متعلق نکات:

☆ آنحضور ﷺ نے ہر ایک سے دوسرے کے سامنے پڑھا کر سنا اور اس کی قراءت

کو درست قرار دیا' کسی کو غلط قرار نہ دینے اور دونوں کو صحیح قرار دینے کا یہ طریقہ بہت مؤثر ہے۔

☆ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ ہشامؓ کو چھوڑ دیں اور پکڑے نہ رکھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فریقین اطمینان سے ایک دوسرے کی بات سنیں اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ عمرؓ نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔

☆ طالب علم کسی مسئلہ میں علماء کے جس قول سے واقف ہے' اگر اس کے سامنے اس کے خلاف دوسرا قول پیش کیا جائے تو اسے چاہیئے کہ تحقیق کے بغیر اسے غلط قرار نہ دے' ممکن ہے یہ بھی کبار علماء کا ایک قابل قبول قول ہو۔

اسی موضوع سے متعلق یہ نکتہ بھی ہے کہ سزا دینے میں جلدی کرنا درست نہیں' جیسا کہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ظاہر ہے:

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عباد بن شرحبیل سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں: میں اپنے ایک چچا کے ساتھ مدینہ آیا' وہاں ایک کھیت میں چلا گیا اور کچھ خوشے توڑ کر دانے نکال لئے' کھیت والے نے آ کر مجھے مارا اور میری چادر چھین لی' میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کی' آنحضرت ﷺ نے اسے بلا بھیجا' وہ حاضر ہوا آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''تم نے یہ کام کیوں کیا؟'' اس نے کہا: ''یہ شخص میرے کھیت میں آ گھسا' اس کے خوشے توڑے اور دانے نکال لئے'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ مسئلہ سے ناواقف تھا' تم نے اسے تعلیم نہیں دی' وہ بھوکا تھا' تم نے اسے کھانا نہیں کھلایا اس کی چادر واپس کرو'' ...... پھر آنحضرت ﷺ نے مجھے ایک آدھ وسق غلہ عطا فرمایا''۔

(سنن النسائی' کتاب آداب القضاۃ)

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ غلطی کرنے والے کے حالات معلوم کر لئے جائیں تو اس کے ساتھ صحیح رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

## ⑨ غلطی کرنے والے کے ساتھ جذباتی رویہ اختیار کرنا:

خاص طور پر جب منع کرتے وقت سختی سے کام لینے کے نتیجہ میں خرابی کا دائرہ وسیع ہونے کا خطرہ ہو' اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے اس واقعہ پر غور کریں کہ جب ایک بدو نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی اس غلطی پر کس ردعمل کا مظاہرہ فرمایا؟ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں: ہم مسجد میں نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک اعرابی آیا اور مسجد میں (ایک طرف) کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرامؓ نے کہا: رُک جاؤ' رُک جاؤ'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا پیشاب نہ روکو' اسے فارغ ہو لینے دو'' صحابۂ کرام نے اسے چھوڑ دیا حتیٰ کہ اس نے پیشاب کر لیا۔ اس کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا: ان مسجدوں میں پیشاب کرنا یا گندگی پھیلانا درست نہیں' یہ تو اللہ کے ذکر کے لئے' نماز کے لئے اور تلاوتِ قرآن مجید کے لئے ہوتی ہیں''۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک آدمی کو حکم دیا تو اس نے پانی کا ایک ڈول لا کر اس جگہ پر بہا دیا''۔

(صحیح مسلم' کتاب الطہارۃ)

اعرابی کی اس غلطی کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے جس قاعدہ پر عمل کیا وہ ہے ''آسانی کرنا' مشکل میں نہ ڈالنا''۔

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں جو فوائد ذکر کئے ہیں' ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

☆ جاہل کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے' اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کئے بغیر ضروری مسئلہ جائے' جب کہ اس نے یہ غلطی ضد کی بنیاد پر نہ کی ہو' بالخصوص جب کہ اسے تالیف قلب کی ضرورت ہو۔

☆ اس واقعہ سے نبی اکرم ﷺ کی شفقت اور حسن خلق کا اظہار ہوتا ہے۔

☆ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں یہ مسئلہ خوب جاگزیں تھا

کہ نجاست سے بچنا ضروری ہے اس لئے آنحضرت ﷺ سے اجازت طلب کئے بغیر ہی اسے روکنا شروع کر دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا لازمی ہونا ان کے نزدیک مسلّم تھا۔

☆ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مانع دُور ہوتے ہی خرابی کا ازالہ کرنا چاہئے کیونکہ اس کے فارغ ہوتے ہی صحابہ کو پانی بہانے کا حکم دے دیا گیا''۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: غزوۂ تبوک میں ایک آدمی نے کسی مجلس میں کہا: ''ہم نے اپنے ان قراء (علمائے صحابہ) جیسے لوگ کبھی نہیں دیکھے پیٹ بھرنے کے انتہائی شوقین زبان کے انتہائی جھوٹے اور جنگ کے موقع پر انتہائی بزدل'' مجلس میں موجود ایک صحابیؓ نے کہا: ''تو جھوٹا ہے بلکہ تو منافق ہے میں ضرور رسول اللہ ﷺ کو بتاؤں گا''۔ اور قرآن نازل ہوگیا۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی رسّی کو پکڑے ہوئے (ساتھ ساتھ بھاگ رہا) تھا اور پتھر اسے زخمی کر رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا: ''یا رسول اللہ! ہم تو گپ شپ اور دل لگی کر رہے تھے''۔ اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: ﴿قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ (التوبۃ: ٦٥، ٦٦) ''کیا تم اللہ کا اس کی آیات کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے تھے؟ معذرت نہ کرو تم ایمان لانے کے بعد کفر کا ارتکاب کر چکے ہو''۔

## ⑩ غلطی کا نقصان واضح کرنا:

حضرت ابوثعلبہ خشنی سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ (سفر کے دوران) کسی مقام پر پڑاؤ کرتے تو صحابہ کرام گھاٹیوں اور وادیوں میں بکھر جاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا اِن گھاٹیوں اور وادیوں میں یوں بکھر جانا شیطان کی طرف سے ہے''۔ اس کے بعد (یہ حال ہوگیا کہ) جب بھی آنحضرت ﷺ کسی مقام

پر پڑاؤ ڈالتے تو صحابہ کرام ایک دوسرے سے اس طرح مل کر بیٹھتے کہ اگر ان پر کپڑا پھیلایا جائے تو سب کو ڈھانک لے''۔ (سنن ابی داؤد کتاب الجہاد)

اس میں جو چیز واضح ہے وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ صحابہ کرام کا بہت خیال رکھتے تھے اور اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر لشکر کو اپنی فوج کے فائدہ کا بہت خیال رکھنا چاہئے اور یہ بھی کہ لشکر کے لوگ جب بکھر کر آرام کریں تو اس کی وجہ سے شیطان مسلمانوں کو خوف زدہ کر سکتا ہے اور دشمن کو حملہ کرنے کا حوصلہ ہو سکتا ہے۔

غلطی کرنے والے کو قائل کرنے کے لئے غلطی سے پیدا ہونے والی خرابیوں اور اس کے برے نتائج کی وضاحت بڑی اہم چیز ہے۔ بعض اوقات غلطی کا نتیجہ خود غلطی کرنے والے کے حق میں ہی برا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس کے نتیجہ میں دوسروں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے، جو دوسرے الفاظ سے صحیح مسلم میں بھی مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک آدمی کی چادر ہوا سے اڑنے لگی تو اس نے ہوا پر لعنت بھیجی، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اُسے لعنت نہ کرو، وہ حکم کی پابند ہے (یعنی اللہ کے حکم سے چلتی ہے)، جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت بھیجتا ہے جو اس کی مستحق نہ ہو تو لعنت خود اسی (لعنت بھیجنے والے) پر پڑتی ہے''۔

اس کے علاوہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تعریف کرنے والا تعریف میں ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کا اسے یقین نہیں ہوتا اور ایسی بات تاکید کے ساتھ کہہ دیتا ہے جس کو وہ براہِ راست معلوم نہیں کر سکتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ تعریف میں جھوٹ بول دیتا ہے، بعض اوقات ممدوح کے سامنے تعریف میں ریا کاری سے کام لے رہا ہوتا ہے اس طرح گناہ اور بڑا ہو جاتا ہے، بالخصوص جبکہ ممدوح ظالم یا فاسق ہو تو اس جرم کی شناعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ تعریف کرنا سرے سے ممنوع ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ

نے بعض حضرات کی موجودگی میں ان کی تعریف کی ہے۔صحیح مسلم کے ایک باب کے عنوان سے یہ مسئلہ خوب واضح ہو جاتا ہے۔باب کا عنوان یوں ہے: **باب النهى عن المدح اذا كان فيه افراط' وخيف منه فتنة على الممدوح:** تعریف کی ممانعت' جب کہ اس میں مبالغہ ہو اور اس سے ممدوح کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو''۔

البتہ جو شخص اپنی کوتاہیوں کا معترف ہوتا ہے اسے اس قسم کی تعریف سے نقصان نہیں ہوتا اور جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو وہ اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوتا' کیونکہ اسے اپنے صحیح مقام کا علم ہوتا ہے۔کسی بزرگ کا قول ہے: جب کسی کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے تو اسے چاہئے کہ یوں دعا کرے: **اللهم اغفرلى ما لا يعلمون' ولا تؤاخذنى بما يقولون' واجعلنى خيرًا مما يظنون** ''اے اللہ! میرے وہ گناہ معاف فرما دے جو ان لوگوں کو معلوم نہیں اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر میری گرفت نہ فرمانا' اور مجھے ان کے گمان سے بہتر بنا دے''۔

## ⑪ غلطی کرنے والے کو عملی طور پر تعلیم دینا:

اکثر اوقات نظری تعلیم کے بجائے عملی تعلیم زیادہ مؤثر ہوتی ہے' نبی اکرم ﷺ نے بھی یہ طریقہ اختیار فرمایا ہے۔حضرت جبیر بن نفیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے' آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے پانی منگوایا اور فرمایا: ''ابو جبیر! وضو کر لیجئے'' ابو جبیر نے منہ سے وضو کی ابتدا کی' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ابو جبیر! منہ سے شروع نہ کیجئے' کافر منہ سے شروع کرتا ہے'' پھر حضور ﷺ نے پانی طلب فرمایا اور اپنے ہاتھ دھو کر اچھی طرح صاف کر لئے پھر تین بار کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور تین بار چہرہ مبارک دھویا اور دایاں بازو کہنی تک تین بار دھویا اور بایاں بھی تین بار دھویا اور سر کا مسح کیا اور قدم مبارک

دھوئے''۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب صحابیؓ کو یہ بتایا کہ کافر پہلے منہ دھوتے ہیں تو اس کا مقصد ان کے دل میں اس غلطی سے نفرت پیدا کرنا تھا' یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ کافر بغیر دھوئے ہاتھ پانی میں ڈال دیتا ہے' جو صفائی کا اہتمام کرنے کے منافی ہے۔ واللہ اعلم۔

## ⑫ صحیح متبادل پیش کرنا:

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ہم جب رسول اللہ ﷺ کی معیت میں نماز ادا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے: بندوں کی طرف سے اللہ کو سلام' فلاں فلاں کو سلام۔ (ایک روایت میں ہے) جبرائیل کو سلام' میکائیل کو سلام۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

یوں نے کہا کرو کہ اللہ کو سلام' اللہ تو خود سلامتی والا ہے' بلکہ یوں کہو: اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ' اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ: (تمام قولی' بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں' اے نبیؐ! آپ پر سلامتی ہو' اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔ ہم پر بھی سلامتی ہو' اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی)۔ جب تم یہ کہو گے تو آسمان اور زمین میں اللہ کے ہر بندے کو یہ دعا پہنچ جائے گی۔ (پھر کہو): اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ' وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ: (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)۔ اس کے بعد جو دعا اسے اچھی لگے وہی منتخب کر کے پڑھ لے''۔

ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنے والے بعض علماء جب لوگوں کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرتے ہیں تو ان کے کام میں ایک نقص نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ یہ بات تو واضح کر دیتے ہیں کہ فلاں کام غلط ہے اور فلاں کام

حرام ہے، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اس کی جگہ انہیں کیا کام کرنا چاہئے، یا اس کام کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے؟ حالانکہ شریعت کا طریقہ یہ ہے کہ لوگ جن حرام طریقوں سے اپنی کوئی غرض پوری کرتے ہیں، شریعت ان کی جگہ ان کا متبادل پیش کرتی ہے۔ مثلاً جب زنا کو حرام قرار دیا گیا تو اس کے ساتھ نکاح کا صحیح طریقہ بتادیا گیا۔ اسی طرح اگر سود حرام کیا گیا ہے تو اس کی جگہ تجارت کو جائز قرار دے دیا گیا۔ خنزیر، مردار، کچلی والے جانور اور پنجے سے شکار کرنے والے پرندے حرام قرار دیئے گئے، تو دیگر مویشیوں اور شکار کئے جانے والے جانوروں کو ذبح کر کے کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے علاوہ اگر کسی شخص سے حرام کام کا ارتکاب ہو جائے تو شریعت نے اس کے لئے توبہ اور کفارہ کا راستہ کھلا رکھا ہے، جس کی تفصیلات قرآن وحدیث میں موجود ہیں، لہٰذا مبلغ کو چاہئے کہ شریعت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نعم البدل پیش کرے اور مشکل سے نکلنے کے لئے شرعی حل تلاش کرے۔

یہاں یہ اشارہ کر دینا مناسب ہے کہ متبادل پیش کرنا بہرحال استطاعت کے مطابق ہی ممکن ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام غلط ہوتا ہے جس سے پرہیز کرنا واجب ہوتا ہے، لیکن حالات کی خرابی کی وجہ سے یا لوگوں کی شریعت سے دوری کی وجہ سے عملاً کوئی مناسب نعم البدل موجود نہیں ہوتا، یا داعی کو بروقت کوئی متبادل یاد نہیں آتا، یا وہ اُن چیزوں سے واقف نہیں ہوتا جو صحیح متبادل بن سکتی ہیں، ان حالات میں بھی اس کے لئے غلطی پر تنبیہ کرنا اور برائی سے روکنا ضروری ہے، اگرچہ وہ ان کی توجہ کسی متبادل کی طرف مبذول نہ کراسکے۔ ایسی صورت حال عام طور پر بعض مالی معاملات اور سرمایہ کاری کے ان طریقوں میں پیش آتی ہے جو غیر مسلم معاشروں میں وجود میں آئے اور پھر اپنی تمام قباحتوں اور خلاف شریعت امور سمیت مسلمانوں کے معاشروں میں رواج پاگئے اور مسلمانوں کی کوتاہی اور کمزوری کی وجہ سے ان کا کوئی شرعی نعم البدل ایجاد کر کے رائج نہیں کیا جا سکا۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ یہ

نقص اور کوتاہی ہے اور شریعت میں ان کے متبادل موجود ہیں اور ایسے حل موجود ہیں جن کو اختیار کر کے مسلمان اس مشکل سے نکل سکتے ہیں' خواہ کسی کو ان حلوں کا علم ہو یا نہ ہو۔

## ⑭ محفوظ رہنے کی تدبیر بتانا:

حضرت ابوامامہ نے اپنے والد حضرت سہل بن حنیف سے ان کا ایک واقعہ روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے' جب وہ مقام جحفہ کی وادی خزار میں پہنچے تو وہاں حضرت سہل بن حنیف غسل کرنے لگے' ان کا رنگ گورا تھا اور جلد بہت خوش رنگ تھی۔ قبیلہ بنوعدی بن کعب کے ایک صاحب حضرت عامر بن ربیعہ نے انہیں غسل کرتے ہوئے دیکھا تو کہا: ایسی جلد تو میں نے کبھی کسی پردہ نشین لڑکی کی بھی نہیں دیکھی (یعنی کتنا خوبصورت رنگ ہے)۔ اس پر حضرت سہل تو وہیں زمین پر گر پڑے۔ کسی نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ سہل کو دیکھیں گے' اللہ کی قسم! وہ تو سر بھی نہیں اٹھاتے' انہیں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا (سخت بخار ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس کے بارے میں کسی کو قصوروار سمجھتے ہو؟'' صحابہ نے کہا: عامر بن ربیعہ نے انہیں (کپڑے اتارے ہوئے) دیکھا تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے عامر کو طلب فرمایا اور انہیں سرزنش فرمائی۔ ارشاد فرمایا: ''ایک آدمی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے؟ اگر تجھے ایک چیز اچھی لگی تھی تو تُو نے برکت کی دعا کیوں نہ دی؟'' پھر فرمایا: اس کے لئے اپنے اعضاء دھوؤ'' انہوں نے ایک برتن مین چہرہ' ہاتھ' کہنیاں' گھٹنے' پاؤں اور تہہ بند کے اندر والا حصہ دھو کر (وہ پانی) دے دیا۔ وہ پانی حضرت سہل پر ڈالا گیا۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس کو نظر لگی ہو' کوئی شخص پانی اس کے پیچھے کی طرف سے اس کے سر اور کمر پر ڈال دے' پھر برتن بھی اس کے پیچھے ہی الٹا کر رکھ دے۔ چنانچہ حضرت سہل کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا تو وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ میں مندرجہ ذیل فوائد ہیں:

☆ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو تکلیف پہنچنے کا سبب بنا ہو تربیت کرنے والا اس پر ناراضگی کا اظہار کر سکتا ہے۔

☆ غلطی سے نقصان پہنچتا ہے اور بعض اوقات کوئی غلطی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے۔

☆ ایسی تدبیر بتانا' جس سے مسلمان کو پہنچنے والے نقصان یا تکلیف کا سدِ باب ہو جائے۔

## براہِ راست مخاطب کے بجائے عمومی وضاحت:

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں؟'' حضور ﷺ نے اس بارے میں سختی سے تنبیہ فرمائی' حتیٰ کہ ارشاد فرمایا: ''وہ ضرور ضرور اس حرکت سے باز آجائیں' ورنہ ان کی آنکھیں چھین لی جائیں گی''۔

حضرت عائشہ نے ایک لونڈی حضرت بریرہ کو خریدنے کا ارادہ کیا' ان کے مالکوں نے اس شرط پر بیچنے پر رضامندی ظاہر کی کہ ولاء ان لوگوں کی ہوگی' جب نبی اکرم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے لوگوں میں کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی' پھر فرمایا:

''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ ایسی شرائط عائد کرتے ہیں جو اللہ کی کتاب (یعنی شریعت) میں نہیں ہیں؟ جو شرط بھی اللہ کی کتاب میں نہیں وہ کالعدم ہے' اگر چہ سو شرطیں ہوں' اللہ کا فیصلہ زیادہ درست ہے اور اللہ کی (بیان کی ہوئی) شرط زیادہ پختہ ہے۔ (قانون یہ ہے کہ) ولاء اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے''۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن میں مشترک چیز یہ ہے کہ غلطی کرنے والے کو شرمندہ نہ کیا جائے' غلطی کرنے والے کو براہِ راست مخاطب نہ کرنے

اوراشارہ سے اس کی غلطی واضح کرنے کے اس اسلوب میں بہت سے فائدے ہیں' جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① غلطی کرنے والے کی طرف سے منفی ردِعمل کا خطرہ نہیں ہوتا' اس طرح شیطان اس کے انتقامی جذبات کو ہوا دے کر انتقام کی طرف مائل نہین کرسکتا۔

② اس اسلوب کو زیادہ قبول کیا جاتا ہے اور دل پر اس کا زیادہ گہرا اثر ہوتا ہے۔

③ اس سے غلطی کرنے والے کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔

④ غلطی کرنے والے کے دل میں نصیحت کرنے والے کی قدر ومنزلت اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ تعریض کے اس اسلوب کا مقصد یہ ہے کہ غلطی کرنے والے کو رسوا کئے بغیر مسئلہ سمجھا دیا جائے' لہٰذا یہ اسلوب اس وقت استعمال کرنا چاہئے جب اس کی غلطی عام لوگوں سے پوشیدہ ہو۔ لیکن اگر اکثر لوگوں کو اس کا علم ہو اور اسے معلوم ہو کہ اکثر لوگ یہ بات جانتے ہیں تو اس صورت میں یہ اسلوب سخت زجروتوبیخ کا حامل اور غلطی کرنے والے کے لئے سخت تکلیف دہ بن جاتا ہے' بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش اسے براہِ راست تنبیہ کردی جاتی اور اس کے ساتھ یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا۔ اس کی تاثیر میں اس سے بھی فرق پڑتا ہے کہ بات کہنے والا کون ہے؟ اور کس کے سامنے بات کی جارہی ہے؟ اور بات نصیحت اور خیر خواہی کے انداز سے کہی گئی ہے یا تنگ کرنے کے انداز سے؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بالواسطہ کلام کا یہ انداز تربیت کا ایسا انداز ہے جس سے غلطی کرنے والے کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی' بشرطیکہ اسے استعمال کرتے ہوئے حکمت سے کام لیا جائے۔

## ⑮ غلطی کرنے والے کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنا:

یہ طریقہ بعض خاص حالات میں ہی استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کے بہت زیادہ منفی اثرات نہ ہوں۔ نبی اکرم ﷺ سے اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے پڑوسی کی شکایت کی' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جاؤ' صبر کرو' وہ دو تین دفعہ شکایت لے کر حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا: ''جاؤ' اپنے گھر کا سامان راستے میں ڈال دو'' اس نے ایسا ہی کیا (گزرنے والے) لوگ اس سے پوچھتے' وہ وجہ بتا دیتا۔ لوگ پڑوسی کو برا بھلا کہتے' اللہ اس کے ساتھ یوں یوں کرے' آخر پڑوسی نے آ کر اس سے کہا: ''(اپنے گھر میں) واپس آجاؤ' آئندہ مجھ سے کوئی ایسی حرکت نہیں ہو گی جو تمہیں ناگوار ہو''۔

اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوب ہے' جو اور قسم کے حالات میں اور دوسرے قسم کے افراد کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غلطی کرنے والے کو عام لوگ ناجائز طور پر تنگ نہ کریں۔ اس کی وضاحت آئندہ نکتہ سے ہوتی ہے۔

## ⑯ غلط کام سے رک جانے کو کہنا:

ایک بڑی اہم چیز یہ بھی ہے کہ غلطی کرنے والے کو غلطی کرتے چلے جانے سے منع کر دیا جائے' تاکہ وہ مزید غلطیوں کا مرتکب نہ ہو اور برائی سے روکنے کا فریضہ بلا تاخیر انجام پا جائے۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (کسی بات میں) یوں کہہ دیا: ''قسم ہے میرے باپ کی'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رک جایئے' جو شخص اللہ کے سوا کسی

چیز کی قسم کھاتا ہے‘ وہ شرک کرتا ہے‘‘۔

## غلطی کی اصلاح کے لئے ممکن تلافی کا حکم دینا:

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’کوئی مرد کسی نامحرم عورت کے ساتھ اکیلا نہ رہے‘‘ ایک آدمی نے اٹھ کر عرض کیا: ’’یا رسول اللہ! میری بیوی حج کے لئے روانہ ہوگئی ہے اور میں نے فلاں غزوہ کے لئے نام لکھوا دیا ہے‘‘ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’واپس جا کر اپنی بیوی کے ساتھ حج ادا کرو‘‘۔

## غلطی کے آثار کی اصلاح

سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ’’میں ہجرت کی بیعت کرنے کے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں‘ اور اپنے والدین کو روتے چھوڑ کر آگیا ہوں‘‘ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: واپس جاؤ اور جس طرح انہیں رلایا ہے‘ اسی طرح انہیں ہنساؤ۔

## غلطی کا کفارہ ادا کرنا:

بعض غلطیاں ایسی ہیں جن کا ازالہ ناممکن ہے۔ شریعت نے ان کے اثرات ختم کرنے کے لئے دوسرے طریقے مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ کفارہ کی ادائیگی بھی ہے۔ کفارے کی بہت سی قسمیں ہیں‘ مثلاً قسم کا کفارہ‘ ظہار کا کفارہ‘ قتل خطا کا کفارہ‘ رمضان کے روزہ کے دوران ازدواجی اختلاط کا کفارہ وغیرہ۔

## جہاں غلطی ہو اس پر تنبیہ کر کے باقی عمل کو قبول کرنا:

بعض اوقات کوئی بات یا کوئی کام سارے کا سارا غلط نہیں ہوتا‘ اس صورت میں حکمت کا تقاضا ہے کہ صرف اتنی چیز کو غلط کہا جائے جو غلطی پر مشتمل ہے‘ پوری بات

یا سارے عمل کو غلط قرار نہ دیا جائے۔

اس رویئے کے نتیجے میں غلطی کرنے والے کو اصلاح کرنے والے کے عدل و انصاف کا احساس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے غلطی کرنے والا اس کی تنبیہ کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ غلطی دیکھ کر اس قدر غضب ناک ہوتے ہیں کہ وہ اس کی صحیح اور غلط پر مشتمل پوری بات کو غلط کہہ کر رد کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے غلطی کرنے والا بھی اپنی غلطی تسلیم کر کے اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتا۔

بعض اوقات غلطی اُن الفاظ میں نہیں ہوتی جو کہے گئے ہیں، بلکہ جس موقعہ پر وہ الفاظ کہے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہوتے۔ جیسے جب کسی کی وفات ہو جاتی ہے تو تعزیت کے لئے آنے والوں میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ فاتحہ پڑھیں اور تمام حاضرین سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں۔ دلیل کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن ہی پڑھا ہے کوئی کفریہ کلام تو نہیں پڑھا، تو ایسے لوگوں کے لئے یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ان کے عمل میں جو غلطی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس موقعہ پر ایک عبادت کے طور پر فاتحہ کی تخصیص کر لی ہے حالانکہ اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں اور بدعت یہی تو ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسی نکتہ کی طرف توجہ دلائی تھی جب ان کے قریب ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے کہا: الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ۔ تو ابن عمرؓ نے فرمایا: یہ تو میں بھی کہتا ہوں کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے (الحمد للہ) اور رسول اللہ ﷺ پر سلام ہو (والسلام علی رسول اللہ) لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس طرح کہنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ہر حال میں الحمد للہ کہیں''۔

## غلطی کرنے والے کے مقام کا احترام:

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ''خاندانِ حمیر سے تعلق رکھنے والے ایک صحابی نے (جنگ کے دوران)

دشمن کے ایک آدمی کو قتل کیا۔ انہوں نے مقتول کا سامان لینا چاہا تو حضرت خالد بن ولید نے انہیں سامان دینے سے انکار کر دیا۔ خالد بن ولیدؓ اس فوج کے سپہ سالار تھے۔ حضرت عوف بن مالکؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ حضور ﷺ نے حضرت خالدؓ سے فرمایا: آپ نے اسے مقتول کا سامان دینے سے کیوں انکار کیا؟'' انہوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت زیادہ ہے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اسے وہ سامان دے دیجئے''۔ اس کے بعد حضرت خالد حضرت عوف کے پاس سے گزرے تو انہوں نے حضرت خالد کی چادر کھینچی اور (حمیری صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے) کہا میں نے تجھ سے جو کچھ کہا تھا وہ کام رسول اللہ ﷺ سے کروا دیا نا؟ جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سنی تو غضبناک ہو گئے۔ فرمایا: ''خالد! اسے نہ دینا' خالد اسے نہ دینا' کیا تم میرا لحاظ کر کے میرے (مقرر کردہ) امیروں کو چھوڑ نہیں سکتے؟ تمہاری اور ان کی مثال تو ایسے ہے جیسے ایک آدمی کو اونٹوں یا بکریوں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی' اس نے ان کا خوب اچھی طرح خیال رکھا' پھر ان کو پانی پلانے کے وقت کا خیال رکھا اور انہیں (بروقت) حوض پر لے گیا' انہوں نے پانی پینا شروع کیا تو صاف پانی پی لیا اور گدلا پانی چھوڑ دیا' تو صاف پانی تو تم لوگوں کے لئے ہے اور گدلا پانی ان (سالاروں) کے لئے؟''

## مشترکہ غلطی میں فریقین کو تنبیہ:

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غلطی میں دونوں فریق شریک ہوتے ہیں' اور جس شخص کے حق میں غلطی ہوئی ہوتی ہے خود وہ بھی غلطی پر ہوتا ہے' اگرچہ ایک فریق کی غلطی دوسرے سے زیادہ ہو' اس صورت میں غلطی سے تعلق رکھنے والے دونوں فریقوں کو تنبیہ یا نصیحت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال درج ذیل ہے:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے

جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت خالد بن ولید کی شکایت کی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: خالد! جنگ بدر میں شریک ہونے والے ایک آدمی کو تکلیف نہ پہنچاؤ اگر آپ احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دیں تو اس کے عمل (کے برابر ثواب) کو نہیں پہنچ سکتے۔

انہوں نے عرض کیا: ''لوگ مجھے نامناسب باتیں کہہ دیتے ہیں' تو میں بھی جواب دے دیتا ہوں''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خالد کو تکلیف نہ پہنچاؤ' وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے جو اس نے کافروں پر مسلط کر دی ہے''۔

## غلطی کرنے والے کا متاثرہ فریق سے معذرت:

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: عرب لوگ سفر میں' ایک دوسرے کی خدمت کیا کرتے تھے۔ (ایک سفر میں) حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ساتھ ایک آدمی تھا' جو اُن کی خدمت کرتا تھا۔ (ایک بار ایسا ہوا کہ) وہ دونوں سو گئے' جب جاگے تو اس شخص نے ابھی ان کے لئے کھانا تیار نہیں کیا تھا۔ ان حضرات میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: ''یہ شخص بہت سوتا ہے'' پھر اسے جگایا اور کہا کہ: ''رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنا: ابوبکر اور عمر سلام عرض کرتے ہیں اور سالن مانگ رہے ہیں''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ان دونوں کو سلام کہنا اور انہیں بتانا کہ وہ سالن تو کھا چکے ہیں''۔ (جب انہیں یہ پیغام ملا تو) وہ فوراً گھبرائے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کی خدمت میں سالن کے لئے آدمی بھیجا تو آپ نے ارشاد فرمایا: وہ سالن کھا چکے ہیں' ہم نے کون سا سالن کھا لیا ہے؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے' اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' مجھے تمہارے دانتوں میں اس کا گوشت نظر آ رہا ہے''۔ (یعنی جس کی غیبت کی تھی' اس کا گوشت دانتوں میں لگا ہوا ہے۔) ان دونوں نے عرض کیا: ''ہمارے لئے مغفرت کی دعا فرمایئے''۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہی تمہارے لئے بخشش کی دعا کرے''۔

## متاثرہ فریق کی فضیلت

جب حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوگئی تھی، تو نبی اکرم ﷺ نے ایسے ہی کیا تھا۔ امام بخاری نے اپنی ''صحیح'' کی ''کتاب التفسیر'' میں حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے درمیان کچھ بات چیت ہو رہی تھی کہ (کسی بات کی وجہ سے) عمرؓ، ابوبکرؓ سے ناراض ہو گئے اور غصے کی حالت میں ان کے پاس سے چلے آئے۔ ابوبکرؓ ان کے پیچھے پیچھے آئے اور ان سے درخواست کی کہ ان کے لئے اللہ سے بخشش کی دعا کریں، انہوں نے یہ بات نہ مانی، بلکہ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا: ہم بھی خدمت اقدس میں حاضر تھے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے (انہیں دیکھتے ہی) فرمادیا: ''تمہارے اس ساتھی کا تو (کسی سے) جھگڑا ہو گیا ہے''۔ حضرت عمرؓ کو بھی اپنے طرز عمل پر ندامت محسوس ہوئی، وہ آئے اور سلام کر کے نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھ گئے اور جناب رسول اللہ ﷺ کو پوری بات بتائی۔ آنحضرت ﷺ کو غصہ آ گیا۔ ابوبکرؓ نے کہنا شروع کر دیا: ''یا رسول اللہ! بخدا، میری ہی زیادہ غلطی تھی''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تم لوگ میرا لحاظ کر کے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑ سکتے؟ کیا تم لوگ میرا لحاظ کر کے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑ سکتے؟ میں نے کہا: لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغام رساں بن کر آیا ہوں۔ (اُس وقت) تم سب نے کہا: آپ غلط کہتے ہیں اور ابوبکر نے کہا: آپ نے سچ فرمایا''۔

## فریقین کے درمیان مداخلت کر کے جذبات ٹھنڈے کرنا:

جناب رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر یہ پالیسی اختیار فرمائی ہے کہ جب مسلمانوں میں لڑائی کی نوبت آئی تو آنحضرت ﷺ نے مداخلت کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا جب منافقوں نے حضرت عائشہ پر ناپاک بہتان لگایا تھا' اس واقعہ کی تفصیل میں مذکور ہے۔

## غلطی پر غصے کا اظہار:

جب اصلاح کرنے والا یا عالم آدمی ایک غلط کام ہوتا دیکھے یا کسی سے غلط بات سنے تو ناراضگی کا اظہار کر سکتا ہے' خاص طور پر جب کہ غلطی کا تعلق عقیدے سے ہو۔ اس کی ایک مثال تقدیر کے بارے میں بحث اور قرآن کے بارے میں اختلاف ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے اپنے والد حضرت شعیب بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا اور انہوں نے اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو سے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ غصہ کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کا چہرۂ مبارک اس طرح (سرخ) ہو گیا جیسے انار کے (سرخ) دانے نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا تمہیں اس کام کا حکم دیا گیا ہے؟'' یا فرمایا: ''کیا تمہیں اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کی آیات کو باہم ٹکرانے لگو؟ تم سے پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں''۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے فرمایا: مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ میں اس مجلس میں موجود نہیں تھا۔

اس واقعہ سے مربی کا ایسا کردار سامنے آتا ہے جسے حاضرین کی تائید حاصل ہے' جنہوں نے مربی کے چہرہ کے تاثرات دیکھ کر ایک موقف اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جسے نصیحت کرنا مقصود ہے وہ جب ان تمام امور کو بیک وقت ملاحظہ کرتا ہے تو

اس کے دل پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا واقعہ کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل مراحل نظر آتے ہیں:

① غلطی سامنے آنے پر جناب رسول اللہ ﷺ پر اس کا شدید اثر ہوا اور کلام فرمانے سے پہلے ہی آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔

② حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے اس چیز کو فوراً محسوس فرمالیا اور حضرت عمرؓ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

③ حضرت عمرؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' اور انہوں نے فوراً اصلاح کر کے معذرت کی اور اللہ اور اسکے رسول کے غضب سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہوئے اس بنیادی اصول کا اظہار فرمادیا کہ انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی مطلوب ہے اور وہ دین اسلام سے خوش ہیں۔

④ نبی اکرم ﷺ نے جب دیکھا کہ عمرؓ نے اپنی غلطی محسوس فرمالی ہے اور اس سے رجوع کرلیا تو حضور ﷺ کا چہرۂ مبارک خوشی سے دمکنے لگا۔

⑤ نبی اکرم ﷺ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بنیادی اصول کی تائید فرمائی اور اس کی تائید فرماتے ہوئے یہ واضح کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی شریعت کی پیروی واجب ہے اور عالم کے دوسرے نام نہاد مآخذ سے بچنا ضروری ہے۔

⑥ اگر مسئلہ پوچھنے والا آدمی حد سے زیادہ تکلف کا شکار ہو اور خواہ مخواہ سختی میں گرفتار ہو تو مفتی کا اظہار غضب بھی اسی قبیل سے ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور گری پڑی چیز کے بارے میں مسئلہ پوچھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ایک سال تک اس کا اعلان کر' اس کے بعد اس کا ظرف (مثلاً رقم کا بٹوہ وغیرہ) اور بندھن (یعنی کس چیز سے باندھا گیا ہے) وغیرہ یاد رکھ' اگر اس کا مالک آ کر تجھے

(نشانیاں) بتادے (توٹھیک ہے' اس کی چیز اسے دے دی جائے) ورنہ اسے خرچ کرلے"۔ اس نے کہا: "اے اللہ کے رسول! گم شدہ بکری ملے تو؟" فرمایا: "وہ تیری ہے یا تیرے بھائی کی ہے یا بھیڑیئے کی ہے"۔ اس نے کہا: "اور گم شدہ اونٹ؟" آنحضرت ﷺ کا چہرۂ مبارک غصے سے تمتما اٹھا' فرمایا: "تجھے اس سے کیا غرض؟ اس کی مشک اور اس کے جوتے اس کے ساتھ ہیں (چشموں سے پانی پی لے گا اور درختوں سے (پتے وغیرہ) کھالے گا!"۔

⑦ غلطی واقع ہونے پر یا اس کا علم ہوتے ہی' مربی کا متوازن ردعمل' جس کا اثر اس کی آواز اور اندازِ کلام میں ظاہر ہورہا ہو' یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں برائی کے خلاف نفرت موجود ہے اور وہ اس پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس سے حاضرین کے دلوں میں اس برائی سے خوف پیدا ہوجاتا ہے اور مربی کی اس جذباتی کیفیت کا ان کے دلوں پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر غلطی پر پردہ ڈال دیا جائے یا ردِعمل ظاہر کرنے میں تاخیر کی جائے تو بعد میں اس پر تبصرہ کرنے سے مطلوبہ تاثیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

⑧ بعض اوقات حکمت کا تقاضا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غلط کام اور بڑی غلطی پر مشتمل کلام پر تبصرہ اس وقت تک متاخر کردیا جائے جب تک لوگوں کی مناسب تعداد جمع نہیں ہوجاتی۔ اس لئے کہ وہ معاملہ بہت اہم ہوتا ہے' یا سامعین کی تعداد اتنی نہیں ہوتی کہ تبصرہ سے مناسب فائدہ حاصل ہو' یا وہ زیادہ لوگوں تک بات پہنچا سکیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوبار تبصرہ کیا جائے' ایک بار فوری طور پر متعلقہ افراد کے سامنے وضاحت کردی جائے اور دوسری بار مناسب وقت پر عوام کو بات سمجھادی جائے۔

بحث نہ کرتے ہوئے اعراض کر لینا تا کہ وہ خود ہی اصلاح کر لے:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علیؓ سے روایت کی کہ جناب رسول اللہ ﷺ رات کے وقت اپنی بیٹی فاطمہ اور علی کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''تم لوگ نماز (تہجد) نہیں پڑھتے؟'' حضرت علی نے کہا'' ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب ہمیں اٹھانا (اور جگانا) چاہے گا' اٹھا دے گا''۔ ان کی یہ بات سن کر آنحضرت ﷺ کچھ کہے بغیر واپس پلٹ گئے۔ حضرت علیؓ نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ واپس جاتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مار کر فرما رہے تھے: ﴿وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾: ''انسان سب سے زیادہ جھگڑالو مخلوق ہے''۔

زبانی تنبیہ کرنا:

جیسے رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطب (بن ابی بلتعہ) کو عتاب فرمایا تھا' جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ حاطبؓ نے قریش کے کافروں کو پیغام بھیجا ہے کہ مسلمان مکہ فتح کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''حاطب! تو نے یہ کام کیوں کیا؟'' انہوں نے کہا: ''میں اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہوں' اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا' (بات صرف اتنی ہے کہ) میں چاہتا تھا کہ ان لوگوں پر میرا کوئی احسان ہے' جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ' میرے بچوں اور مال کی حفاظت فرمائے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے' لہٰذا اسے کوئی بری بات نہ کہنا''۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس نے اللہ کی' رسول کی اور مؤمنوں کی خیانت کی ہے' مجھے اجازت دیجئے کہ اسے قتل کر دوں''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''عمرؓ تجھے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے بدر (کی جنگ میں شریک ہونے) والوں سے فرمایا ہے: جو چاہو کرو' تمہارے لئے جنت واجب ہو چکی ہے''۔ حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' فرمایا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں''۔

اس واقعہ میں تربیت کے نقطہ نظر سے عظیم نکات ہیں:

① نبی اکرم ﷺ نے اس صحابی کو تنبیہ فرمائی جن سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی، چنانچہ فرمایا: تو نے یہ کام کیوں کیا؟

② غلطی کرنے والے سے وہ سبب دریافت کرنا چاہئے جس کی بنا پر غلطی سرزد ہوئی، کیونکہ اس سے اس کے بارے میں اختیار کئے جانے والے مؤقف پر اثر پڑے گا۔

③ جن حضرات کے بڑے کارنامے اور فضائل ہیں، وہ بھی گناہوں سے معصوم نہیں۔

④ مربی میں اپنے ساتھیوں کی غلطیاں برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے، تاکہ وہ صحیح راہ پر قائم رہ کر اس کا ساتھ دیتے رہیں، کیونکہ مقصد ان کی اصلاح ہے نہ کہ انہیں اپنے پاس سے بھگا دینا۔

⑤ تربیت کرنے والے کو اس بات کا احساس کرنا چاہئے کہ کسی ساتھی پر وقتی طور پر انسانی کمزوری کا غلبہ ہو سکتا ہے اور اگر کسی پرانے رفیق سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا سختی سے مواخذہ نہ کیا جائے۔

⑥ اگر غلطی کرنے والا دفاع کا مستحق ہو تو اس کا دفاع کیا جائے۔

⑦ غلطی کو بہت بڑی یا معمولی قرار دیتے وقت اور غلطی کرنے والے کے بارے میں موقف طے کرتے وقت اس کی گزشتہ بڑی بڑی نیکیوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

## ملامت کرنا:

بالکل واضح غلطی پر خاموشی اختیار نہیں کی جا سکتی، لہٰذا غلطی کرنے والے کو بغیر کسی تمہید کے براہِ راست ملامت کی جا سکتی ہے، تاکہ وہ اپنی غلطی کا احساس کرے۔

بے اعتنائی:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حمیدؒ سے روایت کی' انہوں نے کہا: ولید رحمۃ اللہ علیہ میرے پاس اور میرے ایک دوست کے پاس آئے' اور ہم سے کہا: آؤ چلیں' تم دونوں مجھ سے عمر میں کم ہو اور حدیث مجھ سے زیادہ یاد رکھ سکتے ہو''۔ وہ ہمیں

مسند احمد میں حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو سے) روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو سونے کی انگوٹھی پہنے دیکھا تو اس سے اعراض فرمایا' اس نے وہ اتار کر لوہے کی انگوٹھی بنوالی' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ زیادہ بری ہے' یہ تو اہل جہنم کا زیور ہے' اس نے وہ بھی اتار دی اور چاندی کی انگوٹھی بنوالی۔ اس پر آنحضرت ﷺ خاموش رہے۔

بائیکاٹ:

یہ ایک انتہائی مؤثر نبوی اسلوب ہے' بالخصوص جب کہ غلطی یا گناہ بہت عظیم ہو' اس لئے کہ تعلقات منقطع کر لینے سے غلطی کرنے والے کے دل پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔

ترمذی کی حدیث سے آنحضرت ﷺ کے اس اسلوب کو روبعمل لانے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے' انہوں نے فرمایا: ''جناب رسول اللہ ﷺ کو تمام عادتوں میں سب سے زیادہ نفرت جھوٹ سے تھی' اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے پاس غلط بیانی کرتا تو آنحضرت ﷺ کے دل پر اس وقت تک اس کا اثر رہتا تھا جب تک حضور ﷺ کو یقین نہ ہو جاتا کہ اس نے توبہ کر لی ہے۔

مسند احمد کی روایت میں ہے ''رسول اللہ ﷺ کے دل میں اس سے ناراضگی رہتی''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اگر حضور کو اپنے کسی صحابی سے اس قسم کی کوئی

چیز معلوم ہوتی تو حضور ﷺ اس سے کبیدہ خاطر رہتے' حتیٰ کہ معلوم ہو جائے کہ اس نے توبہ کر لی ہے''۔

## غلطی پر اَڑ جانے والے کو بددعا دینا:

امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص نے بائیں ہاتھ سے کھایا' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''دائیں ہاتھ سے کھاؤ'' اس نے کہا: ''میں نہیں کھا سکتا'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تو نہ کھا سکے''۔ اس کے بعد اس کا دایاں ہاتھ اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکا۔

## غلطی کی طرف اشارہ کر کے باقی تفصیل بیان کرنے سے گریز کرنا:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۖ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝۳﴾ (التحریم)

''اور جب نبیؐ نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی' پھر جب اُس نے اس کو افشا کر دیا اور اللہ نے نبیؐ کو اس سے آگاہ کر دیا' تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا پھر جب نبیؐ نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا: ''آپ ﷺ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا: مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جاننے والا اور خوب باخبر ہے''۔

قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر ''محاسن التاویل'' میں فرمایا:

''اور جب نبیؐ نے'' یعنی حضرت محمد ﷺ نے ''اپنی ایک بیوی سے'' حفصہؓ سے ''راز کی بات کہی'' یعنی لونڈی کو' یا اللہ کی حلال کردہ کسی اور چیز کو' اپنی ذات پر حرام

کرنے کی بات بتائی'' جب اُس نے اس کو افشا کر دیا'' یعنی اس نے وہ راز کی بات اپنی ساتھی حضرت عائشہ کو بتا دی ''اور اللہ نے پیغمبر کو اس سے آگاہ کر دیا'' یعنی آپ ﷺ کو اطلاع دے دی کہ اُس نے اسے بات بتادی ہے ''تو پیغمبرؐ نے اس بیوی کو وہ بات کچھ تو بتائی'' یعنی انہوں نے جو راز افشاء کیا تھا' ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ کچھ بات بتائی ''اور کچھ نہ بتائی'' یعنی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ بات نہ بتائی۔

**نوٹ:** الاکلیل میں ہے: ''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کسی آشنا یعنی بیوی یا دوست وغیرہ کو راز کے طور پر کوئی بات بتانے میں کوئی حرج نہیں اور اس (ہم راز) کے لئے ضروری ہے کہ اس راز کو محفوظ رکھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیویوں سے حسن سلوک کرنا چاہئے اور ڈانٹ ڈپٹ میں بھی نرمی کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور (غلطی کرنے والے کو جتانے کے لئے) غلطی کی پوری تفصیل ذکر کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے''۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''شریف آدمی کبھی تفصیل میں نہیں جاتا''۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''شریف لوگ ہمیشہ تغافل سے کام لیتے ہیں''۔

## غلطی کے ازالے میں مسلمان کی مدد کرنا:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ہم نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا: ''یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا''۔ فرمایا: ''کیا ہوا؟'' اس نے کہا: میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے مباشرت کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں ایک غلام دستیاب ہے جسے تم آزاد کر دو؟۔ اس نے عرض کیا: جی نہیں۔ فرمایا: کیا تم مسلسل دو ماہ کے روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے کہا: جی نہیں۔ فرمایا: کیا تمہارے پاس اتنا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو؟ اس نے کہا:

جی نہیں۔ نبی اکرم ﷺ وہیں تشریف فرما رہے' اسی اثناء میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک ٹوکرا پیش کیا گیا' جس میں کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: سائل کہاں ہے؟ اُس نے کہا: جی میں ہوں۔ فرمایا: یہ لے کر صدقہ کردو۔ وہ بولا: اللہ کے رسول! کیا اپنے سے زیادہ غریب آدمی پر صدقہ کروں؟ اللہ کی قسم! سنگریزوں والے دونوں قطعات کے درمیان (یعنی پورے مدینہ میں) مجھ سے غریب گھر موجود نہیں''۔ آنحضرت ﷺ کھل کر مسکرائے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے نوکیلے دانت نظر آنے لگے' پھر فرمایا اپنے گھر والوں کو کھلا دینا۔

## غلطی کرنے والے سے مل کر تبادلۂ خیال کرنا:

مسند احمد کی روایت میں واقعہ وضاحت سے بیان ہوا ہے اور اس روایت میں کئی نکات بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میرے والد نے قریش کی ایک عورت سے میرا نکاح کر دیا' جب وہ رخصت ہو کر میرے گھر آئی تو میں اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا' کیونکہ میں اپنے اندر عبادت یعنی نماز اور روزے کی طاقت محسوس کرتا تھا۔ (ایک دن) حضرت عمرو بن عاصؓ اپنی بہو کے پاس آئے اور اس سے پوچھا: ''تم نے اپنے خاوند کو کیسا پایا؟'' اس نے کہا: بہت اچھا آدمی ہے' نہ اُس نے ہمارا کپڑا اٹھایا' نہ ہمارے بستر پر آئے۔ انہوں نے میرے پاس آ کر مجھے بہت سرزنش کی اور فرمایا: میں نے تمہارا نکاح قریش کی اونچے حسب نسب والی عورت سے کیا' تو نے اس سے کنارہ کشی کر لی اور تو نے یہ کیا' وہ کیا؟ (یعنی انہوں نے بہت برا بھلا کہا) پھر وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میری شکایت کی۔ آنحضرت ﷺ نے مجھے بلا بھیجا۔ میں حاضر ہوا تو فرمایا: دن کو روزہ رکھتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: رات کو قیام کرتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ پھر فرمایا: لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں' جو میرے طریقے سے بے

رغبتی کرے گا وہ مجھ سے نہیں' پھر فرمایا: ہر مہینے ایک بار قرآن پڑھا کرو۔ میں نے عرض کیا: میں اپنے آپ میں اس سے زیادہ قوت محسوس کرتا ہوں۔ فرمایا: تب دس دن میں قرآن پڑھ لیا کرو۔ میں نے کہا: میں خود کو اس سے زیادہ قوی سمجھتا ہوں۔ فرمایا: تو تین دن میں پڑھ لو۔ اس کے بعد فرمایا: ہر مہینے میں تین روزے رکھو۔ میں نے کہا: میں اس سے زیادہ قوت رکھتا ہوں۔ آپ اضافہ کرتے رہے حتیٰ کہ فرمایا: ایک دن روزہ رکھو' ایک دن نہ رکھو' یہ سب سے افضل روزہ ہے اور یہ میرے بھائی داؤد کا روزہ ہے' پھر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر عبادت کرنے والے کا ایک جوش ہوتا ہے اور ہر جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے' جوش کے ٹھنڈا پڑنے پر وہ شخص یا تو سنت پر قائم رہتا ہے یا بدعت اختیار کر لیتا ہے' تو جو شخص جوش ٹھنڈا ہونے پر بھی سنت پر عمل کرتا ہے وہ ہدایت پا جاتا ہے اور جو شخص جوش ٹھنڈا ہونے پر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے''۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب عبداللہ بن عمروؓ بوڑھے اور کمزور ہو گئے' تو (یہ طریقہ اختیار کیا کہ) مسلسل کئی دن روزے رکھتے رہتے' پھر اسی تعداد کے مطابق (مسلسل روزہ چھوڑ دیتے تاکہ کچھ قوتِ حاصل ہو جائے۔ انہوں نے فرمایا: اسی طرح تلاوت کے حصہ میں بھی کمی بیشی کر لیتے تھے لیکن (مجموعی طور پر) مقدار پوری کر کے سات دن میں یا تین دن میں قرآن مجید پڑھ لیتے۔ انہوں نے فرمایا: بعد میں وہ کہا کرتے تھے: اگر میں رسول اللہ ﷺ کی رخصت قبول کر لیتا تو وہ موجودہ متبادل صورت سے بہتر ہوتا' لیکن میں رسول اللہ ﷺ سے جو کام کرتے ہوئے جدا ہوا ہوں' اب اسے چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

### واقعہ سے مستنبط بعض مسائل:

☆ نبی اکرم ﷺ نے اس سبب کی طرف توجہ فرمائی جس کی وجہ سے مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ یعنی عبادت میں اس حد تک انہماک کہ بیوی کے حقوق کی ادائیگی کے لئے

وقت نہ بچا جس کے نتیجے میں کوتاہی کا ارتکاب ہوا۔

☆ ''ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو''۔ یہ قاعدہ ہر اُس شخص پر منطبق ہوتا ہے جو نیکی کے کاموں میں حد سے زیادہ مشغول ہو۔ مثلاً وہ طالب علم جو بہت زیادہ اسباق پڑھتا ہے اور وہ مبلغ جو تبلیغ میں اس حد تک منہمک ہو جاتا ہے کہ بیوی کو تکلیف ہوتی ہے اور اسے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نیکی کے مختلف کاموں کی ادائیگی میں توازن قائم نہیں رہتا اور وقت کو مستحقین میں تقسیم کرنے پر عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے' لہٰذا مناسب ہے کہ طالب علم اپنے اسباق کے اوقات میں سے اور مبلغ اپنی مصروفیت میں سے اتنی تخفیف کرے کہ گھر کے انتظام اور بیوی بچوں کے حقوق مثلاً اصلاح و تربیت وغیرہ کے لئے کافی وقت بچ سکے۔

## صاف طور پر اس کی غلطی بتا دینا:

صحیح بخاری میں حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میرا کسی آدمی سے جھگڑا ہو گیا' اس کی ماں عجمی تھی' میں نے اس کو ماں کا طعنہ دیا' اس نے نبی ﷺ کو بتایا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: فلاں شخص سے تمہارا گالی گلوچ ہوا؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: تم نے اس کی ماں کو برا کہا؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ میں نے کہا: اس بڑھاپے میں بھی؟ فرمایا: ہاں' وہ (غلام) تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے قبضے میں دے دیا ہے' تو جس کے قبضہ میں اللہ نے اس کے بھائی کو کیا ہو' اسے چاہئے کہ جو خود کھائے اسے کھلائے اور جو خود پہنے اسے پہنائے اور اسے اس کام میں نہ لگائے جو اس پر غالب آ جائے (انتہائی دشوار ہو) اور اگر اسے کسی ایسے کام میں لگائے جو اس پر غالب آئے تو اس کی ادائیگی میں اس کی مدد بھی کرے''۔

بعض اوقات عالم غلطی پر صراحت سے تنبیہ کرنے سے اجتناب کرتا ہے' جب

کہ اس طریقہ کے استعمال میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہونے کا خطرہ ہو' یا کوئی بڑا فائدہ ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہو۔ مثلاً غلطی کرنے والا معاشرہ میں ممتاز مقام کا حامل ہے یا کسی بلند عہدے پر فائز ہے جس کی وجہ سے وہ اس اسلوب سے کی ہوئی تنقید برداشت نہیں کرتا' یا خطرہ ہے کہ صراحت کرنے پر غلطی کرنے والا اپنے آپ کو سخت مشکل میں محسوس کرے گا' یا وہ اس قدر حساس طبیعت کا مالک ہے کہ اس سے منفی ردعمل سرزد ہونے کا امکان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلطی کرنے والا صراحت کے اسلوب کو پسند نہیں کیا کرتا' اور اسے برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس میں سامنے ہو کر بات کی جاتی ہے اور تنقید کرنے والا گویا استاد جیسے بلند مقام پر فائز محسوس ہوتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں غلطی کرنے والا ایک نقص کا حامل اور کم تر مقام پر نظر آتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ گھما پھرا کر بات کرنے کے بھی منفی پہلو موجود ہیں' جو بعض اوقات صراحت کے اسلوب سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں' کیونکہ غلطی کرنے والا یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اسے کم عقل سمجھ کر تضحیک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے' ممکن ہے وہ اشاروں کنایوں کی وجہ سے پریشانی محسوس کرے' کیونکہ وہ انہیں طنز اور ذہنی اذیت سمجھتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے جو بات سمجھانا مقصود ہے وہ اسے سمجھ ہی نہ سکے' کیونکہ کلام کا اصل مقصد پوشیدہ ہے اور غلطی کرنے والے کا ذہن اس تک نہیں پہنچ سکا' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غلطی پر قائم رہے گا۔ ویسے بھی ہر شخص میں قبولیت کی طرف میلان ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مزید برآں ایک شخص کے لئے ایک انداز بہتر ہوتا ہے' دوسرے آدمی کیلئے کوئی دوسرا اسلوب بہتر ہوتا ہے' البتہ یہ بات ہر حال میں درست ہے کہ تبلیغ کی کامیابی میں رہنمائی کرتے وقت حسن خلق کا اثر سب سے زیادہ ہے۔

## غلطی کرنے والے کو قائل کرنے کی کوشش کرنا:

غلطی کرنے والے کو قائل کرنے کے لئے اس سے تبادلۂ خیال کی کوشش کا یہ

فائدہ ہوتا ہے کہ اس طرح اس کی عقل پر سے وہ پردہ ہٹ جاتا ہے جو حق کی قبولیت میں رکاوٹ کا باعث ہوتا ہے' چنانچہ آدمی سیدھی راہ قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

سنت نبویؐ میں سے اس کی ایک مثال طبرانی کی وہ حدیث ہے جو حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ ایک نوجوان لڑکا جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اور کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجئے''۔ لوگوں نے بلند آواز سے اسے منع کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے (حاضرین سے) فرمایا: ''بس کرو'' پھر فرمایا: اسے سکون سے بیٹھنے دو۔ اور اسے فرمایا: قریب آجاؤ وہ قریب آ گیا حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کے بالکل سامنے آ بیٹھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا: کیا تم اپنی والدہ کے لئے یہ چیز پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا: جی نہیں۔ فرمایا: اسی طرح لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے یہ چیز پسند نہیں کرتے کیا تم اپنی بیٹی کے لئے یہ چیز پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا جی نہیں۔ فرمایا اسی طرح لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے کیا تم اپنی بہن کے لئے یہ پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا: جی نہیں۔ فرمایا: اسی طرح لوگ بھی اپنی بہنوں کے لئے یہ چیز پسند نہیں کرتے کیا تم اپنی پھوپھی کے لئے یہ بات پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا جی نہیں۔ فرمایا: اسی طرح لوگ بھی اپنی پھوپھیوں کے لئے پسند نہیں کرتے' کیا تم اپنی خالہ کے لئے یہ پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا جی نہیں۔ فرمایا: اسی طرح لوگ بھی اپنی خالاؤں کے لئے پسند نہیں کرتے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اپنا مبارک ہاتھ اس کے سینے پر رکھا اور فرمایا:

**((اللهم كفر ذنبه وطهر قلبه وحصن فرجه))**

''اے اللہ! اس کا گناہ معاف کر دے' اس کے دل کو پاک کر دے اور اسے پاک دامنی بھی عطا فرما''۔

## غلطی کرنے والے کو احساس دلانا کہ اس کا عذرِ لنگ نا قابل قبول ہے:

بعض اوقات غلطی کرنے والا من گھڑت اور نا قابل قبول وجوہات تراش کر اپنی

غلطی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے' خصوصاً جب کہ معاملہ اچانک ظاہر ہو جائے اور وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہ ہو۔ بعض اوقات جھوٹا بہانہ کرتے ہوئے زبان اٹکتی ہے' خاص طور پر جب آدمی صاف دل والا ہو اور اسے جھوٹ بولنا نہ آتا ہو۔ اگر مربی کے سامنے اس قسم کے آدمی کا کوئی معاملہ آئے تو وہ کون سا طریق کار اختیار کرے؟ مندرجہ ذیل قصہ اگر صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو اس سے نبی اکرم ﷺ کا اپنے ایک صحابی کے ساتھ بڑا خوبصورت اور مبنی بر حکمت موقف سامنے آتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مربی کس طرح غلطی کرنے والے کو ایک تسلسل کے ساتھ غلطی کا احساس دلا سکتا ہے' حتیٰ کہ وہ اپنی غلطی سے دستبردار ہو کر اصلاح کر لے۔

یہ تربیت کا ایک عمدہ درس ہے' اور ایسے پُر حکمت طریق کار کی مثال ہے جس سے مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو گیا۔ اس واقعہ سے مندرجہ ذیل مسائل بھی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

☆ مربی کی ایک ہیبت ہے' چنانچہ جب وہ غلطی کے مرتکب کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ شرم محسوس کرتا ہے۔

☆ مربی کے سوالات باوجود مختصر ہونے کے اور مربی کی نظریں بہت کچھ سمجھا دیتی ہیں اور ان کا دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

☆ من گھڑت عذر' جس میں واضح خلل اس کو غلط ثابت کر رہا ہے' اسے سن کر بحث نہ کرنا اور عذر کرنے والے سے اعراض کر لینا' یہ احساس دلانے کے لئے کافی ہے کہ اس کا عذر قبول نہیں ہوا اور یہ چیز اُسے توبہ اور معذرت کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ نکتہ اس حدیث کے ان الفاظ سے ظاہر ہے: ''حضور ﷺ چل دیئے''۔

☆ اچھا مربی وہ ہے جو غلطی کرنے والے کے دل میں حیاء کا احساس بھی پیدا کر دے جس کی وجہ سے وہ اس سے روپوش رہنا چاہتا ہے اور یہ احساس بھی پیدا

کرے کہ اسے اس کے پاس حاضر ہونے کی ضرورت ہے اور آخرکار دوسرا احساس پہلے پر غالب آجائے۔

☆ اس قسم کے حالات میں جب غلطی کا مرتکب اپنا موقف تبدیل کر لیتا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کا معترف ہے اور اس سے رجوع کر رہا ہے۔

## انسان کی فطری کمزوریوں کو پیش نظر رکھنا:

اس کی ایک مثال عورتوں اور خصوصاً سوکنوں میں رقابت کا جذبہ ہے۔ بعض اوقات اس جذبہ کے زیر اثر عورت سے ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ اگر کسی اور انسان سے عام حالات میں سرزد ہو تو اس سے بالکل مختلف طریقے سے سلوک کیا جائے۔ سنن نسائی میں حضرت اُم سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے لئے ایک چوڑے برتن میں کھانا لائیں۔ (اتنے میں) حضرت عائشہ آ گئیں۔ انہوں نے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی اور ان کے پاس ایک پتھر تھا' انہوں نے پتھر مار کر برتن توڑ دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے برتن کے دونوں ٹکڑوں کو ملا کر رکھا اور دو بار فرمایا: کھاؤ' تمہاری ماں کو غیرت آ گئی تھی''۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ کا برتن لے کر حضرت اُم سلمہ کے ہاں بھیج دیا اور حضرت اُم سلمہ کا (ٹوٹا ہوا) برتن حضرت عائشہ کو دے دیا۔

☆ غلطیوں کی اصلاح لازمی ہے اور اہم بھی اور یہی دینی خیر خواہی کی ایک صورت اور نہی عن المنکر کا ایک جزء ہے' لیکن یہ فریضہ کا صرف ایک جزء ہے' کیونکہ دین میں صرف نہی عن المنکر نہیں' امر بالمعروف بھی شامل ہے۔

☆ تربیت صرف غلطیوں کی اصلاح کا نام نہیں بلکہ اس میں دین کے اصول وقواعد اور شرعی احکام بتانا' سمجھانا اور سکھانا بھی شامل ہے اور افراد کے ذہن میں ان تصورات کو واضح اور راسخ کرنے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرنے کی

ضرورت ہوتی ہے' مثلاً عملی نمونہ پیش کرنا' وعظ و نصیحت کرنا' واقعات اور کہانیاں سنانا' وغیرہ۔ بعض والدین' اساتذہ اور تربیت کرنے والوں سے یہ کوتاہی سرزد ہوتی ہے کہ پوری توجہ غلطیوں کی تلاش اور ان کے علاج کی طرف مبذول کر دیتے ہیں اور بنیادی تصورات کی تعلیم کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کرتے' حالانکہ بے راہ روی اور غلطیوں کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے حفاظتی اقدامات اختیار کرنے سے ان کی مقدار کم ہوسکتی ہے' بلکہ یہ ختم بھی ہوسکتی ہیں۔

☆ مذکورہ بالا واقعات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غلطیوں کی اصلاح کے لئے جو اقدامات فرمائے ہیں' ان میں بہت تنوع پایا جاتا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حالات اور افراد کے بدلنے سے اصلاح کا اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس معاملہ میں نبی اکرم ﷺ کی اقتداء کرنا چاہتا ہے وہ پیش آنے والے واقعات میں تفقہ اور اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ان نظائر کو سامنے رکھتا ہے اور مسئلہ کو اس سے مشابہ مسئلہ پر قیاس کر کے وہ اسلوب منتخب کر لیتا ہے جو کسی خاص موقع کے لئے زیادہ مناسب ہو۔

# ۶

# حکمت تعلیم وتربیت

## باب : ⑥

خالقِ کائنات نے تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا۔ خالق نے خود فریضۂ معلمی سرانجام دیتے ہوئے آدم علیہ السلام کو علم الاسماء سکھایا' وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا اس کے بعد خالق نے اپنی مخلوق کے ہر ہر فرد' مرد و عورت کے لئے تعلیم و تربیت کا ایک ایسا اعلیٰ و ارفع سلسلہ جاری فرمایا جو اپنے دامن میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل لئے ہوئے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہر نبی کا بنیادی منصب معلم ہی کا رہا ہے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے اسی کا اظہار ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً)) ''بے شک مجھے معلم مبعوث کیا گیا ہے'' کہہ کر کیا اور اس سلسلہ کی آخری کڑی کو خود خالق نے بھی معلم کتاب و حکمت فرمایا: ﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

آپ ﷺ نے انسانیت کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک خاص حکمت سے کام لیا یہ حکمت عملی بے حد مؤثر ثابت ہوئی کہ ''نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر''۔ اسلامی تعلیماتِ مقبول عام ہو گئیں۔ آپ ﷺ کی اس حکمت عملی کی تاثیر کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے معاشرے میں تعلیم و تربیت کا کام سرانجام دیا جہاں تعلیم کا رواج نہ تھا' پورا معاشرہ جاہل تھا اور لوگ اس (جہالت) پر فخر کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے جو طریقۂ تدریس اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ پرلے درجے کے جاہل عالم بن گئے پھر انہوں نے آپ کی میراث کا حق اس طرح ادا کیا کہ عرب و عجم کے کونے کونے میں پھیل گئے اور علم کی شمعیں روشن کر دیں' یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کو معلم کامل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

معلم کامل حضرت محمد ﷺ کے اسوۂ مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ

درس وتدریس میں فطرت انسانی کے اہم تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔عمل تدریس میں ہمیشہ وقت' حالات اور ماحول کے مطابق اپنے متعلمین کی طبعی اور ذہنی استعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے انداز تعلیم اور اسلوب خطابت کو اپناتے تھے۔

معلم کو عملِ تدریس میں مختلف قسم کے طلبہ سے سابقہ پیش آتا ہے۔ایک ہی وقت میں معلم کو ذہین وفطین' درمیانہ درجے متوسط ذہین' کند ذہن' تعلیم میں غیر سنجیدہ' شرارتی اور نفسیاتی مشکلات میں پھنسے ہوئے طلبہ سے واسطہ پڑتا ہے۔تدریس کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ معلم تمام طلبہ کا خیال رکھے اور ان سب کو حتی الامکان ساتھ لے کر چلے۔اس مقابلہ میں ایک خاص بات یہ پیش نظر رکھی گئی ہے کہ بیان میں جدید لٹریچر کی اصطلاحات کو اپنایا گیا ہے تاکہ فہم آسانی سے ہو سکے۔ چنانچہ ذیل میں حضور ﷺ کی تعلیمی وتدریسی حکمت عملی سے متعلق چند اہم گوشے دیئے گئے ہیں:

## ① آسان سے مشکل کی طرف اقدام:

تعلیم وتدریس اور تعلم کے مختلف پہلو ہیں۔بعض پہلو ایک اعتبار سے آسان ہوتے ہیں اور دیگر اعتبار سے مشکل۔ طالب علم کے سامنے سہل پہلو سے آغاز کیا جائے تو اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ وہ اس میں اجنبیت اور دشواری محسوس نہیں کرے گا اور آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہوکر اس کے نرم وسخت سب کو قبول کر لے گا۔اس کے برعکس اگر تدریس کا آغاز آسان کے بجائے مشکل سے کیا جائے تو متعلم کو بعض اوقات فہم میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ متعلم تعلیم سے باغی ہو جائے۔معلم کامل ﷺ نے اپنے ان رفقاء کو جو کار معلمی میں دلچسپی رکھتے اور شریک (involve) رہتے تھے مختلف ہدایات دیں ان میں سے ایک اہم بات آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

**فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین**

''یعنی تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو۔ دشواری پیدا کرنے والا بنا کرنہیں بھیجے گئے''۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجتے وقت یہ ہدایت کی:

**یسرا ولا تعسر بشرا ولا تنفرا**

تم دونوں وہاں کے لوگوں کے سامنے دین کو اتنی خوبصورتی سے پیش کرنا کہ وہ انہیں آسان معلوم ہو' ایسا ڈھنگ نہ اختیار کرنا جس کے نتیجہ میں دین کو لوگ دشوار محسوس کرنے لگیں اور لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا اور انہیں اپنے سے متنفر مت کرنا۔

## کسی چیز کا پس منظر بیان کرنا:

نفسیاتی اعتبار سے یہ بات کافی اہم ہے اور تدریس کے مؤثر ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ معلم معلوم سے نامعلوم کی طرف اقدام کرے۔ اس اصول کے تحت معلم کو اپنا سبق شروع کرنے سے پہلے طلبہ کی اس سبق سے متعلق سابقہ واقفیت' علم اور تجربات کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ سبق کی کامیابی کا دارومدار متعلم کی دلچسپی پر ہوتا ہے' معلوم سے نامعلوم کی طرف اقدام سے سبق میں دلچسپی قائم رہتی ہے' سابقہ معلومات کی بنا پر سبق کو عمدہ طریقے سے مرتب کیا جا سکتا ہے اور نئے و پرانے سبق کے درمیان ربط پیدا ہوتا ہے' جس سے نئے سبق کو جلد سیکھنے میں مدد ملتی ہے اور جدید ریسرچ سے بھی یہی پتہ چلا ہے کہ معلوم اور نامعلوم اشیاء میں جو اختلاف اور مشابہت پائی جاتی ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ کا یہ اصول جو دور جدید کی دریافت سمجھا جاتا ہے اسوۂ رسول ﷺ کی صورت میں آج سے چودہ سو سال قبل اپنی افادیت کے ساتھ کارفرما رہا ہے مثلاً:

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی یہ بتائے اگر کسی کے دروازے پر نہر بہہ رہی ہو اور وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ غسل

کرتا ہے تو اس کے جسم پر میل باقی رہے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا اس کے بدن پر میل ایسی حالت میں نہیں رہے گا' تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا پانچ مرتبہ کی نماز کی یہی کیفیت ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے آدمی کے گناہ (صغیرہ) معاف فرما دیتا ہے۔

## مقرون سے مجرد کی طرف:

مقرون اشیاء کا تدریس میں استعمال' تدریس کو مؤثر بنانے میں کافی مدد دیتا ہے۔ مقرون اشیاء کے استعمال سے چھوٹے بچوں میں سیکھنے کا عمل آسان اور تیز ہو جاتا ہے اس سے تدریس میں دلچسپی قائم کر کے مقصد بہتر طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ دیکھی بھالی چیزوں کی مدد سے مجرد تصورات کو آسانی سے سمجھ سکتی ہے۔ حضور ﷺ نے اس طریقے کو منفرد انداز میں استعمال کیا اور ہمیشہ صحابہؓ کی تعلیم میں حسب ضرورت اس اصول کا اہتمام فرمایا۔

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں نکلے۔ ان دنوں پت جھڑ لگی ہوئی تھی آپ ﷺ نے ایک درخت کی ٹہنیاں پکڑیں اور ہلائیں تو پتے ٹہنیوں سے گرنے لگے۔ آپ ﷺ حضرت ابو ذرؓ سے مخاطب ہوئے۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا: میں حاضر ہوں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مسلمان خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نماز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جس طرح درخت کے پتے۔

## اصول تدریج:

فطرتِ انسانی کسی بھی بات کو ایک دم قبول نہیں کرتی۔ انسانوں کے طبعی رجحان کے مطابق ان کی صلاحیت اور ضرورت کے مطابق تدریج سے کوئی بات پیش کی جائے تو اسے قبول کیے جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے لہٰذا معلم کو تدریس میں انسانی ضرورتوں اور طبعی رجحانات کا خیال رکھنا چاہیے ورنہ متعلم تدریس کو اپنے اوپر بار

محسوس کرے گا' اس سے عملِ تدریس متاثر ہوگا اور مقاصد تدریس پورے نہیں ہو سکیں گے اس طرح یہ ایک فطری طریقۂ تدریس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انسانیت کی تعلیم کے لئے اس بات کا اہتمام فرمایا اور قرآن کریم سارے کا سارا یک وقت نہیں اتارا بلکہ انسانوں کی ضرورتوں اور طبعی رجحانات کا خیال رکھتے ہوئے تدریجاً نازل فرمایا یہاں تک کہ یہ سلسلہ تقریباً ۲۳ سال جاری رہا۔ ایک بار تمام احکامات نازل فرما کر لوگوں کو ہلا نہیں دیا' بلکہ پہلے انہیں بنیادی باتوں کی تعلیم دی اور بعد ازاں آہستہ آہستہ مکمل احکامات نازل فرمائے۔ استاد کو اپنی حکمتِ تدریس میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے' یہ ایک ایسی فنی مہارت ہے جس میں ہر معلم کو طاق ہونا چاہئے۔ یوں اصول تدریج کوئی دورِ جدید کی ایجاد نہیں بلکہ یہ خدا کی سنت ہے جسے حضور ﷺ نے اپنی حکمتِ تدریس میں پورے طور پر ملحوظ رکھا اور نفسیاتی اصول کو تدریس میں اپنایا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ بنؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا تمہارا اگزر اہل کتاب کی ایک قوم پر سے ہوگا جب تو ان کے پاس پہنچے تو ان سے کہو! کہ وہ گواہی دیں اس بات کی کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور بھیجے ہوئے رسول ہیں' اگر وہ تیرا کہا مان لیں تو پھر ان سے کہو کہ اللہ نے ان پر ایک دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں' اگر وہ تیرا کہا مان لیں تو پھر ان سے کہو کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو مال داروں سے لیا جاتا ہے اور انہی میں سے مفلسوں اور محتاجوں کو دیا جاتا ہے' اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ مظلوم کی بددعا سے بچیں۔ گویا آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو دعوت و تدریس میں تدریج کا انداز اختیار کرنے کا حکم دیا۔

### ④ طالب علم کی تدریس سے وابستگی:

تدریس میں معلم کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہئے کہ طالب علم کی تدریس سے

وابستگی قائم رہے۔ کسی بھی موقع پر طالب علم میں تدریس سے وابستگی میں کمی ہونے کا اندیشہ پیدا ہو تو معلم کو اس صورت حال کا ازالہ کر کے اپنا کام آگے بڑھانا چاہئے۔ اس کے لئے معلم کئی طریقے اختیار کر سکتا ہے۔

① کوئی چونکا دینے والی بات بیان کی جاسکتی ہے۔
② کبھی مخاطبین سے آسان اور دلچسپ سوال پوچھا جا سکتا ہے۔
③ کوئی بات تحریر میں لا کر توجہ مرکوز کی جاسکتی ہے۔
④ بعض اوقات تنبیہ کر کے یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔
⑤ سمعی و بصری معاونات کا استعمال کر کے وابستگی برقرار رکھی جاسکتی ہے۔

آپ ﷺ تعلیم میں ان امور کا بدرجہ اتم خیال فرماتے تھے مثلاً ایک موقع پر آپ ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ جا رہے تھے' راہ چلتے آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرے ساتھی سے یہ کہتے سن لیا کہ اس شخص کو دیکھ اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک دیا تھا مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک یہ کتے کی موت نہ مار دیا گیا' کچھ دور آگے جا کر ایک گدھے کی سڑی ہوئی لاش نظر آئی' حضور ﷺ رک گئے اور ان دونوں اصحاب کو بلا کر فرمایا اتریئے اور اس گدھے کی لاش تناول فرمائیے' ان دونوں اصحاب نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اسے کون کھائے گا؟ فرمایا ابھی ابھی آپ لوگ اپنے بھائی کی عزت پر جو حرف زنی کر رہے تھے وہ اس گدھے کی لاش کھانے سے بھی بہت زیادہ بری تھی۔

اس واقعہ میں حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کی تعلیم میں نہایت حکیمانہ انداز اختیار فرمایا۔ مزید برآں نفسیاتی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا' جب آپ ﷺ نے انہیں مردہ گدھے کا گوشت کھانے کو کہا تو صحابہؓ چونک اٹھے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے پرسوال کا طریقہ بھی اس موقع پر اختیار فرمایا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے مردہ گدھے کو تدریس کے لئے بطور بصری معاونت بھی استعمال کیا اور غیبت نہ کرنے کی تعلیم

بذریعہ تنبیہ بھی دی گئی۔ الغرض معلم مختلف انداز اپنا کر طالب علم کی تعلیم سے وابستگی کو برقرار رکھ سکتا ہے لیکن ان تمام امور میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ تدریس کا سارا سلسلہ حصولِ مقصد سے منسلک رہے آپ ﷺ کی معلمانہ حکمت عملی میں یہ بات عام طور پر ملتی دکھائی دیتی ہے۔

## اصول آمادگی:

مؤثر تدریس کے لئے اس بات کا اہتمام ضروری ہے کہ طالب علم تعلیم کے لئے آمادہ ہو صرف اسی صورت میں تعلیم میں اس کی دلچسپی برقرار رکھی جا سکتی ہے عام طور پر اصول آمادگی سے لاعلمی یا اس کے استعمال کی پرواہ کئے بغیر درس و تدریس کا کام انجام دیا جاتا ہے' اس سے نہ صرف تدریس غیر مؤثر ہوتی ہے بلکہ مجموعی تعلیمی ماحول بھی منفی طور پر متاثر رہتا ہے۔ مزید برآں تعلیم میں طلبہ کی دلچسپی' توجہ اور انہماک برقرار نہیں رہتا اور ایک طرح کا جبر کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ طلبہ کو لکھنے پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لئے اساتذہ عموماً انہیں ڈراتے دھمکاتے اور جبر و تشدد سے کام لیتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر کئی طالب علم تعلیم سے ہی بھاگ جاتے ہیں۔ معلم کامل ﷺ نے اپنی پوری معلمانہ زندگی میں اصول آمادگی کے اس نفسیاتی اصول کے استعمال کا ہمیشہ لحاظ رکھا جس کی شہادت متعدد احادیث سے ملتی ہے مثلاً ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن پڑھو جب تک تمہارے دل اس کی خواہش کریں اور جب دل اچاٹ ہو جائے یا دل کی آمادگی کم ہو جائے تو پڑھنا موقوف کر دو۔

ایک اور حدیث ہے: ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو رمضان میں عبادت کرنے کے لئے نیکی کی طرف آمادہ فرماتے تھے لیکن جبر سے کسی بات کا حکم نہیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے جو شخص کھڑا ہو رمضان کی راتوں میں ایمان اور احتساب کے ساتھ (ثواب کے لئے) اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے ارشاد

فرمایا کہ میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جو تمام اعمال میں سب سے بہتر ہے اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور تمہارے درجوں کو بہت زیادہ بلند کرنے والی ہے اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی زیادہ اچھی ہے اور یہ کہ تم دشمنوں کو قتل کرو اور وہ تم کو قتل کریں اس سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا' ضرور بتائیں' آپ ﷺ نے فرمایا وہ چیز اللہ کا ذکر ہے یعنی آپؐ نے پہلے اس بات کو مؤثر طور پر صحابہ کو سمجھانے کے لئے ان کو اس کے لئے آمادہ کیا اس کی اہمیت کو کئی باتوں کی مدد سے واضح کیا اور پھر اصل بات ارشاد فرمائی۔

## اختصار و جامعیت کا اہتمام:

سبق میں غیر ضروری تکرار اور بے جا طوالت سے طلباء بیزار ہو جاتے ہیں۔ معلم کامل ﷺ کا فرمان ہے کہ جب نصیحت کرو تو مختصر کرو۔ بعض روایات میں خطبے کے اختصار کو خطیب کی دانشمندی کی علامت قرار دیتے ہوئے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض خطابات جادو جیسا اثر رکھتے ہیں اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لیکچرز مختصر اور جامع و بلیغ ہونے چاہئیں تاکہ جادو کی طرح دلوں پر اتر جائیں نہ کہ سننے والے کی طبیعت کو کند کر دیں کہ اس میں کسی بات کو سننے اور اس کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ معلم کو تدریس میں اختصار و جامعیت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتا تھا' آپ ﷺ کی نماز بھی معتدل ہوتی تھی اور خطبہ (لیکچر) بھی معتدل ہوتا تھا اس میں نہ غیر ضروری طوالت ہوتی تھی نہ بہت اختصار۔

## تدریس میں تکرار:

تعلیم و تدریس میں اصول تکرار کو علم نفسیات کے ماہرین نے خاص اہمیت دی ہے۔ اس اصول کے مطابق کسی بات کو بار بار دہرایا جاتا ہے بار بار کی دہرائی گئی

طرح سے مفید ہے:

① انسانی توجہ مرکوز رہتی ہے۔

② یاد کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

③ تعلیم کو پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جب پہلی بار آواز ہمارے کانوں میں پڑتی ہے تو اس کی لہروں کا عکس ہمارے دماغ کے پردے پر پڑتا ہے جب دوسری بار یہی آواز پڑتی ہے تو وہ نقش گہرا ہو جاتا ہے اور اگر بار بار یہ عمل دہرایا جائے تو بات پختہ ہو جاتی ہے۔ حضرت رسول کریم ﷺ نے جس بات پر زور دینا ہوتا یا کسی اہم باتؐ کی تعلیم دینا ہوتی تو اس کو تین بار دہراتے۔ اسی طرح اگر مخاطب کم فہم ہوتا تو آپ ﷺ بات کو بار بار دہرا دیتے تھے۔

**كان النبى ﷺ اذا تكلم بكلمة اعادها ثلاثا حتى تفهم منه**

''آنحضرت ﷺ کوئی بات فرماتے تو اسے تین بار دہراتے تھے تاکہ خوب سمجھ میں آ جائے''۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم! وہ صاحب ایمان نہیں خدا کی قسم! وہ صاحب ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہیں، صحابہ کرامؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ ﷺ؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔

## تشبیہات کا استعمال:

معلم کامل حضرت محمد ﷺ کی تدریسی حکمت عملی کا ایک منور گوشہ یہ تھا کہ آپ ﷺ بات کو سمجھانے کے لئے اور خوب ذہن نشین کرنے کے لئے تشبیہ کا استعمال کرتے تھے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے منافق اور مؤمن کے فرق کو تشبیہ دے کر نہایت ہی خوبی سے واضح کر دیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مؤمن قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے اس کی مثال سنگترے کی سی ہے کہ اس کا مزا بھی اچھا ہے اور

خوشبو بھی اچھی ہے اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا مگر عمل کرتا ہے وہ کھجور کی مانند ہے کہ اس کا مزا اچھا اور بُو کچھ نہیں اور منافق آدمی کی مثال ایسے ہے کہ وہ صرف قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور اس کی کیفیت نیاز بو کی سی ہے کہ اس کی خوشبو اچھی ہے مگر مزا کڑوا' اور اس منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اندرائن کی طرح ہے جس کا مزا بھی برا ہے اور بو بھی خراب۔ غرض رسول ﷺ نے تعلیم و تربیت کے کام میں مناسب اور موزوں تشبیہات کو خوب استعمال کر کے حکمتِ عملی کو بہت مؤثر بنا دیا۔

## استعارے کا استعمال:

استعارے سے مراد یہ ہے کہ کوئی بات کہی جائے مگر اس کا حقیقی مفہوم مراد نہ ہو بلکہ اس میں خاص مفہوم پنہاں ہو۔ حضور ﷺ نے کئی مواقع پر صحابہؓ کو بات سمجھانے کے لئے استعارے کا استعمال فرمایا۔ حضرت معاذؓ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا: اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو ہٹا نہ دیا جائے' یعنی آپ ﷺ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بالعموم تو نرمی اور محبت کی بہت تاکید کی ہے' مگر اس سے کام نہ چلے تو آپ ﷺ نے ایک حد تک سختی کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ اس حدیث میں اسی بات کی طرف استعاراتی انداز میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

## روزمرہ مشاہدات سے استدلال:

حضور ﷺ نے صحابہ کی تعلیم و تربیت کے لئے روزمرہ امور سے باتیں اخذ کر کے ان کو درس و تدریس میں استعمال فرمایا۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ میری بیوی نے سیاہ بچہ جنم دیا ہے اور مجھے یہ بات پسند نہیں۔ یعنی اس کو کالے رنگ کا بچہ پسند نہیں اور کسی حد تک اس نے اپنی بیوی پر شک بھی کیا' حضور ﷺ نے اس شخص سے دریافت فرمایا کہ ''تمہارے پاس اونٹ ہیں؟'' اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے پوچھا ان کے رنگ کیا ہیں؟ اس نے کہا

سرخ۔ آپؐ نے فرمایا: کوئی ان میں سے سیاہی مائل بھی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ کہاں سے آ گیا؟ اس فرد نے کہا ان کی اصل نسبت میں کہیں ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ بھی اصل نسب کا اثر ہوگا اس طرح روزمرہ کے مشاہدہ سے آپ ﷺ نے اس فرد کو پورے طور پر مطمئن کر دیا۔

## جسمانی حرکات کے ذریعے وضاحت کرنا:

جسمانی حرکات کے استعمال سے مؤثر تدریس میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ استاد تعلیم و تدریس میں اپنے اعضاء کی حرکات و سکنات کی مدد سے تعلیم کا مفہوم واضح کر سکتا ہے۔ معلم کاملؐ جو یتیموں کے سرپرست بھی تھےؐ نے ایک موقع پر یتیموں کی پرورش کی اہمیت واضح کرنے کے لئے اس طریقہ کو اختیار کیا۔

آنحضرت ﷺ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ میں اور یتیم کا پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح (قریب قریب) ہوں گے۔ آپ ﷺ نے دونوں انگلیوں میں تھوڑا سا فرق باقی رکھ کر بات سمجھا دی کہ یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں حضور ﷺ کے بہت قریب ہوگا۔

## تھکاوٹ اور بوریت سے بچاؤ کر کے علم دینا:

پند و نصائح کا بیان بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہوتا ہے عام اصول کے طور پر افراد کو اس سے بور نہیں ہونا چاہئے مگر پند و نصائح کتنے ہی مؤثر طریقے سے بیان کئے جائیں انسان آخرکار سنتے سنتے اکتا جاتا ہے۔ اس بات کے پیش نظر آنحضرت ﷺ پند و نصائح کی مجالس ناغہ دے کر فرمایا کرتے تھے۔ مسلسل تعلیم سے تھکاوٹ، بوریت اور اکتاہٹ کا امکان ہوتا ہے۔ اکتاہٹ ذہنی آمادگی اور بالواسطہ تعلیم کی دشمن ہے۔ آمادگی پیدا کرنے کے لئے طالب علم کے تجسس کو ابھارنا نہایت کارگر حربہ ہے۔ حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے شہادت ملتی ہے کہ آپ ﷺ شاگردوں کی تھکاوٹ اور

اکتاہٹ کا خاص خیال رکھتے تھے۔اس سلسلہ میں ابن مسعودؓ کی ایک روایت ہے کہ:

آنحضرت ﷺ ہم کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے تا کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں''۔

## ذوقِ مزاح:

عمل تعلیم و تربیت میں لطیف مزاح کا استعمال کئی طرح سے مفید رہتا ہے۔ طالب علموں میں بوریت نہیں ہوتی اور دلچسپی برقرار رہتی ہے' بلکہ طالب علم معلم کی بات پورے دھیان سے سنتا ہے۔رسول خدا ﷺ خندہ روئی کی صفت کے حامل تھے آپ ﷺ نے اس ضمن میں کئی باتیں فرمائیں اور تعلیم و تربیت میں مزاح کا استعمال کیا۔

فرمایا: تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی صدقہ ہے۔

آپ ﷺ بعض اوقات اپنے صحابہؓ جو آپ ﷺ کے طلبہ بھی تھے سے تعلیم میں اپنے شگفتہ اور لطیف مزاح سے مزین گفتگو فرماتے۔ایک موقع پر کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہم تمہیں اونٹنی کا بچہ دیں گے۔اس شخص نے کہا میں بچے کا کیا کروں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہر اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے' اس طرح آپ ﷺ نے مزاح کی کیفیت پیدا کر دی۔چنانچہ صحابہؓ میں ذوق و شوق رہتا تھا اور وہ آپ ﷺ کے گرد جمع رہتے تھے۔نتیجتاً آپ ﷺ کو ان کی تعلیم و تربیت کا وافر موقع ملتا تھا۔

٧

# نظامِ تعلیم

# بنیادی عنصر

## باب : ⑦

کسی بھی نظریاتی ریاست میں تعلیمی ادارے بنیادی طور پر ایک ہی نظم سے منسلک' باہم مربوط اور ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہونے چاہئیں۔ یہ ادارے نہ صرف ملک کی ہر طرح کی متنوع ضروریات کو پورا کرنے والے ہونے چاہئیں بلکہ فرد کی زندگی میں اس نظریہ کا جو کچھ تقاضا ہے انہیں اسے بھی پورا کرنا چاہئے۔ مختلف موضوعات کے تحت ان اداروں کے بنیادی اور تشکیلی عناصر پر اس حصہ میں بحث کی جائے گی۔ یہاں ان اداروں کے کسی ملک میں بحیثیت مجموعی پورے نظام پر مختصر گفتگو ہوگی۔

اسلامی نقطۂ نظر سے نظم کا سب سے زیادہ ممتاز اور منفرد پہلو یہ ہوگا کہ طالبات کے لئے ہر سطح کے علیحدہ تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بعض مسلم ممالک میں طالبات کے لئے علیحدہ تعلیمی ادارے بھی کام کرتے ہیں لیکن مطلوب یہ ہے کہ ابتدائی تین سال کی تعلیم (یعنی تقریباً ۸ سال کی عمر) کے بعد کسی سطح اور کسی مرحلہ پر بھی مخلوط تعلیم کی اجازت نہ ہو۔

اسلامی نظام تعلیم کے تعلیمی اداروں کے بارے میں تصور یہ ہے کہ یہ وہ رہنما ہوں جو رہنمائی ہمیں شریعت سے حاصل ہوتی ہے لیکن تعلیمی اداروں کے بارے میں پرائمری' ثانوی' اعلیٰ اور اعلیٰ تعلیم کے مراحل کا تعین وہ دائرہ ہے جس میں کوئی ملک اپنے حالات اور تقاضوں کے لحاظ سے فیصلہ کرسکتا ہے۔ کسی خاص دور میں ایک نظام برسر عمل ہو اور چند ممالک کچھ تبدیلی کے بعد اسے اختیار کرلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ طالب علم کی نفسیات عمر کے مختلف مراحل میں نفسیاتی و جذباتی تقاضے اور دینی وقومی ضروریات وہ عوامل ہیں جو اس بنیادی ڈھانچہ کی تفصیلات طے کرنے میں

اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی خاص ہیئت کے بارے میں نہ کوئی قطعی حکم لگایا جا سکتا ہے اور نہ کوئی قدغن عائد کی جا سکتی ہے۔ جدید مسلم معاشرہ کی ضروریات اور اداروں کے باہمی ربط کے نقطۂ نظر سے ایک خاکہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

① پہلے تین سال کی تعلیم (۸ سال کی عمر تک) طلباء و طالبات کو مشترک اداروں میں دی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مساجد سے کام لیا جائے۔ جہاں ضرورت ہو نئی مساجد تعمیر کر دی جائیں۔ مساجد کے ائمہ کو (ضرورت ہو تو تربیت دے کر) ان اداروں کا نگران بنایا جائے۔ مساجد میں تعلیم کا انتظام بے شمار خوشگوار پہلو رکھتا ہے جس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ابتدائی تعلیم و تربیت دینی پس منظر میں ہوتی ہے۔

② اگلے ۵ سال کی تعلیم (۱۳ سال کی عمر تک) کے لئے طلباء و طالبات کے علیحدہ ادارے اور مناسب عمارات ناگزیر ہیں۔ یہ آٹھ سال کی تعلیم لازمی ہونا چاہئے اور انتظام اور سہولیت اتنی ہونی چاہئے کہ ضروریات کو پورا کرے۔ یہ سب ادارے یکساں معیار کے ہونے چاہئیں۔ قانون کے تحت اس تعلیم کا حصول لازمی قرار دیا جانا چاہئے۔

③ اگلے دو سال کی تعلیم (۱۵ سال کی عمر تک) میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ طالب علم کو کوئی ایسا ہنر سکھایا جائے کہ اگر وہ چاہے تو اس کے بعد مزید تعلیم کے بغیر اپنی عملی زندگی کا آغاز کر دے۔

④ اس کے بعد دو سال کی تعلیم (۱۷ سال کی عمر تک) دراصل آئندہ تعلیم کے لئے بنیاد فراہم کرنے اور عمومی سطح بلند کرنے کے لئے ہونی چاہئے۔

⑤ اس کے بعد چار یا پانچ سال (۲۱/۲۲ سال تک) کی تعلیم طالب علم کو کسی مخصوص ملی و قومی ضرورت پوری کرنے کے لئے تیار کرے۔ طالب علم کو صلاحیت و اہلیت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم کے ان اداروں میں داخلہ ملے اور اسلامی علوم، فطری علوم، طبعی علوم،

عسکریِ علوم' انتظام مملکت' قانون طب' انجینئرئ' زراعت اور دیگر شاخوں میں اختصاص اور پیشہ وارانہ مہارت رکھنے والے افرادِ کار اسلامی ریاست کو فراہم ہو سکیں۔

⑥ اختصاصی تعلیم کے بعد مختلف میدانوں میں تحقیقی ادارے ہو سکتے ہیں جو جامعات سے ملحق بھی ہو سکتے ہیں اور علیحدہ بھی' ان کی منصوبہ بندہ میں ملی وقومی ضروریات دونوں کو اہمیت دی جائے گی۔

ان تعلیمی اداروں کے سرکاری ہونے کی شرط نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ اسلامی ریاست کے مقرر کردہ معیارات پر پورے اتریں۔ مختلف سطح کے لئے ان اداروں کی نصابی ضروریات کے بارے میں گفتگو نصاب کے عنوان کے تحت کی جائے گی۔

ان اداروں میں جو تعلیمی نظام برسرکار ہوگا' اس کے بنیادی عناصر نام کی حد تک موجودہ دور کے عناصر سے مختلف ہوں گے یعنی استاذ' کتاب' نصاب وغیرہ' لیکن اپنی اہمیت' نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے یہ ایک بالکل نیا نظام تشکیل دیں گے۔

ان عناصر پر درج ذیل عنوانات کے تحت بحث کی جائے گی:

① استاد
② طالب علم
③ نصاب
④ کتاب و تدریسی آلات
⑤ ہم نصابی سرگرمیاں
⑥ حکومت اور تعلیمی انتظامیہ
⑦ معاشرہ

## استاد:

تعلیم کے کسی بھی نظام میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مقاصد تعلیم

کے حصول میں اس کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔ کاغذ پر بنائے گئے تمام منصوبوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار استاد کے تعاون یا عدم تعاون پر ہوتا ہے' اس لئے فن تدریس کی تمام کتب استاد کے منصب و مقام کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں اور جدید دور کا ہر نظام تعلیم استاد کو اپنی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کرتا ہے۔ تعلیم کی اسلامی روایت میں استاد کو نہایت مؤثر اور مثبت مقام حاصل ہے' اس پیشہ کی تقدیس کا احساس اس سے ہوتا ہے کہ دراصل یہ خود انبیاء کا کام ہے' وہ بنیادی طور پر انسان کو علم عطا کرنے ہی آئے تھے۔ نبی آخرالزمان ﷺ نے فرمایا ہے کہ: **انما بعث معلما** ''بلاشبہ مجھے استاد بنا کر بھیجا گیا ہے''۔ اس لئے استاد کے فرائض کا شعور حاصل کرنے اور طریقہ تدریس میں راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اسوۂ حسنہ کا مطالعہ ضروری ہے' یہ مطالعہ ہمارے سامنے ایک مثالی استاد کی تمام خصوصیات نہایت جزئی تفصیلات سے لاتا ہے۔

## ① مسلم تعلیمی روایت میں استاد کا مقام

مسلم تاریخ تعلیم میں استاد کی امتیازی شان یہ رہی ہے کہ وہ محض علم و فضل میں ہی نہیں بلکہ تقویٰ و کردار میں بھی اعلیٰ مقام کا حامل رہا ہے۔ مسلم معاشرہ نے عالم بے عمل کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہے' کردار کی اہمیت بنیادی رہی ہے۔ مسلم مفکرین تعلیم نے استاد کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں اعلیٰ کردار' تقویٰ و خداترسی اور قول و فعل کی ہم آہنگی کو نمایاں مقام دیا ہے۔

اس تعلیمی روایت میں استاد کو اتنا مرکزی مقام حاصل تھا کہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا پورا مزاج استاد کا بنایا ہوا تھا' نصاب کی تشکیل بھی اسی کا کام تھا' صاحب حیثیت ہوتا تو طلبہ کی کفالت کی ذمہ داری بھی اٹھاتا تھا۔

طالب علم جس استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتا اسی سے تکمیل علم کرتا پھر دوسرے استاد کے پاس جاتا' بیک وقت دس دس اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا

رواج نہ تھا۔ جس استاد کی شاگردی میں ہوتا اس کی اطاعت و خدمت کو بھی فرض جانتا۔

استاد کی حیثیت آج کے مفہوم میں محض استاد کی نہ تھی بلکہ مربی اور مرجع کی تھی۔ استاد طالب علم کے اخلاق و کردار پر بھی نظر رکھتا اور اس کی معاشرتی ضروریات اور گھریلو حالات کی بھی اسے فکر ہوتی تھی۔

حکومت اور استاد کے باہمی تعلقات میں استاد کا مقام برتر تھا۔ خلفاء اور عمال حکومت اساتذہ کی عزت اور احترام کرتے تھے اور ان کے معاملات میں مداخلت سے باز رہتے تھے۔ معاشرہ میں انہیں اعلیٰ اور معزز مقام حاصل تھا۔ عوام الناس ان کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ان کو اپنا راہنما مانتے تھے۔ ان کا اثر و رسوخ صرف درسگاہوں تک محدود نہ تھا بلکہ گلی کوچوں تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ تمام معاشرتی سرگرمیوں میں فعال حصہ لیتے تھے۔

## ۲ مغربی تعلیمی روایت میں استاد کا مقام:

لیکن مغربی نظام تعلیم نے یہ سب روایات الٹ کر رکھ دیں۔ مسلم ممالک کو جو تعلیمی نظام دور غلامی سے ورثہ میں ملا اور آج بھی مقاصد' نتائج اور خصوصیات کے لحاظ سے تقریباً وہی زیر عمل ہے۔ اس میں استاد کو جو مقام حاصل ہے اسے ہم ان خصوصیات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

۱. دین و دنیا کی علیحدگی کے تصور کے تحت' استاد کے کردار میں تقویٰ اور خوف خدا کا کوئی مقام نہ رہا۔ عام انسانی اخلاقیات کے تحت اچھے برے استاد کا تصور تو ایک حد تک ہے لیکن دینی تصورات کے تحت اخلاقی اقدار کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔
۲. استاد اپنا فریضہ محض علم کی منتقلی کو سمجھتا ہے' طالب علم کی سیرت و کردار کی فکر اپنے فرائض کے دائرہ میں شامل نہیں سمجھتا۔

(۳) طالب علم سے اس کا تعلق محض کلاس روم تک محدود ہے۔ کلاس روم سے باہر تعلیمی اداروں کی حدود کے اندر ہی سہی' وہ طالب علم کی سرگرمیوں کا نہ اپنے کو ذمہ دار سمجھتا ہے' نہ اس پر نظر رکھتا ہے۔ تعلیمی ادارہ سے باہر کے طرزِ عمل کے زیر بحث آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' نہ طالب علم ہی اسے کلاس روم سے باہر استاد کا سا مقام دیتا ہے۔

(۴) تعلیمی اداروں کے نظم و نسق سے تقریباً بے تعلق ہے۔ اسی طرح تعلیم کے مقاصد کے تعین، تعلیمی حکمت عملی' تعلیم کی منصوبہ بندی وغیرہ کے معاملات میں اس کی کوئی آواز نہیں ہے۔

(۵) اس کی حیثیت ایک ماتحت ملازم کی ہے۔ تعلیمی انتظامیہ کے افسران اس سے ملازم کا سا برتاؤ کرتے ہیں' تنخواہ یافتہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ برتاؤ بھی ملازموں جیسا کیا جائے' لیکن عملاً ایسا ہی ہوتا ہے۔

(۶) استاد کو معاشرہ میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں۔ معاشرتی اقدار کی تبدیلی نے عزت و احترام کو بڑی حد تک دولت و ثروت سے مربوط کر دیا ہے۔ چونکہ مالی لحاظ سے اساتذہ تنگ دست ہیں' اس لئے توقیر کے مستحق بھی نہیں ٹھہرتے۔

(۷) تدریس کا معاوضہ وصول کرنا اور مناسب معاوضہ وصول کرنا بری بات نہیں ہے لیکن مطمح نظر یہی ہو جانا اور اس کے کم ہونے کی بنیاد پر فرائض سے غفلت کا جواز تلاش کرنا' مناسب نہیں' لیکن اسباب خواہ کچھ ہی سہی' یہ صورت حال موجود ہے۔ استثنائی صورتوں سے قطع نظر یہ عمومی صورت ہے جس سے تعلیمی منظر کا کوئی طالب علم شاید ہی انکار کرے۔

اس پس منظر میں ہمیں اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ اگر آج کوئی ریاست اسلامی نظام تعلیم نافذ کرے وہ اس میں استاد کو کیا مقام دے گی اور وہ اسے کس طرح حاصل کرے گا؟

## جدید اسلامی معاشرہ میں استاد کا مقام:

پہلے قدم پر ہی ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ آج کسی معاشرہ کے تعلیمی عمل میں استاد کی ذات وشخصیت کو وہ مرکزی مقام حاصل نہیں ہوسکتا جس کا ذکر ہم اپنی تاریخ اور روایات کے حوالہ سے کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ کتاب بھی نہ تھی اور استاد کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہی سب کچھ تھے' پھر کتاب اور نصاب کے رواج نے استاد کی حیثیت پر برا اثر ڈالا۔ کتاب کی تفہیم کے لئے استاد کی احتیاج تو باقی رہی اور اب بھی ہے لیکن یہ ممکن ہوگیا کہ کوئی کسی زندہ وجود کو درمیان میں لائے بغیر بھی حصول علم کر لے۔ تعلیمی اداروں کے نظم ونسق کے باقاعدہ ادارے قائم ہونے سے اور تعلیم کے عمل میں ریاست کے مؤثر عمل دخل سے بھی استاد کی حیثیت پر اثر پڑا۔ جدید ٹیکنالوجی نے تفہیم وتعلیم کے ایسے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں جہاں کسی چلتی پھرتی شخصیت کے کردار کو نمونہ بنائے بغیر ہر طرح کے علم کا حصول ممکن ہے۔ خط وکتابت' ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے تعلیمی اسباق اور اب پرسنل کمپیوٹرز اس کی مثال ہیں یہ تو رسمی تعلیم کی بات ہے' غیر رسمی تعلیم کا پورے نظام تعلیم کی کردار سازی کے عمل اور خصوصاً استاد کی اثر انگیزی سے جو تعلق ہے اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اپنے نظریۂ حیات کی روشنی میں کسی نئے نظام تعلیم میں استاد کو کوئی مقام دینے' اس کے فرائض وحقوق کا تعین کرنے اور اس سے توقعات قائم کرنے میں ہمیں اس عملی صورتِ حال سے آنکھیں بند نہیں کرنی چاہئیں۔ اس بحث کے دوران یہ دو نکات ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوں۔

① استاد کے منصب ومقام میں تبدیلی' تعلیم کے دوسرے عناصر اور نظامِ حیات میں تبدیلی کے ساتھ ہی آئے گی۔

② کوئی بھی عملی صورت حال' اس حقیقت کو نہیں مٹا سکتی کہ درس دینے والا استاد' درس لینے والے طالب علم کے لئے نمونۂ عمل ہوتا ہے۔

اسلامی نظام تعلیم میں استاد کے منصب و مقام کو سمجھنے کے لئے ہم دو عنوانات کے تحت مطالعہ کریں گے۔

① استاد سے اسلامی معاشرہ کی توقعات

② استاد کی اسلامی معاشرہ سے توقعات

## ① استاد سے اسلامی معاشرہ کی توقعات:

ایک اسلامی معاشرہ اپنی نئی نسل کو استاد کے حوالے کرتا ہے اور اس سے کچھ توقعات قائم کرتا ہے۔ وہ کیا ہیں؟

① استاد صاحب ایمان وتقویٰ ہو۔ یہ بنیادی وصف اسلامی نظام تعلیم کے رکن ہر استاد میں ہونا لازمی ہے' اس کے بغیر ہم دوسری کسی توقع کے پوری ہونے کا سوچ نہیں سکتے۔ ان سے اس کی شخصیت میں وہ جوہر پیدا ہوگا جو اس کے طلبہ میں منعکس ہوگا اور نظام تعلیم کے حقیقی مقاصد حاصل ہوسکیں گے۔

② استاد صاحب علم ہو۔ ہر استاد' خواہ وہ کسی بھی مضمون کا ہو' دین کا بنیادی ضروری علم رکھتا ہو اور اپنے مضمون کا اتنا علم رکھتا ہو کہ متعلقہ سطح کے طلبہ کی تدریس بحسن وخوبی کر سکے' اس کا علمی معیار بلند ہو اور مطالعہ کی عادت ہو کہ احوال دنیا سے بھی واقف رہے اور اپنے مضمون میں نو بنو تحقیقات سے بھی آشنا رہے۔

③ وہ اپنے طلبہ کی علمی لیاقت' علمی تربیت اور سیرت و کردار کی نگہداشت کو اپنے فرائض میں سمجھے اور اپنے کو ان کا مسئول سمجھے اور جانے کہ اسے ان کے بارے میں جوابدہ ہونا ہے۔ طلبہ اس کے پاس معاشرہ کی امانت ہیں اور اسے ایک امین کی طرح ان کے بارے میں اپنے فرائض خیانت سے دامن بچاتے ہوئے ادا کرنا ہیں۔ اسے ہم نصابی سرگرمیوں میں مثبت حصہ لینا چاہئے۔

④ اسے معاشرہ کا ایک سرگرم اور فعال رکن ہونا چاہئے۔ اس کا وزن خیر کے

پلڑے میں پڑے چھوٹے قصبات اور دیہات میں تو اسے مرکزی شخصیات ہونا چاہئے۔ لوگ اسے اپنے سے زیادہ جاننے والا' اپنا خیر خواہ' ہمدرد اور اپنے بچوں کا نگہبان تصور کریں۔ بڑے شہروں میں بھی اس کی علمی برتری اور عظمت وکردار اس کے لئے اعلیٰ مقام کی ضمانت ہو۔ وہ اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے والا اور ان میں مثبت کردار ادا کرنے والا ہو۔

⑤ اسے فن تدریس سے واقف ہونا چاہئے۔ بلاشبہ کچھ لوگوں میں تدریس کا قدرتی ملکہ ہوتا ہے لیکن فی زمانہ یہ ایک ایسا فن ہے جسے دلچسپی لے کر سیکھا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں عملی تربیت کے ذریعے جدید ترین ذرائع کے استعمال سے بھی آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہ توقعات ہیں جو ایک استاد سے اسلامی معاشرہ کرتا ہے' دوسرے الفاظ میں' یہ اس کے فرائض منصبی ہیں لیکن وہ کیا توقعات ہیں جو ایک استاد اسلامی معاشرہ سے کرتا ہے یعنی اس کے وہ حقوق کیا ہیں جنہیں ایک اسلامی نظام تعلیم میں لازماً ادا کیا جانا چاہئے؟

## ② استاد کی اسلامی معاشرہ سے توقعات:

① حقوق میں پہلا اور سرفہرست تقاضا یہ ہے کہ معاشرہ اسے عزت و احترام کا مقام دے۔ قدیم یونان اور چین میں استاد کی گویا پوجا ہوتی تھی۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد سے استاد مغربی معاشروں میں بھی بڑی قدر و منزلت کا حامل رہا ہے۔ مسلم معاشرہ کی روایت بھی یہی ہے کہ استاد کو عزت واحترام کا مقام ملے لیکن یہ مقام نیک تمناؤں اور خواہشوں سے نہیں ملے گا بلکہ ایک اسلامی حکومت کو جدید معاشرتی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں کہ استاد اپنے حقیقی مقام پر فائز ہو' وہ نہ صرف خود اپنی نگاہ میں معزز

محترم ہو اور اپنے پیشے کو قابل تکریم سمجھتا ہو بلکہ طلبہ بھی اس کا احترام کرتے ہوں' انتظامیہ بھی اس کے مرتبہ کو واقعتاً تسلیم کرتی ہو اور بحیثیت ایک پالیسی' حکومت معاشرہ کی اسلامی تشکیل میں ان کے کردار کی اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھتی ہو' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرے کے تمام طبقات استاد کا احترام کریں گے اور نئی نسل کے ذہین عناصر اور کچھ کرنے کے جذبہ و عزم رکھنے والے طلبہ فخر کے احساسات کے ساتھ تدریس کو اپنی زندگی کے پیشہ کے طور پر اختیار کریں گے۔

(۲) استاد کا دوسرا حق یہ ہے کہ معاشرہ نے جو کام اس کے سپرد کیا ہے' یعنی نئی نسل کی اسلامی نظریۂ حیات کے تقاضوں کے مطابق تعلیم و تربیت' اس میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ یہ حماقت ہی ہوگی کہ استاد کو تو یہ فرض سونپا جائے کہ طلبہ کو اسلامی سیرت و کردار کے سانچے میں ڈھالے اور پھر معاشرہ پوری قوت و طاقت سے یہ کام کرے کہ طلبہ اسلامی سیرت و کردار کے سانچے میں نہ ڈھلیں' اس کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہوگا کہ نظام تعلیم اس طرح تشکیل دیا جائے کہ نصابات' دوسری کتب' ہم نصابی سرگرمیاں اور نظام کے دوسرے عناصر اس میں ممد ہوں بلکہ خود معاشرہ میں بھی اسلامی اقدار کا چلن ہو اور انہیں برتری حاصل ہو' بالخصوص ریاست کے وہ شعبے جو انسانی ذہن و کردار کو متاثر کرتے ہیں یعنی ذرائع ابلاغ' استاد کے معاون کا کردار ادا کریں۔

(۳) معاشرہ پر یہ بھی استاد کا حق ہے کہ اس کے معاوضے اور سہولتیں دوسرے پیشوں میں کام کرنے والے مساوی قابلیت کے افراد سے نہ صرف یہ کہ کم نہ ہوں بلکہ زیادہ ہوں۔ بلاشبہ ہم استاد سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ دنیا پر حریص ہو' لیکن اسلامی معاشرہ کوتاہی کا مجرم ہوگا اگر وہ استاد کو قرار واقعی مشاہرے اور سہولتیں نہ دے اور اس سے فرائض کی مثالی انجام دہی کی توقع کرے۔ ہماری تاریخ میں ایسے علماء و اساتذہ کی ان گنت مثالیں ہیں جنہوں نے ایثار و قربانی کی

مثالیں قائم کی ہیں اور تدریس کے معاوضے قبول کرنے سے انکار کیا ہے یا انتہائی کم معاوضوں پر کام کیا ہے' لیکن کسی ملک کا نظام تعلیم ان چند مثالوں کو بنیاد بنا کر وضع نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کی تعلیمی روایت میں تنخواہوں کا نظام بھی موجود ہے ہمیں اس دور میں اس کو اپنانا چاہئے۔ دنیا کی سہولتیں اور آسائشیں فی نفسہٖ بری نہیں اور جب کسی اسلامی معاشرہ میں دوسرے پیشوں سے وابستہ افراد اس کا حق رکھتے ہیں تو استاد کو اس سے مستثنیٰ سمجھنے کا کیا جواز ہے؟ جب ایک اسلامی معاشرہ اس حقیقت کو تسلیم کرے گا تب ہی وہ استاد کو اس کا جائزہ مقام دے گا۔

(۴) اساتذہ کو انجمن سازی کا حق ہوتا کہ وہ نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر چلانے اور اس کو بہتر بنانے میں تعاون کے ساتھ ساتھ' اپنے معاشی و دیگر حقوق کے لئے مروجہ طریقوں کے مطابق اپنی اجتماعی قوت سے جدوجہد کرسکیں۔ اساتذہ کی انجمنیں کوئی جدید تصور نہیں' قرون وسطیٰ کے مسلمان تنظیم کرنا جانتے تھے' انہوں نے تحفظ حقوق کی انجمنیں بنائی تھیں جو نقابات کہلاتی تھیں ...... اساتذہ کی بھی انجمن تھی جس کے فرائض میں تھا کہ اساتذہ کے درجے اور حیثیت کو بلند رکھے اور تعلیمی معاملات کی بھی دانشمندی سے نگرانی کرے۔ اساتذہ کی انجمن نہایت کامیابی سے چلتی تھی اور اکثر اوقات تعلیمی معاملات میں اس کا دخل خلیفہ کے احکامات سے بھی بڑھ کر ہوتا تھا۔ ان نظائر کے ہوتے ہوئے کسی اسلامی معاشرے میں انجمن سازی کو ناپسندیدہ قرار دینا صحیح فکر کا اظہار نہ ہوگا' ریاست کتنی ہی مثالی کیوں نہ ہو اور اساتذہ کے مقام سے آگاہ ہی کیوں نہ ہو تب بھی یہ عملی دنیا کی ضرورت ہے کہ اساتذہ اپنا مرتبہ و مقام حکومت اور معاشرہ کو فراموش نہ کرنے دیں اور کوشش کریں کہ بیان کردہ پالیسیوں کے مطابق عملی اقدامات بھی کیے جائیں۔

اسلامی نظام تعلیم میں استاد کے مرتبہ و مقام کو متعین کرنے کے لئے درج بالا نکات کے علاوہ یہ امور بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔

## اساتذہ اور طلبہ:

اساتذہ اور طلبہ کا باہمی رشتہ نہایت نازک اور حساس رشتہ ہے' استاد کی حیثیت روحانی باپ کی ہے۔ اسلام کی تعلیمی تاریخ میں طلبہ کی جانب سے عزت و احترام اور خدمت اور اساتذہ کی جانب سے محبت و شفقت' خیر خواہی اور دلسوزی کی نہایت جاندار روایت ملتی ہے۔ جدید دور میں نئے تقاضوں کے تحت اور نظام تعلیم میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب یہ رشتہ بھی مجروح ہوا ہے۔ نظام تعلیم کی اسلامی خطوط پر تشکیل اس رشتہ کو از سرنو زندہ کرنے کا باعث بنے گی' استاد کو بھی اس کی فکر ہوگی کہ وہ اپنے شاگرد سے بے تعلقی کا رویہ نہ رکھے بلکہ اس کے بُرے بھلے کی ذمہ داری محسوس کرے اور شاگرد بھی استاد کے ادب و احترام میں کمی نہ کرے۔ استاد کے مربی ہونے کے تصور کا احیاء ہونا چاہئے' اس کے لئے یہ تدبیر کی جاسکتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں ایسے نظام اپنائے جائیں کہ طلبہ کی ایک تعداد کلاس روم سے قطع نظر استاد کے سپرد ہو اور وہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما میں فعال حصہ ادا کرے۔ اسلام کے تعلیمی نظام میں منجملہ دیگر امور کے اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

① طلبہ سے برتاؤ میں عدل و مساوات کو ملحوظ رکھیں' کسی پر زیادتی یا کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کرے' سب کو ایک نظر سے دیکھے۔

② سزا دینے میں محتاط ہو۔ غیظ و غضب' ڈانٹ پھٹکار' طعن و تشنیع سے کام لینے کے بجائے طلبہ کے جذبات اور ان کی عزت نفس کا خیال رکھے اور ٹھنڈے دل سے ان کی مشکلات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرے۔

③ طلبہ کے سوالات و اعتراضات پر چڑنے یا ناک بھوں سکیڑنے کے بجائے خندہ پیشانی سے جواب دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔

④ لب ولہجہ شیریں ہو' تلخ باتوں کو بھی گوارا کر لے۔
⑤ ہر طالب علم کو ذاتی توجہ دے کر اس کے مسائل میں دلچسپی لے' طالب علم محسوس کرے کہ اس کے استاد کو اس کی فکر ہے۔

## اساتذہ اور تعلیمی انتظامیہ:

تعلیم کے نظام کے قیام کے نتیجہ میں تعلیمی انتظامیہ وجود میں آئی ہے اور اس کی توسیع اور تنظیم کے ساتھ یہ انتظامیہ وسیع اور مضبوط ہو جاتی ہے۔اب بہر حال یہ وہ زمانہ نہیں جب ایک استاد کا اپنا مدرسہ ہو' وہ خود ہی اس کا نصاب ہو اس میں داخلے اور نظم وضبط کا وفیس واخراجات کا اور دیگر امور کا ذمہ دار ہو......یعنی خود ہی اس کی تعلیمی انتظامیہ ہو۔

تعلیمی انتظامیہ کا ایک پہلو اداروں کے انتظام وانصرام' مستقبل کی منصوبہ بندی' وسائل کا تعین اور خرچ پر نظر' دوسرا نصاب سازی' درسی کتب کی تیاری اور تیسرا اساتذہ کا تقرر' ملازمت کے لئے قواعد وضوابط کا تعین' کارکردگی پر نظر رکھنے' ترقی ' تنزل اور برطرفی وغیرہ کا نظام ہے۔یہاں ہمارا موضوع صرف تیسرا پہلو ہے۔

موجودہ صورتِ حال اس لحاظ سے غور وفکر کا موضوع ہے کہ معاشرہ میں اساتذہ کو ان کا جائز مقام حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ملازموں کی طرح کا برتاؤ ہوتا ہے' ناجائز کام نہ کرنے پر انتقام لئے جاتے ہیں' تبادلے کر دیئے جاتے ہیں اس کی وجہ سے اساتذہ کے مقام ومرتبہ میں مزید کمی واقع ہوئی ہے۔

اس مطالعہ میں اس کے بارے میں تفصیلی تجاویز پیش کرنا پیش نظر ہے لیکن اس وجہ سے کہ یہ مسلم ممالک کا عملی مسئلہ بھی ہے اور اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل میں اس سے لازماً واسطہ پیش آتا ہے۔اس بارے میں یہ اصولی بات عرض کی جاتی ہے کہ باوجود کہ استاد کا تقرر کیا جائے گا' اس کی کارکردگی پر نظر رکھی جائے گی' کسی اعلیٰ تر ادارہ کو اس کی برطرفی تک کا اختیار ہوگا' استاد تنخواہ بھی لے گا اور ترقی بھی حاصل کرے

گا......انتظامیہ کا اس سے برتاؤ باعزت ہونا چاہئے‘ یہ مسئلہ دراصل روایات کا ہے‘ اس وقت روایات بگڑی ہوئی ہیں۔ اسلامی نظام اس بارے میں درست روایت قائم کرے گا اور اس میں ذمہ داری ایک طرف خود استاد کی ہوگی کہ وہ اپنے مقام سے فروتر ہو کر معاملہ نہ کرے اور دوسری طرف حکومت کی کہ وہ نظر رکھے کہ اس کے اعمال اساتذہ کی توہین کے مرتکب ہوں تو ان کو چھوڑ نہ دیا جائے۔

## اساتذہ اور سرپرست:

اساتذہ کے تعلقات کا ایک دائرہ زیر تعلیم طلبہ کے سرپرستوں سے متعلق ہے‘ والدین و سرپرست اساتذہ سے بہت توقعات رکھتے ہیں لیکن یہ اس صورت میں پوری ہو سکتی ہیں جب وہ اپنے بچے کے استاد سے ذاتی رابطہ رکھیں۔ استاد کو بھی یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ یہ رابطہ قائم ہو اور قائم رہے۔ ایک ہی معاشرہ کے افراد ہونے اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے مشترک مفاد کی وجہ سے ان کا یہ تعلق زندہ‘ مثبت اور نتیجہ خیز ہونا چاہئے۔

## حکمت عملی:

اسلامی نظام تعلیم میں استاد کو اس کا حقیقی اور مؤثر مقام دینے کے لئے دو نکاتی حکمت عملی پر عمل کیا جائے گا‘ پہلا نکتہ اس کی ملازمت کے نظام سے متعلق ہے اور دوسرا نکتہ اس کی تربیت کے نظام سے متعلق ہے۔

## ملازمت کا نظام:

مقاصد تعلیم کو کامیابی سے حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کی ملازمت کا ایسا نظام وضع کیا جانا چاہئے‘ جو ایک اسلامی ریاست کے نظام تعلیم سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس کی خصوصیات یہ ہوں:

① تقرر و انتخاب کے موقع پر اسناد اور قابلیت کے ساتھ ساتھ دین کے بنیادی

علم، ذاتی کردار، میلان طبع اور ملک وملت کے مسائل سے آگہی پر بھی نظر رکھی جائے۔

۲ کسی بھی دوسرے پیشے کی طرح اس میں بھی برقرار رہنے کے لئے فرائض کی ادائیگی اور دیگر معیارات پر پورا اترنا ضروری ہو۔

۳ ترقی اور آگے بڑھنے کے لئے نگرانی اور پرکھ کا معیار ان اجزاء پر مشتمل ہو۔

ا) طلبہ کی تعلیم وتربیت میں اس کی حقیقی کارکردگی۔

ب) اپنی صلاحیت اور معیار بہتر کرنے کی اس کی کاوشیں۔

ج) معاشرہ کی خدمات

د) تحقیقات کام اور مقالات کی تصنیف

۴ ان معیارات پر پرکھنے کے لئے معقول اور معروضی ضابطے اور وضع کئے جائیں اور ایسا نظام تشکیل دیا جائے کہ اپنے عمل کے نتیجے میں اچھے استاد کو اعلیٰ ترین مقام ومنصب کا راستہ کھلا ملے۔

۵ پرکھ کے نظام میں اور تقرر وترقی کے فیصلے میں ساتھی اساتذہ اور معاشرہ کو شریک کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔

۶ ملازمت کا ڈھانچا ایسا ہونا چاہئے کہ فرائض کی ادائیگی اور صلاحیت وقابلیت کی بنیاد پر ایک استاد کو بہتر سے بہتر مقام ملے۔

۷ نظام میں اس کی گنجائش بھی ہو کہ فرائض ادا نہ کرنے والے استاد کے خلاف مناسب طریقے سے تادیبی کارروائی کی جاسکے اور یہ کارروائی کی بھی جائے۔

اس کے نتیجہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے اچھے اور برے یا کامیاب اور ناکام استاد کا ایک واضح تصور ابھرے گا اور اچھے اور کامیاب استاد کے لئے ترقی کرنے اور اپنی پوری قامت تک پہنچنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ استاد کی شہرت بطور ایک معلم کے، اس کی خدمت بطور ایک شہری کے اور اس کی حیثیت بطور ایک محقق اور مصنف کے معیار

بنے گی۔اس کے اثرات پورے نظام تعلیم پر ہوں گے۔

## تربیتی نصاب:

اساتذہ کے لئے خصوصی تربیتی ادارے اس دور کے ہر نظام تعلیم کا جزو ہیں۔ اسلامی نظام کے تحت یہ ادارے غیر معمولی اہمیت کے مالک ہوں گے اس لئے کہ دراصل ان کی صحیح نہج پر نظام تعلیم کی صحیح تشکیل کا مدار ہوگا۔

مختلف درجات وسطحوں کی تدریس کے لئے مختلف معیار کے تربیتی ادارے اور ان کے نصاب ہو سکتے ہیں لیکن جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر استاد کے لئے ...... خواہ وہ ابتدائی جماعتوں کو پڑھائے یا انتہائی جماعتوں کو...... تربیت ناگزیر ہے۔اس تربیتی نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ مستقبل کے اساتذہ میں ان کے نصب العین کا واضح شعور اور اس سے گہری وابستگی پیدا کرے اور ان میں وہ اخلاقی کردار کا مشنری جذبہ پروان چڑھائے جو انہیں اس منصب کے تقاضے صحیح صحیح ادا کرنے کے لئے تیار کرے۔

تربیت کے مختلف مراحل کے لئے نصابات کی تشکیل اور پھر ان کے مطابق کتب کی تیاری کی جائے' اس عمل میں یہ اصول رہنما ہو سکتے ہیں:

① ان کو یہ تربیت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے مضامین چاہے طبیعی وحیاتی علوم ہوں یا عمرانی' اسلامی فلسفۂ تعلیم کی مطابقت میں پڑھائیں۔

② انہیں اپنے ملک کے اور بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کے مسائل کے بارے میں شعور و آگہی فراہم کی جائے تاکہ وہ بعد میں اپنے زیر تعلیم و تربیت طلبہ تک اسے منتقل کر سکیں۔

③ انہیں اسلام کے فلسفۂ تعلیم' مقاصد تعلیم اور مفکرین تعلیم کے خیالات سے آگاہ کیا جائے۔

④ مغربی تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس کا مطالعہ تنقیدی نقطۂ نظر سے کروایا

جائے۔

⑤ نصاب میں ایسے عناصر نہ ہوں جو ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی شخصیت کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے والے ہوں۔

⑥ ایسی کتب استعمال کی جائیں جو اسلامی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہوں۔ ایسی تحریریں رسالے یا کتابیں کورس میں نہ ہوں جو اجتماعی نصب العین کے بارے میں ایمان کو کمزور کرنے والی ہوں۔

⑦ تدریس کو مؤثر کرنے کے لئے جدید سمعی و بصری آلات کے استعمال سے واقف کروایا جائے۔

## دوسرا نقطہ نظر:

اساتذہ کی تربیت کے بارے میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ''اسلامی نظام تعلیم میں استاد کے معاملہ میں وسیع بنیادوں پر با مقصد تعلیم کو تخصیص پر ترجیح دی جائے گی۔ مسلم معاشرہ میں استاد کی علیحدگی اداروں میں علیحدہ تربیت پانے والا محدود ماہر یا ٹیکنیشن نہیں ہے۔ مسلم معاشرے میں اساتذہ کی تربیت کے لئے خصوصی ادارے نظام تعلیم کے جزو کی حیثیت سے کبھی قائم نہیں کئے گئے۔ استاد کی تربیت (Training) نہیں کی جاتی بلکہ اسے تعلیم (Education) دی جاتی ہے۔ اسے علیحدہ نہیں کیا جاتا بلکہ مربوط کیا جاتا ہے...... یہ مسلم تعلیمی فکر و عمل کا وہ عطیہ ہے جس کی اہمیت جدید نظام ہائے تعلیم کے بعض نئے رجحانات میں محسوس کی جانے لگی ہے' جہاں طویل مدت سے اساتذہ کی تربیت علیحدہ اداروں میں ایک تخصیص کے طور پر کی جا رہی تھی' علیحدہ اداروں میں اور الگ رکھ کر اساتذہ کی تربیت کا محدود تصور اب وسیع بنیادوں پر نئے مربوط اداروں کو راہ دے رہا ہے اور امریکہ میں یہ جدید رجحان اساتذہ کی علیحدہ تربیت کے تصور کے خاتمہ میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہے۔

## طالب علم:

طالب علم کسی بھی نظام تعلیم کا محور ہے۔ بلند و بالا عمارتیں' نصاب ساز اور ان کی کوششیں' لائبریریاں اور درسی کتب کے انبار' تعلیم سے متعلق سرکاری دفاتر اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ' اساتذہ کرام اور ان کا معیار' غرض پورے نظام کا محوری نکتہ یہ ہے کہ اس نظام میں حصول علم کے لئے آنے والے طالب علم ایسی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہوں جو اس کے لئے اور اس کی قوم اور اس کی تہذیب کے لئے نافع ہو۔ کسی تعلیمی نظام کی کامیابی یا ناکامی جانچنے کا پیمانہ بھی یہی ہے کہ اس سے فارغ التحصیل ہونے والا فرد' انسان مطلوب ہے یا نہیں۔ کسی قوم کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ اس کا نظام تعلیم ڈھانچہ کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہو لیکن جو طالب علم وہاں سے فارغ ہو' اسے دنیا میں اپنے حقیقی مقام کا شعور نہ ہو' اس کی صلاحیتوں کو مطلوبہ نشو ونما نہ ملی ہو اور وہ اپنے ملک کے کسی شعبۂ حیات میں مفید اور کارگر نہ ہو۔

طالب علم کا یہ محوری مقام اور اس کی یہ اہمیت کسی اسلامی مملکت کے نظام تعلیم میں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ مقاصد تعلیم کے حصول میں کامیابی یا ناکامی جانچنے کا پیمانہ طالب علم کے اپنے نصب العین اور مقاصد تعلیم کے حصول میں کامیابی کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا کہ ایک علیحدہ باب قائم کر کے اس موضوع کا مطالعہ کیا جائے۔

اس دائرے میں مسلمانوں کی تعلیمی روایت میں جو رجحان سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ طالب علم میں ان کا ذوق و شوق' محنت و مشقت اور اس کے لئے دور دراز کے سفر ہیں۔ یہ اس دور کے مسلمانوں کا مزاج تھا کہ خدا اور رسول کے واضح احکامات کے تحت طالب علم کو ایک مقدس دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ اس نوعیت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حصول علم کا یہی شوق تھا جس نے انہیں چند صدیوں میں دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز کیا اور انہوں نے علمی ترقی میں وہ

کارنامے انجام دیئے جن کے اثرات تاریخ علم کے دیانتدار طالبعلموں کی نظر میں آج تک چلے آ رہے ہیں۔

آج کے دور کے اسلامی نظام تعلیم میں طالب علم کا مقام متعین کرنے کے لئے ہم دو زاویوں سے جائزہ لیں گے۔

......طالب علم کا ریاست یا معاشرہ میں کیا حق ہے؟

......طالب علم پر ریاست یا معاشرہ کا کیا حق ہے؟

## ا : طالب علم کے حقوق:

① . ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو فطرت اسلام پر ہوتا ہے' یہ معاشرے کا کام ہے کہ وہ اسے مسلمان رکھے یا یہودی ونصرانی بنادے۔ اس اصول کے تحت تعلیمی نظام میں داخل ہونے والے ہر فرد کا یہ حق ہے کہ اسے ایسی تعلیم و تربیت دی جائے کہ وہ مسلمان رہے' اس کا ایمان مضبوط ہو اور وہ اس کے تمام تقاضے پورے کرے' وہ کسی طاغوت اور باطل سے مغلوب و مرعوب نہ ہو' بلکہ اللہ کے کلمہ کو اونچا کرنے والا بنے۔

② ہر طالب علم کا یہ حق ہے کہ اسے ایسی تعلیم دی جائے جو ذاتی طور پر اس کے لئے اور ملک وملت کے لئے نافع ہو۔ ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ معاشرہ کی ضروریات وامکانات کا ٹھیک جائزہ لے اور پھر تعلیمی نظام کی ایسی منصوبہ بندی کرے کہ ملک کی افرادی طاقت کا بہترین ممکن استعمال ہو۔ تعلیم معاشرتی تقاضوں سے مربوط ہو' کسی شخص کو ضائع کرنے والی نہ ہو بلکہ اسے مفید بنانے والی ہو' طلباء ہوں یا طالبات' وہ ملازمت کریں' کاروبار کریں یا گھرداری کریں' ان کی تعلیم ان کے لئے مفید ہو۔

③ تعلیمی اداروں میں ضروری سہولتوں کی موجودگی بھی طالب علم کا حق ہے۔

اسلامی معاشرہ میں تعلیم کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اداروں میں نظریے کی برتری کے ساتھ ساتھ ضروری سہولتوں کی فراہمی بھی ریاست کا فریضہ ہے۔ اگر حکومت اخلاص سے کوشش کرے تو اسلامی معاشرہ کے اندر سے اس مقصد کے لئے وسائل کی فراہمی کوئی ناممکن کام نہیں۔ سہولتوں سے مراد آرام و آسائش نہیں لیکن کسی ملک کے عام معیار کے مطابق عمارات آلات تدریس اور دیگر ضروریات تمام طلبہ کو یکساں انداز سے فراہم نہ کی جائیں تو یہ فرائض میں کوتاہی ہے' تب بھی تعلیمی حکمت عملی یہ ہونی چاہئے کہ طلبہ آسائش اور آرام کے عادی نہ بنیں۔

④ معذور طلبہ کے لئے تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام ریاست کے فرائض میں ہو گا۔

⑤ طالب علم کا یہ بھی حق ہے کہ جب وہ حصول علم کی تکمیل کر لے تو معاشرے میں اسے اپنی صلاحیت اور اہمیت کے مطابق روزگار فراہم ہو۔ اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ذمہ دار ہے' ضروریات کی فراہمی کا وسیلہ ذریعۂ معاش ہے جو مختلف مراحل کی تعلیم سے فراغت کے بعد اس کی مناسبت سے فراہم ہونا چاہئے۔ بنیادی طور پر یہ مسئلہ مجموعی منصوبہ بندی سے مربوط ہے۔ اقتصادی منصوبہ بندی اور تعلیمی منصوبہ بندی میں ایسا رابطہ ہونا چاہئے کہ معاشرہ بے روزگاری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا شکار نہ ہو۔ ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ روزگار فراہم ہو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود یہ روزگار فراہم کرے۔

## ب): طالب علم پر ریاست یا معاشرہ کے حقوق:

① اولین حق یہ ہے کہ حصول تعلیم و تربیت' اخلاص نیت سے ہو خالق کائنات کے

بندے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس حیثیت کا شروع پیدا کرنا تعلیم کا مقصد اولین ہے' زندگی کی تمام سرگرمیوں کا اور بالخصوص دورانِ تعلیم سرگرمیوں کا محور رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہئے۔ طالب علم اپنی صلاحیتوں کو نشو ونما بھی دے' مستقبل میں معاشرے کے لئے اور خاندان کی کفالت کے لئے اہلیت بھی پیدا کرے' ملک وملت کی خدمت کا جذبہ بھی بیدار کرے لیکن یہ سب اس کے لئے اس کا رب اس سے راضی ہو۔

② طالب علم کو وسیع ترین معنوں میں اپنا فریضہ تصور کرے' سن شعور کو پہنچنے کے بعد ایک مسلمان طالب علم کے رویے میں اس احساس وشعور کا عکس ملنا چاہئے اس کو ذمہ دارانہ رویہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اس کے اجزاء یہ ہیں:

(ا) ذوق وشوق (ب) محنت ومشقت
(ج) دیانتداری (د) احترام اساتذہ
(ہ) خدمت معاشرہ

③ معاشرہ نے اپنے اوپر بارڈال کر بعض صورتوں میں تکالیف اٹھا کر اس کے لئے جو سہولتیں فراہم کی ہیں ان کا ہر ممکن استعمال کرے اور معاشرہ کا احسان مند ہو' بلاوجہ غیر حاضری' لائبریری کی کتب کا عدم استعمال اور جان بوجھ کر توڑ پھوڑ' احسان فراموشی کی تعریف میں آتا ہے۔

④ تعلیم کے لئے مسابقت محض محنت صلاحیت وقابلیت کی بنیاد پر ہو۔ ریاست اس کی ذمہ دار ہو اور ایسی تدابیر اختیار کرے کہ انتخاب میں دولت یا کسی خاص طبقہ سے وابستگی وجہ ترجیح نہ بنے' شہریوں کے درمیان اس بنیاد پر کوئی تفریق نہ ہو۔

⑤ جو علم کی روشنی اسے نصیب ہوئی ہے' اسے آگے پھیلائے' اپنے اہل خاندان میں' محلّہ میں' ملک میں اشاعت وفروغ علم میں مثبت کردار ادا کرے۔

⑥ اسلامی معاشرہ اپنے مسائل حل کرنے کے لئے خدمت معاشرہ کے جو ادارے تشکیل دے ان میں فعال حصہ ادا کرے۔ اس کا ایک پہلو دوران طالب علمی کا رگزاری کا ہے اور دوسرا یہ کہ مدت تعلیم کے اختتام پر ایک مقررہ مدت کے لئے ان اداروں میں ہمہ وقتی کام کرے اور تیسرا یہ کہ برسر روزگار ہونے کے بعد بھی ان اداروں مین معاشرہ کے ایک کارفرما رکن کی حیثیت سے سرگرم دلچسپی لے۔

⑦ طالب علم پر معاشرہ کے حقوق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ حصول علم کے بعد طالب علم کی اولین ترجیح اپنے ملک میں رہ کر خدمت کرنے کی ہو۔ معاشرہ اس کی خدمات کا جو معاوضہ بھی اسے دے سکے وہ اسے قبول کرنا چاہئے اور باہر کی شرح سے مقابلہ کر کے اس معاشرہ کی تضحیک نہیں کرنی چاہئے۔ جس نے اس کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے بہت سے منصوبے موخر کئے۔ اگر سب تعلیم یافتہ افراد اپنے ہی ملک مین اپنی صلاحیتوں اور حوصلوں کو آزمائیں تو ان کے اپنے ملک میں بھی دنیاوی ترقی کی وہ کیفیت نصیب ہوسکتی ہے جو باہر نظر آتی ہے اور بڑے پیمانہ پر باہر جائے کا رجحان ہو تو یہ ملک کو معاشرتی' معاشری' اخلاقی اور نفسیاتی مسائل میں مبتلا کر کے بالآخر بحران کا شکار کر دیتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کے تربیت یافتہ نوجوانوں کا مطمح نظر دنیا نہ ہونا چاہئے ان کی نظر آخرت کے دن پر ہونی چاہئے ...... اگر ملت اسلامیہ کی مجموعی منصوبہ بندی کا تقاضا یہ ہو کہ کچھ افراد باہر جا کر کام کریں تو ملکی منصوبہ بندی کی حدود میں اس کی گنجائش پیدا کی جائے۔

اس بحث کے آخر میں جو نکتہ سب سے زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ اور طالب علم کے حقوق و فرائض اپنی جگہ لیکن اسلامی ریاست کا اصل فریضہ یہ ہے کہ ملک کے ہر بچے کو' لڑکا ہو یا لڑکی' طالب علم بنائے تاکہ مستقبل کا ہر شہری ان حقوق سے متمتع ہو جو ریاست تعلیم گاہوں سے وابستہ طالبانِ علم کو فراہم کر رہی ہے اور ان

فرائض کو بہتر طور پر ادا کرنے کے قابل ہو سکے جس کی توقع ایک اسلامی معاشرہ اس سے کرتا ہے۔

## ج۔ نصاب تعلیم

نصاب نظام تعلیم کا اہم عنصر ہے اور طالب علم کے ذہنی و عملی رویے کی تشکیل میں قابل لحاظ کردار ادا کرتا ہے۔ نصاب کسی بھی نظام تعلیم کا عکس ہوتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اس نظام کو بنانے اور چلانے والے اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ نصاب کے ذریعے مقاصد تعلیم کے حصول کی ایک مؤثر حکمت عملی ریاست کے ہاتھ میں آتی ہے۔

نصاب کی اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طلبہ اور اساتذہ کے باہمی ربط کی بنیاد یہی ہوتا ہے۔ نصاب کے موضوعات ہی استاد کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ طالب علم کے کانوں تک پہنچتے ہی، تبادلۂ خیال انہی موضوعات پر ہوتا ہے اور طالب علم کی تحریری و تقریری مشق، محنت اور امتحان کی تیاری انہی موضوعات کے گرد ہوتی ہے، وہ انہی موضوعات پر مقررہ درسی کتب کے علاوہ دیگر کتابیں تلاش کرتا اور پڑھتا ہے۔

اتنا اہم عامل، قدرتی طور پر اسلامی نظام تعلیم میں بھی اہمیت رکھتا ہے بلکہ نظریاتی ہونے اور طلبہ کی فکر اور سوچ کو واضح رخ دینے میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے نصاب کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اغلباً یہی وہ موضوع ہے جس پر فلسفۂ تعلیم کے بعد مسلم مفکرین نے سب سے زیادہ اظہارِ خیال کیا ہے، خصوصاً گزشتہ ۵۰ سال میں جب سے امت مسلمہ کی فکری قیادت نے احیائے اسلام کی جدوجہد شروع کی ہے اس پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

۸

# معلم کے اوصاف

## باب : ⑧

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

معلم بچوں کی تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک گراں قدر قومی فریضہ ادا کرتا ہے' یہی بچے بڑے ہو کر قوم و ملک کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائیں گے۔ معلم ان کے ذہنوں میں قومی نظریات کو راسخ کرتا' انہیں خودشناسی کی دولت سے مالا مال کرتا اور فرائض کی ادائیگی کا اہل بناتا ہے' یوں وہ افراد کی تربیت کر کے قوم کی تعمیر کرتا ہے۔

ہر نظام تعلیم میں معلم کو وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم میں روح کو اس کے بغیر مدرسہ ایک بے جان لاشہ ہے۔ تعلیمی نظریات بدلے' نصاب اور طریقہ ہائے تدریس میں انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ لیکن ''جائے استاد خالیست'' کے مصداق کوئی چیز معلم کی جگہ نہ لے سکی' اس کا مقام ہمیشہ برقرار رہا' کسی زمانے میں بھی اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکا اور نہ اس کی اہمیت میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس ہوئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مدرسے کی رونق اسی کے دم قدم سے ہے اس وقت تک نصاب بے معنی اور تعلیمی سرگرمیاں سعی بے حاصل ہیں' جب تک استاد اپنی شخصیت کے سحر سے ان میں جان نہیں ڈالتا۔ جدید نظریۂ تعلیم کے مطابق گو مرکزی حیثیت بچے کو دی گئی ہے لیکن بچہ بھی اس حیثیت سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب تک مشفق اور بالغ نظر استاد اسے مستفید کرنے کے لئے وہاں موجود نہ ہو' استاد کے بغیر وسیع و عریض عمارات' جامع نصاب تعلیم' جدید طریقہ ہائے تعلیم اور قیمتی سمعی و بصری اعانتیں بے کار محض ہیں یہ تمام چیزیں بچوں کو کچھ نہیں دے سکتیں' ان کی افادیت کا انحصار استاد پر ہے' کیونکہ یہ استاد ہی ہے جو ان چیزوں کو استعمال کرتا اور اپنے علم'

تجربے اور مبلغانہ جوش سے بچے کی ہمہ گیر تربیت کرتا ہے۔

استاد نصاب کی تدوین میں شریک ہوتا ہے۔ اگر اس کے تجربات سے فائدہ اٹھائے بغیر اور اس کے مشوروں کو نظر انداز کر کے نصاب تیار کیا جائے تو ہرگز مؤثر اور کارآمد نہ ہوگا۔ پھر اس نصاب کی تدریس بھی اسی کے ذمے ہے' اور وہی طریقہ ہائے تدریس کو کامیاب بناتا ہے۔ اس کے علاوہ مدرسے کے نظم وضبط کا دارومدار بھی استاد پر ہے' وہی مدرسے کے قواعد وضوابط کا احترام کرتا اور ان پر عمل درآمد کرتا ہے۔

استاد تعلیم کو ایک بامعنی اور بامقصد عمل بناتا ہے۔ وہ بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتا اور ان کی نشوونما کرتا ہے وہ ان کے شعور کو بیدار اور ادراک کو تیز کرتا ہے استاد بچوں کے اخلاق وکردار کی تربیت کرتا اور انہیں کامیاب اور پُروقار زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے۔ غرض تمام تعلیمی سرگرمیوں کے نتائج کا انحصار استاد کی قابلیت پر ہے' اسی لئے تو قومی تعلیمی کمیشن نے کہا تھا کہ کوئی تعلیمی نظام اپنے اساتذہ کی سطح سے بلند نہیں ہوسکتا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر تعلیمی نظام کے معیار کا دارومدار استاد پر ہے اگر وہ علمی فضیلت کا حامل' پیشہ وارانہ مہارت سے متصف اور اعلیٰ شخصیت کا حامل ہے تو تعلیم کا عمل بھی کامیابی سے ہمکنار ہوگا لیکن ان صفات سے عاری استاد کے ہاتھوں بچوں کا مستقبل یقیناً تاریک رہے گا اور قوم کبھی معزز اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جگہ حاصل نہ کر سکے گی۔

واضح رہے کہ قومیں اس غرض سے مدرسے قائم کرتی ہیں کہ وہ اپنی بقاء کا تحفظ کریں اپنے نظریات علوم وفنون اور ثقافتی اقدار کی اشاعت کریں اور انہیں اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر سکیں۔ نیز وہ اپنے نونہالوں کو اپنے شاندار ماضی کی قابل فخر روایات اور مستقبل کی امنگوں سے روشناس کرائیں یہی ایک طریقہ ہے جس سے قومیں زندہ رہتی ہیں۔ جو قومیں اپنے نظریات کو فراموش کر دیتی ہیں اپنی آزادی کھو دیتی ہیں ان نظریات کی تعلیم کے ذریعے اساتذہ قوموں کو زندہ رکھتے ہیں اسی لئے تو

کہا گیا ہے کہ عظیم اساتذہ کا اثر آئندہ نسلوں تک قائم رہتا ہے کیونکہ انہی کی وجہ سے قوموں کو ترقی نصیب ہوتی ہے اور ان کی اقدار زندہ و پائندہ رہتی ہیں۔

اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی انقلاب اور اصلاحی تحریکیں اساتذہ ہی کی وجہ سے پیدا ہوئیں وہ یونان کا عروج ہو یا فرانس کا انقلاب اصلاحی کلیسا کی تحریک ہو یا عربوں کی کایا پلٹ' یہ سب استاد ہی کے مرہون منت تھے۔ عہد جاہلیت میں عربوں کی جو حالت تھی ان سے کون آگاہ نہیں؟ لیکن معلم اعظم حضرت محمد ﷺ کی تعلیم نے ان کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا' جو پہلے جاہل شتربانوں سے زیادہ کچھ نہ تھے ساری دنیا کے استاد اور تاریکیوں میں بھٹکنے والی قوموں کے رہنما بن گئے' اس سے بڑھ کر معلم کا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے؟

اسلام نے معلم کی بہت قدر افزائی کی ہے طبقۂ معلمین کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے: ''ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو مذہب کا گہرا علم حاصل کرے تا کہ جب دوسرے ان کی طرف رجوع کریں تو وہ ان کو سکھائیں'' ایک اور مقام پر تاکید فرمائی کہ ''اگر تم نہیں جانتے تو عالموں سے پوچھو''۔ ایسے ہی فرمایا جس کو حکمت عطا کی جاتی ہے وہ یقیناً خیر کثیر سے سرفراز ہوتا ہے''۔ ''تم لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا خدا ان کے درجات بلند کرے گا''۔ (سورۃ مجادلہ)

احادیث نبوی میں بھی استاد کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ خود حضور ﷺ نے اپنے معلم ہونے پر اظہار فرمایا ہے: **انما بعثت معلما** (بے شک مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا) اسی طرح ارشاد ہوا۔ ''عالم لوگ پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں''۔ (احیاء العلوم) ایک اور موقع پر فرمایا: ''وہ مسلمان جو شاگرد یا استاد نہیں ہیچ ہے''۔ ایک حدیث میں ہے ''جو دوسروں کو علم سکھاتا ہے وہ خدا کی عبادت کرتا ہے''۔ نیز عالم کی موت قبیلے کی موت سے بڑھ کر ہے''۔ استاد کی فضیلت کے متعلق رسول کریم ﷺ کا

ارشاد ہے کہ ”زمین وآسمان کی ہر چیز استاد کی احسان منداور شکر گزار ہےاور دعائے خیر کرتی ہے“۔ فرمایا ”خدااوراس کے فرشتے اور جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے یہاں تک کہ چیونٹی اپنے سوراخ میں اور مچھلی بھی لوگوں کو بھلائی سکھانے والے پر رحمت بھیجتے ہیں“۔

ہمارے بزرگانِ کرام نے ہمیشہ استاد کے لئے بڑے احترام وعقیدت کا اظہار کیا۔ باب مدینۃ العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول مشہور ہے کہ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا وہ میرا آقا ہے استاد کو روحانی باپ کہہ کر پکارا گیا ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ باپ تو انسان کو وجود میں لانے کا باعث اور اس کی مادی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہے جب کہ استاد اس کی اخلاقی وروحانی تربیت کرتا ہے وہ اسے گمراہی سے بچا کر راہِ ہدایت پر چلاتا ہے‘ اسے نیکی کی طرف راغب کرتا اور اس کی دنیا وعاقبت سنوارتا ہے۔ یوں وہ اس کی دائمی زندگی کا باعث بنتا ہے‘ اس لحاظ سے باپ سے بڑھ کر ہے‘ لیکن صرف وہی استاد جو بچوں سے ماں باپ کی طرح شفقت و محبت اوران کی نگہداشت کرنے والا ہو روحانی باپ کہلانے کا مستحق ہے۔ صرف وہی ایسے انسان پیدا کرسکتا ہے جو صحیح معنوں میں روئے زمین پر خدا کے نائب ہوں۔

استاد کو یہ مقام فضیلت اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اسے مقصد تعلیم سے مکمل آگاہی ہو۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بچوں کو محض چند کتابیں پڑھا دینے سے اس کے فرض کی تکمیل نہیں ہو جاتی ‘ بلکہ اسے ان کی شخصیتوں کی ہم پہلو نشوونما کرنی ہے اور انہیں پسندیدہ معاشرتی اقدار کا حامل اور معاشرے میں اپنی اہلیت واستعداد کے مطابق باعزت مقام حاصل کرنے کے قابل بنانا ہے۔ اس کے ساتھ اسے ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تعلیم کا سب سے بڑا مقصد طلباء کے دل میں اسلامی اقدار کی محبت راسخ کرنا اور خلیفۃ اللہ کے لقب کا مستحق بنانا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ استاد کا فریضہ ہمیشہ بڑا مقدس سمجھا گیا ہے پیغمبران کرام f کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد سے علماء اور اساتذہ ہی علم وحکمت کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں اور انہی پر قوموں کے عروج وزوال کا انحصار رہا ہے اسی لئے ہر معاشرہ بہترین اساتذہ کی تلاش میں رہا ہے ہم اپنے وطن عزیز میں اسلامی جمہوری معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کی لازوال فلاحی قدروں پر مبنی ہو اس غرض سے ہمیں اعلیٰ معیار رکھنے والے اساتذہ کی ضرورت ہے بدقسمتی سے ہمارے ہاں وہ لوگ جو اپنی صلاحیت کی بناء پر واقعی اس فریضے کے اہل ہیں اس طرف راغب نہیں ہوتے عام خیال یہی ہے کہ صرف وہی لوگ اس پیشے میں آتے ہیں جن کو اور کہیں ملازمت نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیشہ بنیادی طور پر اتنا منفعت بخش نہیں یوں تو ساری دنیا میں استاد کی مالی حالت دوسروں کے مقابلے میں غیر اطمینان بخش ہے ہمارے ملک میں یہ کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ دوسرے یہ پیشہ مبلغانہ جوش وجذبے کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت، محنت اور لگن کا تقاضا کرتا ہے جس کیلئے ہر شخص اپنے آپ کو تیار نہیں کر پاتا یوں بھی آج ہمارا معاشرہ مادی نفع ونقصان کا کچھ زیادہ ہی قائل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے استاد کو وہ عزت واحترام حاصل نہیں جس کا وہ اپنے مقام ومرتبے کی وجہ سے مستحق ہے۔ بنابریں قابل لوگوں کو اس پیشے کی طرف راغب کرنے کے لئے اسے پُرکشش بنانا ہوگا۔

## معلم کے اوصاف:

اوپر کی سطور میں ہم نے معلم کا جو مقام متعین کیا ہے اور جس قسم کے فرائض اس کے ذمے لگائے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ وہ چند اعلیٰ ذہنی، جسمانی اور اخلاقی صفات کا حامل ہو۔ مثلاً صحت مند اور پُرجوش قویٰ کا مالک ہو اس کی چال ڈھال اور انداز و اطوار پسندیدہ ہوں۔ علمی فضیلت اور وسیع تجربے کی دولت سے مالا مال ہو ذہین بلند فکر اور بالغ نظر ہو۔ اس کا دل شفقت ومحبت کے جذبات سے معمور اور سچی خدمت

کے جذبے سے سرشار ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے مقاصد تعلیم سے مکمل آگاہی ہو۔ نیز اس نے پوری طرح پیشہ وارانہ تربیت پائی ہو۔ وہ بچوں کی نفسیات کا ماہر ہو اور تدریسی طریقوں پر عبور رکھتا ہو۔ صرف ایسا شخص مذکورہ اوصاف سے متصف ہو اس قابل ہے کہ اسے معلم بننے کا گراں قدر اعزاز بخشا جائے' لیکن مشکل یہ ہے کہ عام طور پر ان تمام صفات کا ایک شخص کی ذات میں مجتمع ہونا امر محال ہے اور پھر ایسی صورت میں جب کہ ناقدری کی بناء پر اعلیٰ قابلیتوں کے حامل لوگ اس پیشے کی طرف رخ نہیں کرتے ایسے ہمہ صفت موصوف معلم کا حصول ضروری ہے جو نہ صرف اس پیشے سے فطری مناسبت رکھتا اور تمام مطلوبہ اوصاف سے آراستہ ہو۔ بلکہ جس نے پیشہ وارانہ تربیت بھی پائی ہو قریب قریب ناممکن ہے اس کے لئے ہمیں ایک اوسط درجے کے نوجوان کی طرف رجوع کرنا ہوگا جسے ضروری علوم اور تربیت سے مزین کر کے کامیاب استاد بنایا جا سکے۔ ہمارے خیال میں ایک اچھے معلم میں مندرجہ ذیل خوبیوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

## ا)......اچھی شخصیت:

تعلیم و تدریس کے عمل میں معلم کی شخصیت بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے اچھے یا برے تعلیمی نتائج کا انحصار بہت حد تک اسی پر ہے۔ صرف ایسا معلم جو اپنی شخصیت سے شاگردوں کو بہتر طور پر متاثر کر سکتا ہے اس قابل ہے کہ وہ ان کی مؤثر طریق سے رہنمائی کر سکے۔ صرف ایسا معلم ہی تدریسی عمل میں بچوں کی دلچسپی کو برقرار رکھ سکتا ہے' اس میں اتنی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو ایک خاص نہج پر چلائے اور ان کی صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما کرے۔ وہ استاد جو طلباء کو متاثر کرنے کی صفت سے عاری ہے اپنے مقاصد میں ناکام رہے گا۔ ایک اعلیٰ شخصیت کا مالک اُستاد زیادہ سے زیادہ طلباء کو بہترین انداز میں مستفید کر سکتا ہے' اسے طلباء کا خوش دلانہ تعاون حاصل ہوتا ہے اور اس کی بدولت وہ ان سے ان کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق کام لے کر

ان کی اعلیٰ تربیت کر سکتا ہے۔ اچھی شخصیت کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں اصلاح پذیری اور ماحول سے مطابقت کی قابلیت ہوتی ہے' وہ موقع محل کے مطابق موزوں طرزِ عمل اختیار کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے' اس کے جذبات میں توازن اور حرکات وسکنات میں وقار ہوتا ہے وہ خود بھی نظم و ضبط کا پابند ہوتا ہے اور بچوں کو بھی اس کا خوگر بناتا ہے واقعتاً ایسا شخص ہی بچوں کی نظروں میں عزت واحترام کا مستحق اور ہر دلعزیز ہوتا ہے۔

شخصیت بڑا جامع لفظ ہے اس میں جسمانی صحت اور ذہنی کیفیات' لباس' آواز' لب ولہجہ' انداز و اطوار اور اخلاق سبھی کچھ شامل ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان کا قدرے تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

## صحت:

جسم انسانی شخصیت کا بڑا اہم جزو ہے اور اس کی صحت مندی پر شخصیت کی دلکشی کا انحصار ہے صحت منداونچا قد' بھرا بھرا جسم' پُر کشش خدوخال' سنجیدگی اور مسکراہٹ کا مرقع چہرہ' باوقار چال اور پُر تاثیر نظریں دلکش شخصیت کی ضامن ہیں۔ انسانی جسم ہی شخصیت کا وہ حصہ ہے جو سب سے پہلے دیکھنے والے کو متاثر کرتا ہے' ذہنی اور اخلاقی خوبیاں اور دیگر صفات تو انسان کی گفتگو یا عمل سے ظاہر ہوتی ہیں۔

تندرست' جاندار' قوی اور جوشِ عمل سے بھر پور جسم تمام تدریسی اور غیر تدریسی سرگرمیوں کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اس کے برعکس ایک بے جان' دھان پان' بیماریوں کا شکار جسم اسے لذاتِ کار اور کامرانیوں سے محروم رکھتا ہے' بیمار اور غیر دلکش جسم نہ صرف عزت واحترام حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اکثر اوقات طلباء اسے نشانہ تضحیک بناتے ہیں۔ نتیجتاً ایسا آدمی ذہنی اور اخلاقی ناہمواری کا مریض بن جاتا ہے۔ صحت منداستاد تدریس اور دیگر فرائض کو بہتر طریق سے ادا کرتا ہے جب کہ غیر صحت منداستاد ناکام رہتا ہے یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا

ہے۔ صحت مندی سے مراد یہ نہیں کہ استاد پہلوان یا حسن انسانی کا کامل نمونہ ہو بلکہ یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں تندرست، متوازن جسم کا مالک اور صحت مند ہوتا کہ وہ کمرہ جماعت اور کھیل کے میدان میں ہر جگہ ہر قسم کی تدریسی اور سماجی فعالیتوں میں بھرپور حصہ لے اور طلباء کی رہنمائی اور مدد کر سکے۔ جسمانی اور ذہنی صحت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مشہور انگریزی مثل ہے کہ ''صحت مند دماغ صحت مند جسم ہی میں ہوتا ہے''۔ جسمانی طور پر تندرست آدمی کا ذہن صحیح طور پر کام کرتا ہے تندرست آدمی کی سوچ واضح اور متوازن ہوتی ہے نیز اس کے جذبات میں توازن اور اعتدال ہوتا ہے۔ صحت وتندرستی سے چہرے پر تازگی اور بشاشت ظاہر ہوتی ہے جب کہ غیر صحت مند آدمی کے چہرے سے نحوست ٹپکتی ہے اور وہ ہر کام سے بلکہ اپنے آپ سے بھی بیزار نظر آتا ہے واقعی اچھی شخصیت اچھے استاد کا طرۂ امتیاز ہے۔

**لباس:**

اچھا لباس انسان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ یہ صرف ستر پوشی اور موسم کے خلاف جسم کی حفاظت ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے شخصیت میں وقار بھی آتا ہے۔ کسی شخص کا ظاہری معیار اس کے لباس ہی سے ظاہر ہوتا ہے، گو کسی شخص میں علمیت یا دوسری بہت سی خوبیاں موجود ہوں لیکن اس کی شائستگی کا پہلا تاثر اس کے لباس ہی سے قائم ہوتا ہے، اس لئے استاد کو ہمیشہ اپنی شان کے شایان لباس پہننا چاہئے، اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ لباس نہایت قیمتی، شوخ یا زرق برق ہو، استاد کا لباس سادہ، صاف ستھرا اور باوقار ہوتا کہ نہ تو اس کو فلمی اداکار ہونے کا طعنہ دیا جا سکے اور نہ اس پر کم حیثیت گدا کی پھبتی کسی جا سکے، بس اوسط درجے کا لیکن مہذب اور باوقار لباس کافی ہے۔

## انداز و اطوار:

معلم کا انداز نشست و برخاست، رفتار، گفتگو غرض ہر چیز شائستہ اور پسندیدہ ہونی چاہئے، اس کی ہر بات اور ہر کام میں ایک سلیقہ اور قرینہ ہونا چاہئے، آدابِ محفل کا خیال رکھے اور بچوں کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کرے، نہ کسی کو مذاق کا نشانہ بنائے اور نہ دوسروں کو یہ دعوت دے کہ وہ اس کا مذاق اڑائیں، چغل خوری اور بچوں کی توہین و تضحیک سے پرہیز کرے۔ تمام بچوں سے مساوی سلوک، ہر ایک سے شفقت و محبت کا برتاؤ، رکھ رکھاؤ اور سلیقہ مندی اچھے انداز و اطوار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ معلم کمرۂ جماعت میں باوقار طریقے سے کھڑا ہو۔ یوں اِدھر سے اُدھر پھرنا جیسے شیر پنجرے میں ٹہل رہا ہو، ٹانگیں میز پر پھیلا کر یا کسی پر اکڑوں بیٹھنا، وقت بے وقت سر کھجانا، سر پر ہاتھ پھیرتے رہنا، عینک کو ہاتھ لگانا، ناک میں انگلی ڈالنا، مضحکہ خیز تکیہ کلام مثلاً یعنی، میرا مطلب ہے، سمجھے کہ نہیں، میں کہہ رہا تھا وغیرہ سب ناپسندیدہ ہیں اور استاد کو ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔ وہ ترش روئی سے بچے، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور محبت بھرا برتاؤ دیکھ کر ہر ایک کو اپنائیت کا احساس ہوگا۔

## آواز:

آواز، اس کا زیر و بم اور لب و لہجہ انسان کی شخصیت کا بہت اہم جزو ہے۔ کسی کی آواز اور انداز گفتگو سے اس کا تہذیبی معیار ظاہر ہوتا ہے۔ معلم کی آواز نہایت باوقار اور مؤثر ہو، اس کا لب و لہجہ ایسا ہو کہ سننے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ادبی موضوع سے متعلق سبق خصوصاً استحسانی سبق مثلاً نظم میں موزوں لب و لہجہ بہت ضروری ہے اور اسی طرح سبق کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر موضوع رزمیہ ہے تو معلم کی آواز میں بہادروں کی سی گھن گرج ہو۔ رومانی یا طربیہ ہو تو لب و

لہجہ میں دلآویزی ہو جیسے مسرتوں اور مسکراہٹوں کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ موضوع غمناک ہو تو معلم اسے اس طرح ادا کرے کہ طلباء کے دلوں میں بھی وہی کیفیات پیدا ہوں جو لکھنے والے کا مطمح نظر تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ استحسانی سبق تبھی کامیاب گنا جا سکتا ہے جب معلم اس میں آواز اور لب ولہجہ سے جذبات کا رنگ بھر دے۔ غرض معلم کی آواز اور لب ولہجہ سبق کے بالکل مطابق اور مناسب حال ہو' آواز نہ تو اتنی بھاری ہو کہ اس پر پھٹے ڈھول کا گمان گزرے نہ اتنی باریک کہ اس میں نسوانیت ہو اور لڑکے معلم کا مذاق اڑائیں' نہ اتنی بلند کہ کانوں کے پردے پھاڑے' نہ اتنی پست کہ اگلے ڈیسک پر بیٹھنے والے لڑکوں کے سوا کسی کو سنائی ہی نہ دے۔ زیادہ بلند آواز طلباء کو بے زار کر دے گی اور زیادہ پست آواز سے جماعت کے نظم ونسق میں خلل آ جائے گا۔ دونوں صورتوں میں تدریس ناکام ہوگی۔ پس یہ ضروری ہے کہ آواز کو مناسب سطح (Pitch) پر رکھا جائے اور ہر لفظ کو واضح طور پر رموز اوقاف کا خیال رکھتے ہوئے موزوں رفتار اور لہجے سے ادا کیا جائے۔

ب)...... علمی فضیلت:

علمی فضیلت اچھے معلم کی بنیادی صفت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ معلم اپنے مضمون کا ماہر ہو اس نے اس کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہو۔ اس کے تمام نکات اور باریکیوں سے واقف ہو۔ کسی علم کا محض پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ اس کی تعلیم اس طرح پائی ہو کہ وہ علم معلم کی شخصیت کا حصہ بن چکا ہو۔ کہنے کو تو لوگ کہتے ہیں کہ ''آدمی وہ کچھ بھی پڑھا سکتا ہے جسے وہ خود بھی نہ جانتا ہو'' لیکن صحیح تعلیمی نتائج حاصل کرنے کے لئے کسی مضمون میں مہارت نہایت ضروری ہے اس کے بغیر تدریس سعی لا حاصل اور محض تضیع اوقات ہوگی۔

معلم خود بلند پایہ علمی ذوق سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں میں بھی حصول علم کی لگن پیدا کرنے کے قابل ہو۔ وہ طلباء میں علم کی سچی محبت پیدا کرے

سکے تاکہ وہ اپنی تمام عمر سرمایہ علم میں اضافہ کرنے میں گزار دیں' یہ ذوق وشوق طلباء میں تبھی پیدا ہوسکتا ہے جب معلم خود بحرِ علم کا شناور ہو۔

یہاں ایک اور نکتہ قابل غور ہے۔ تعلیم ایک وحدت ہے' اسے مختلف خانوں یا ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے محض سہولت کی خاطر اسے مضامین میں بانٹ رکھا ہے' اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مضامین کو مربوط کر کے پڑھانا چاہئے' کیونکہ کوئی مضمون دوسرے سے غیر مربوط رکھ کر صحیح طور پر نہیں پڑھایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ہر مضمون میں دیگر مضامین کے مطالب اور اصطلاحات وغیرہ استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ذوق کے قصائد پڑھائیں تو ان میں طب اور نجوم کی اصطلاحات ملیں گی' ان کی تشریح کے بغیر ان قصائد کی تدریس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی سائنس کے مضامین میں ریاضی کا کافی حصہ ہوتا ہے' اس میں مہارت حاصل کئے بغیر چارہ نہیں۔ پس معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ مطالعہ کو محض اپنے مضمون تک محدود نہ رکھے بلکہ دوسرے مضامین بھی پڑھے خاص طور پر ایسے مضامین جن کا اس کے اپنے مضمون سے زیادہ ربط ہو۔ علاوہ ازیں کسی مضمون کا محض ایک بار مطالعہ کر لینا کافی نہیں۔ علوم میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے' نئے حقائق کا انکشاف ہو رہا ہے' ہر موضوع پر تحقیقات جاری ہیں اور نئے نئے گوشے بے نقاب ہو رہے ہیں' تحریکات جنم لے رہی ہیں' پرانے نظریات کی تصدیق یا تردید کا عمل جاری ہے' تعلیم میں نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ معلم کے لئے ان سے آگاہ ہونا ضروری ہے ورنہ اس کی مثال اس مینڈک کی سی ہے جو کنوئیں میں مقید رہتا ہے اور اسی کو ساری دنیا سمجھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ معلم جو مسلسل اضافی مطالعہ کے ذریعہ اپنے علم کو وسیع نہیں کرتا اپنے فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے اور کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کے خیالات جامد' شخصیت بے حس اور تدریس غیر مؤثر ہوتی ہے' معلم کو اپنے علم کو تازہ رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ مثلاً

① اسے چاہئے کہ وہ کتب خانوں سے استفادہ کرے۔ جدید کتب و رسائل' جرائد اور اخبارات کا مطالعہ کرے۔ خصوصاً اپنے مضمون کے بارے میں چھپنے والی ہر کتاب کو ضرور پڑھے تا کہ اسے معلوم ہو کہ اس مضمون میں کیا تبدیلیاں یا اضافے ہو رہے ہیں اور ان میں کون سے نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں؟ اضافی مطالعہ سے اس کا ذہنی افق وسیع ہوگا۔ افکار میں گہرائی آئے گی اور شخصیت میں جامعیت پیدا ہوگی۔

② عام مطالعہ کے علاوہ وہ رسمی تعلیم بھی جاری رکھے۔ اگر اس نے بی اے پاس کیا ہے تو ایم اے کا امتحان دے' اگر اعلیٰ تعلیم کے لئے کوئی غیر ملکی وظیفہ ملے تو اس سے بھی فائدہ اٹھائے۔

③ خود اپنے مضمون میں تحقیق کرے اور مقالات لکھے' اس سے مزید مطالعہ کی تحریک ہوگی۔

④ علمی مجالس میں شرکت کرتا رہے تا کہ دوسروں کے مطالعہ اور علم سے مستفید ہو اور اس کے اپنے علم میں اضافہ ہو' مدرسے میں ایسی مجالس منعقد کی جائیں جن میں باہر سے ماہرین کو بلایا جائے اور وہ آ کر اپنے موضوع کے متعلق اظہارِ خیال کریں۔

⑤ شعبہ جاتی اجلاسوں میں تعلیمی و تدریسی موضوعات کے ساتھ ساتھ خالص علمی موضوعات پر بھی بحث ہوتی ہے' ضروری نکات کی وضاحتیں ہوتی ہیں' اشتباہات رفع ہوتے ہیں' ایک دوسرے کے تازہ علم سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے' معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اجلاسوں میں شریک ہو کر اپنے علم میں اضافہ کرے۔

## ج)......بچوں کی نفسیات کا علم:

معلم کے لئے نہ صرف اپنے مضمون میں مہارت ہی کافی نہیں' بلکہ اسے شاگردوں کی شخصیت کے متعلق مکمل واقفیت بھی ضروری ہے۔ یوں تو دورانِ تربیت میں اساتذہ کو تعلیم کے بہت سے شعبوں کا مطالعہ کرایا جاتا ہے' لیکن اس میں نفسیاتی کو اس وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ یہ تمام تعلیمی سرگرمیوں کی بنیاد ہے۔ استاد کے لئے بچوں کی نفسیات کا علم ناگزیر ہے' اس وجہ سے اس کا ذکر خصوصی طور سے کیا جارہا ہے۔

جدید نفسیاتی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ بچوں کے متعلق تفصیلی علم' ان کی نفسیات سے آگاہی' ان کے فطری رجحانات اور تفریحی مشاغل سے واقفیت کے بغیر مؤثر تعلیم ممکن نہیں۔ بچے کی تربیت پر بہت سے عوامل اثرانداز ہوتے ہیں۔ جیسے۔

① انفرادی اختلافات۔
② خانگی اور سماجی ماحول کے اثرات۔
③ طبقاتی تفاوت۔
④ مدرسے کا ماحول وغیرہ۔

جب تک معلم کو ان کا پورا علم نہ ہو اور وہ یہ نہ سمجھ لے کہ یہ کس طرح بچے کی شخصیت پر اثر کرتے ہیں وہ تدریس کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

سب سے پہلے ہم انفرادی اختلافات کو لیتے ہیں۔ بچے صرف شکل وصورت ہی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے بلکہ ان میں ذہنی' نفسیاتی اور جذباتی تفاوت بھی ہوتا ہے۔ ایک جماعت میں تمام بچے یکساں ذہانت اور صلاحیت و استعداد کے مالک نہیں ہوتے' ان کی ذہنی سطح اور علمی معیار میں بڑا فرق ہوتا ہے' جس کا جاننا استاد کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ تدریس کو ہر ایک کے لئے دلچسپ بنائے اور اس میں اتنی لچک ہو کہ ذہین اور کمزور ہر طرح کے بچے اس

سے یکساں استفادہ کرسکیں۔ اگر معلم سبق کو مشکل انداز میں پڑھائے گا تو اوسط اور کمتر ذہانت والے بچے منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور وہ کمزور بچوں کی خاطر سبق کو بہت زیادہ آسان کردے گا تو اس سے ذہین بچوں کو مایوسی ہوگی اور سبق میں ان کی دلچسپی ختم ہوجائے گی۔ نفس مضمون کے علاوہ معلم کو رفتار تدریس میں بھی فرق رکھنا ہوگا تاکہ وہ تمام بچوں کو ساتھ لے کر چل سکے۔

اسی طرح سب بچوں سے یکساں اکتساب کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ اگر استاد کو بچوں کے انفرادی اختلافات کا علم نہ ہو تو اسے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کوئی ذہین بچہ کمتر اکتساب کا مظاہرہ کررہا ہے یا کسی غبی بچے کو اس کی اہلیت سے بڑھ کر کام میں مجبور کیا جا رہا ہے جو بچے کو بددل کرنے اور احساس کمتری میں مبتلا کرنے کا باعث ہے۔

بعض بچے شرمیلے اور ڈرپوک ہوتے ہیں' لازم ہے کہ استاد ان کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوکر نشوونما پاسکیں۔ بچوں کی جذباتی کیفیات بھی مختلف مواقع پر مختلف ہوتی ہیں' کبھی خوش ہوں تو ان میں جوش اور کام کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور استعداد بڑھ جاتی ہے لیکن اگر کسی ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے مغموم ہوں تو ان کی کام کرنے کی امنگ ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔ معلم کو بچوں کی ان بدلتی ہوئی جذباتی کیفیات کا علم ہونا چاہئے۔

معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچے کی فطرت کے تقاضوں سے آگاہ ہو' بچوں میں خودنمائی اور دوسروں سے سبقت لے جانے کا جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے' معلم کو ان سے فائدہ اٹھانا آتا ہو۔ اگر معلم کو بچوں کی نفسیات کا علم ہوگا تو وہ ان سے ان کی اہلیت اور مزاج کے مطابق کام لے گا' ان کی مدرسے سے دلچسپی بڑھتی جائے گی اور یوں ان کا بددل ہوکر مدرسہ چھوڑ جانے کا امکان ختم ہوجائے گا۔

خانگی اور سماجی ماحول کے اثرات بچے پر بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ جو والدین جاہل' کمتر ذہنی استعداد کے مالک یا افلاس کا شکار ہوں ان کے بچے بھی غیر

متوازن اور ناہموار شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اسی طرح مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے بچے عموماً نالائق، گستاخ، جھگڑالو اور بھگوڑے ہوتے ہیں، اکثر وہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس پڑھے لکھے اور آسودہ حال والدین کے بچے مطمئن، مسرور، پُر اعتماد اور پڑھائی کے دلدادہ نظر آتے ہیں اور ان میں اکتساب کی اہلیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ معلم کے لئے خانگی اور سماجی ماحول کے اثرات کا علم بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر بچے کے گھریلو حالات سے مکمل واقفیت حاصل کرے اور اس کے مطابق اپنا تدریسی لائحہ عمل تیار کرے۔ اسے چاہئے کہ وہ ان پڑھ گھرانوں سے آنے والے بچوں کی خصوصی مدد کرے۔ وہ دیہات سے آنے والے بچوں کے لئے اسی ماحول سے مثالیں اور توضیحات پیش کرے۔ شہری بچوں کیلئے ان کے ماحول کے مطابق توضیحات بروئے کار لائی جائیں۔ معلم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ بچے اپنا فارغ وقت کیسے گزارتے ہیں، فرصت کے اوقات میں ان کے مشاغل کیا ہیں؟ معلم کو ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روزانہ اسباق کو ان سے مربوط کرنا چاہئے۔ اگر بچے گھر پر کسی صنعت میں والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں تو سکول کے سائنس روم یا ورکشاپ میں ان کے سبق کو مؤثر اور آسان بنایا جاسکتا ہے۔ اگر وہ فاضل وقت میں کھیتی باڑی کرتے ہیں تو ان سے مدرسے کے زرعی فارم کو بہتر بنانے میں کام لینا چاہئے۔ اسی طرح معلم کو بچوں کے طبقاتی اختلافاتی، رنگ و نسل، زبان اور علاقوں کے امتیازات کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔

## د)...... سماجی مشاغل سے دلچسپی:

آج کل تعلیم صرف کمرۂ جماعت میں بچوں کو نصابی مضامین پڑھا دینے کا نام نہیں بلکہ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوگیا ہے۔ ماہرین تعلیم کا یہ اصرار ہے کہ بچے کی شخصیت کا ہمہ پہلو نشوونما کے لئے اس کا محض کتابی علم حاصل کرنے کے علاوہ سماجی

فعالیتوں میں بھرپور حصہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ مدرسے کے اندر اور باہر دونوں جگہ غیر نصابی مشاغل کا اہتمام کیا جائے۔ مثلاً تربیت جسمانی' کھیل' تعلیمی سیریں' سکاؤٹنگ' بحث مباحثے' ڈرامے' خدمت خلق وغیرہ۔

ر)...... غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ:

آج کل چونکہ انہیں باقاعدہ طور پر تعلیمی سرگرمیوں میں شمار کیا جاتا ہے اس لئے استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان میں دلچسپی رکھتا ہو اور ایک دو میں خاص طور پر ماہر ہو' اس مین اتنی اہلیت ہو کہ اگر بعض سرگرمیوں کی تنظیم کا کام اس کے سپرد کر دیا جائے تو وہ اسے بطریق احسن انجام دنے سکے۔

ز)...... پیشہ وارانہ تربیت:

تدریس ایک فن ہے اور ہر فن کی طرح اس میں بھی تربیت اور مہارت کی ضرورت ہے۔ تربیت حاصل کئے بغیر تدریس بالکل غیر مؤثر رہے گی اور اس سے مفید تعلیمی نتائج برآمد نہیں ہوسکیں گے۔ ہمارے ہاں بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ معلم کے لئے تربیت ضروری نہیں۔ اگر اس نے عمومی تعلیم حاصل کر لی ہے اور وہ مضامین جو اسے ثانوی مدرسے میں پڑھانے ہیں انہیں اعلیٰ درجے یعنی بی اے یا ایم اے کی سطح تک پڑھ لیا ہے تو یہ اس کے لئے بالکل کافی ہے' یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے' صرف مضامین میں مہارت سے کام نہیں چلتا ان مضامین کے مکمل ابلاغ کے ذرائع یعنی انہیں بچوں تک وضاحت کے ساتھ پہنچانے کے طریقوں کا علم بھی ناہیت ضروری ہے۔ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ معلم میں تدریس کی اہلیت بھی ہونی چاہئے' وہ بہتر تدریس کے اصولوں اور طریقوں سے واقف ہو۔ آج استاد کا کام بچوں کو محض مضامین کے مطالب سے آگاہی بخشنا یا ہدایت نہیں بلکہ بچوں کی شخصیت کی بھرپور نشوونما ہے۔ محض علمی قابلیت کے بل بوتے پر وہ اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا' اسے پیشہ وارانہ مہارت کی بھی ضرورت ہے۔

مسلم ہے کہ ہر کام کرنے کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں' لیکن ان میں صرف چند ایک ہی وقت' محنت اور سرمایہ کی بچت کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ تدریس کے بھی بہت طریقے ہیں لیکن ایسے طریقے جن میں بچت اور سہولت ہو بہت تھوڑے ہیں۔اس کے علاوہ بعض طریقے اگر ایک وقت پر کارگر ہیں تو دوسرے موقع پر قطعاً بے فائدہ ہیں۔

قابل احترام استادِ محترم! ان باتوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمہ وقت اس چیز کا خیال رکھئے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کی شخصیت کو آپ کے طالب علم کے لئے ایک مثالی استاد بنانے میں انتہائی ممدومعاون ثابت ہوتی ہیں۔

۹

# تدریس کے عام اصول

## باب : ⑨

ذیل میں تدریس کے کچھ عام اصول دیئے جا رہے ہیں' یہ طویل تدریسی تجربات اور بچوں کی نفسیات کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں۔ سارے مضامین اور ہرطرح کے اسباق میں انہیں حتیٰ الامکان ملحوظ رکھنا چاہیئے تا کہ تدریس مفید اور مؤثر ہو سکے۔

① آمادگی کا اصول یعنی طلبہ کو بخوبی آمادہ کر کے سبق شروع کیا جائے کیونکہ جس کام کے لئے طبیعت پورے طور پر آمادہ ہوتی ہے وہ مستعدی اور انہماک سے کیا جاتا ہے اور جو کام کسی طرح کے دباؤ یا جبر کے تحت انجام پاتا ہے وہ بے کار سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بچے توجہ اور انہماک سے گھبراتے ہیں' کسی طرح کا جبر اور دباؤ پسند نہیں کرتے' لکھنے پڑھنے جیسے خشک کام سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ چنانچہ انہیں لکھنے پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لئے اساتذہ عموماً ڈراتے دھمکاتے اور جبر و تشدد سے کام لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر بچے اس خشک کام سے اور زیادہ گھبرانے اور تعلیم سے بھاگنے لگتے ہیں اور جو مارے باندھے رہ جاتے ہیں وہ کام میں پوری دلچسپی نہیں لیتے اس لئے پڑھانے سے پہلے بچوں کو اس کے لئے بخوبی آمادہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے حسب موقع مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔

☆ موزوں سوالات' مختصر گفتگو' خوش رنگ تصاویر' جاذب توجہ ماڈلوں وغیرہ کے ذریعے نئی معلومات کے لئے بچوں کا تجسس بیدار کر دیا جائے۔

☆ پھر سبق کی غرض و غایت اور جو کچھ پڑھنے جا رہے ہیں اس کی ضرورت و

افادیت بخوبی ذہن نشین کرادی جائے۔

☆ کام میں کھیل یا مسابقت کی اسپرٹ پیدا کردی جائے یا تدریسی مواد کو کہانی کی شکل میں پیش کیا جائے۔

☆ بچوں کو کچھ بنانے یا عملی کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

☆ سبق کو آگے بڑھانے میں ان کی امداد اور مشوروں کو اہمیت دی جائے۔

آمادگی کے بعد توجہ اور دلچسپی کا مسئلہ بھی بہت کچھ حل ہو جائے گا کیونکہ جس کام کو کرنے کے لئے بچے بخوشی آمادہ ہو جائیں گے' اس پر پوری توجہ بھی صرف کریں گے اور بعد میں خواہ دشواریاں بھی پیش آئیں پورے انہاک اور دلچسپی سے کام کریں گے۔

۲ انتخاب کا اصول یعنی بچوں کو صرف وہی کچھ پڑھایا اور سکھایا جائے جو ان کے لئے نہایت ضروری' مفید' مناسب' اور ان کی فطرت و صلاحیت اور مقصد کے عین مطابق ہو اور جسے معلم اپنے محدود وسائل و ذرائع سے بخوبی انجام دے سکتا ہو۔

ہم سب جانتے ہیں کہ علم ایک بحر ذخار ہے جب کہ مدت تعلیم انتہائی قلیل اور مہلت زندگی نہایت محدود زندگی بھر غوطے لگائیے آپ ساحل سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور چند سنگ ریزوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا اور بہت سی باتیں تو بچوں کے لئے یوں بھی قبل از وقت ہوتی ہے' اس لئے معلم کو چاہئے کہ نہایت احتیاط سے انتخاب کرے اور اسی کے حصول پر بچوں کا وقت صرف کرائے جو واقعہ ضروری اور نفع بخش ہو' فضول اور لایعنی امور میں وقت ضائع نہ ہونے دے۔ علاوہ ازیں سبق کو دلچسپ اور مؤثر بنانے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

۳ زندگی سے مربوط کرنے کا اصول یعنی جدید معلومات حتی الامکان بچوں کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات ان کی سابقہ معلومات' ان کے تجربات و

مشاہدات اور روزمرہ کی زندگی سے مربوط کر کے فراہم کی جائیں۔ اس طرح بات بآسانی سمجھ میں آ جائے گی اور بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی ساتھ ہی بچوں پر جدید معلومات کی ضرورت و افادیت واضح کرنی اور روزمرہ کی زندگی میں اس کے استعمال کا سلیقہ سکھانے میں بھی مدد ملے گی۔ جس چیز کا زندگی سے کوئی ربط محسوس نہ ہو یا اس کی ضرورت نظر نہ آئے اسے سیکھنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اور نہ زیادہ دیر تک وہ ذہن میں محفوظ رہتی ہے۔ مثلاً طہارت وغیرہ کے وہ مسائل جن کی ضرورت بلوغ کے بعد ہوتی ہے' اول تو قبل از وقت ہونے کی وجہ سے چھوٹے بچوں کی سمجھ میں نہیں آتے' دوسرے ضرورت پیش نہ آنے کی وجہ سے زیادہ دنوں تک یاد بھی نہیں رہ سکتے۔

④ خود کر کے سیکھنے کا اصول یعنی ساری باتیں خود بتا دینے کے بجائے' بچوں کو خود کر کے سیکھنے کے بیش از بیش مواقع دیئے جائیں جن اسباق میں کر کے سیکھنے کے امکانات نہ ہوں ان کو بھی کم از کم کسی عملی کام پر ختم کیا جائے مثلاً زبانی بتا چکنے پر اس سے متعلق تحریری کام لینا معلوماتی اسباق سے متعلق ایسے کام سپرد کرنا جس میں بچوں کو خود کچھ کرنا پڑے مثلاً ٹکٹ یا تصاویر جمع کرنا' کوئی ماڈل یا منظر بنانا' پھول' پتیاں وغیرہ جمع کرنا۔

بچے چونکہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں اور بناتے بگاڑتے رہتے ہیں' اسی میں انہیں لطف بھی آتا ہے اور اسی طرح وہ بہت کچھ سیکھتے اور تجربات حاصل کرتے ہیں' اس لئے اگر تدریس میں اس کا اہتمام کیا جائے تو تعلیم زیادہ آسان' مؤثر اور دلچسپ ہو جاتی ہے اور بچے جو کچھ سیکھتے ہیں وہ زیادہ پختہ اور دیرپا ہوتا ہے مثلاً وضو' نماز کا طریقہ زبانی بتانے کے بجائے عملاً کراتے ہوئے بتایا جائے اور حسب ضرورت اصلاح کر دی جائے تو بچے پوری دلچسپی سے سیکھیں گے اور انہیں بآسانی یاد ہو جائے گا۔

⑤ تقسیم کا اصول یعنی جو کچھ پڑھانا ہو اسے مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے پڑھایا جائے یہ تقسیم اس انداز کی ہو کہ ہر جزا اپنے پہلے اور بعد کے اجزاء سے فطری طور پر مربوط بھی رہے اور بیچ کی منزل اور کڑی بھی ہو۔ اس طرح قدم بقدم آگے بڑھنے اور مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے معلومات بہم پہنچانے سے سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے اور پوائنٹ وار ترتیب سے یاد بھی ہو جاتا ہے' اس کا لحاظ کئے بغیر تعلیم دینے سے معلومات الجھی ہوئی اور گنجلک رہتی ہیں اور بوقت ضرورت ٹھیک طرح سے استعمال نہیں ہو پاتیں۔

⑥ اعادے کا اصول یعنی جو کچھ بچوں کو پڑھایا جائے اس کا اعادہ اور مشق کرا کے خوب یاد کرا دیا جائے۔ بہت زیادہ معلومات بہم پہنچانے کی فکر میں اکثر اساتذہ اعادے کی طرف سے غفلت برتتے ہیں جس کا انہیں بہر حال خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے کیونکہ بچوں کو پچھلا بھی بھول جاتا ہے اور اگلا ان کی سمجھ میں آتا نہیں' اس لئے اعادے اور مشق کی طرف غیر معمولی توجہ دینی چاہئے۔ سبق کے ہر جز کے بعد اس جز کا اور سبق کے اختتام پر پورے سبق کا اعادہ کرایا جائے اور جو قاعدہ بھی سکھایا جائے اس کی خوب مشق کرائی جائے ہر سبق کے آخر میں پابندی سے کچھ وقت اور ہفتے میں کم از کم ایک دن اعادہ اور مشق کے لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ ہفتے بھر کا کام بخوبی ذہن نشین ہو جائے بغیر اعادے کے آگے نہ بڑھا جائے سوچنے کی بات ہے جس علم پر بچوں کو قدرت حاصل نہ ہو سکے وہ آخر ان کے کس کام کا ہوگا؟

تدریس کے گر تدریس کے عام اصول بتا دینے کے بعد اب ذیل میں پڑھانے کے چند ایسے گر بتائے جا رہے ہیں جو ابتدائی درجات کے طلبہ کی تدریس میں تجربے سے بہت مؤثر اور مفید ثابت ہوئے ہیں چنانچہ ان کو فن تدریس میں مسلمہ ضابطوں کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے' یہ اگرچہ نفسیات کی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہیں اور عقل

بھی ان کی صداقت اور افادیت کی گواہی دیتی ہے اس لئے حتیٰ الامکان ان پر عمل کرنا چاہئے البتہ معلم کو چاہئے کہ حسب ضرورت ان میں تصرف کرلیا کرے، خصوصاً جب وقت محدود ہو یا جب زیادہ عمر کے طلبہ یا بالغوں کو پڑھانا ہو۔

① معلوم سے نا معلوم کی طرف چلیں یعنی بچے جو کچھ پہلے سے جانتے ہوں اسی کے سہارے انہیں نئی باتیں بتائی یا سمجھائی جائیں۔ تدریس کا یہ فطری طریقہ ہے اسی طرح بات ٹھیک سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اول تو بچوں کا ذہن انہیں چیزوں میں توجہ و دلچسپی کا اظہار کرتا ہے جن میں ندرت اور نئے پن کے ساتھ کسی حد تک انسیت بھی ہو۔ بالکل نئی چیز جس کا سابقہ تجربات و مشاہدات سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہ ہو بچوں کے نزدیک کبھی قابل اعتنا نہیں ہوتی دوسرے نئی چیزوں کی تشریح و توضیح بہرحال سابقہ معلومات ہی کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔

اس گر کا تقاضا ہے کہ تدریس میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ ہر نئے سبق سے متعلق سب سے پہلے بچوں کی لیاقت سابقہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کر لیا جائے تاکہ اسی کی بنیاد پر نئی باتیں بتائی یا سکھائی جاسکیں۔

☆ سبق کی تمہید میں ایسے سوالات کئے جائیں جن سے بچوں کی اس ضمن کی سابقہ معلومات کا بخوبی اندازہ ہوسکے' سوالات موضوع سے متعلق ہونے کے ساتھ اتنے آسان ہونے چاہئیں کہ بچوں کو جواب میں دشواری نہ ہو اور ایسے انداز سے پوچھے جانے چاہئیں کہ بچے اپنا مافی الضمیر اگل دیں۔

☆ ایک مضمون کے مختلف اسباق اس انداز سے ترتیب دیئے جائیں کہ ہر اگلے سبق کا پچھلے اسباق سے تعلق قائم ہوتا جائے۔

☆ ہر نیا سبق بچوں کی روزانہ زندگی یا ان کے تجربات و مشاہدات سے مربوط کر کے پڑھایا جائے۔

☆ جدید معلومات کا بچوں کی سابقہ معلومات سے موازنہ و مقابلہ کر کے مشابہت یا فرق اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا جائے۔

☆ بچوں کے تجربات ناقص اور تصورات مبہم ہوتے ہیں' اس لئے ان کی سابقہ لیاقت سے سبق میں فائدہ اٹھاتے وقت ان کے سابقہ تصورات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۲) آسان سے مشکل کی طرف چلیں یعنی ہر سبق کی ابتدا آسان سبق سے ہو اور بتدریج مشکلات کی طرف بڑھیں' تدریس کا یہ بہت ہی معقول گر ہے۔ اس طرح بچے غیر محسوس طور پر رفتہ رفتہ مشکلات پر قابو پاتے جاتے ہیں' ان کا دل بڑھتا ہے اور ان کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور وہ مشکلات کو ناقابل عبور نہیں سمجھتے بلکہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر شروع ہی میں انہیں کسی مشکل میں پھنسا دیا جائے تو وہ گھبرا کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور مایوس ہو کر کوشش ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

☆ آسان اور مشکل اضافی الفاظ میں ایک ہی بات کسی کے لئے آسان ہوتی ہے کسی کے لئے مشکل اسی طرح سیکھنے سے پہلے جو بات مشکل نظر آتی ہے سیکھنے کے بعد وہی آسان ہو جاتی ہے اس لئے آسان اور مشکل کا فیصلہ متعلقہ بچوں کے معیار سے کیا جائے نہ کہ اپنے یا کسی اور کے معیار سے۔ اساتذہ سے اس ضمن میں اکثر چوک ہو جاتی ہے' وہ ایک چیز کو آسان سمجھ کر طلبہ پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ چیز بچوں کے لئے بہت مشکل اور ناقابل فہم ہوتی ہے چنانچہ جب بچے سمجھ نہیں پاتے یا کچھ کی سمجھ میں آ جاتا ہے اور کچھ کو دشواری ہوتی ہے تو استاد ان پر بگڑتے اور بسا اوقات سختی پر اتر آتے ہیں حالانکہ بچے بیچارے معذور اور بے قصور ہیں۔

☆ میقات کی ابتدا ہی میں ہر مضمون کے اسباق کو آسان اور مشکل کے لحاظ سے

ترتیب دے لیا جائے اور پڑھاتے وقت اس کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ پہلے آسان اور پھر بتدریج مشکل اسباق آئیں۔

☆ سبق کے بہت مشکل ہونے کی صورت میں جہاں مایوسی اور بددلی پیدا ہوتی ہے وہیں بہت آسان ہونے کی صورت میں اکتاہٹ اور عدمِ توجہی کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس پر وقت صرف کرنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا اس لئے سبق کے شروع میں آسانی کا اہتمام کیا جائے تو آخر تک بتدریج مشکلات کی طرف بڑھیں تاکہ بچوں کو مسائل و مشکلات سے نمٹنے کا سلیقہ آئے۔

③ سادہ سے پیچیدہ کی طرف چلیں یعنی ہر سبق میں سادہ تصورات پہلے لیں پھر بتدریج پیچیدہ باتیں سمجھائیں۔ اسی طرح بچوں کی عمر، ان کی فہم، ان کے تجربات و مشاہدات کو سامنے رکھ کر ہر مضمون ک انصاب اس انداز سے ترتیب دیا جائے تاکہ سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا مواد پہلے ہو اور پھر بتدریج مخلوط اور پیچیدہ مواد لیا جائے مثلاً ریاضی میں ایک قاعدہ سمجھانے کے بعد مشق کے لئے پہلے اس قاعدہ سے با آسانی نکلنے والے چند سادہ سوالات دیئے جائیں پھر بتدریج عبارت میں پیچیدگی لائی جائے اور آخر میں ایسے سوالات دیئے جائیں جن کو حل کرنے میں اس قاعدے کے ساتھ پہلے سے پڑھے ہوئے بعض قاعدوں کو بھی استعمال کرنے کی ضرورت پڑے۔ قاعدے ضابطے سکھاتے وقت بھی اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے یعنی شروع میں سادہ قاعدے بتائے جائیں، رفتہ رفتہ پیچیدہ لیکن سادگی اور پیچیدگی کا فیصلہ ہمیشہ بچوں کے معیار سے ہونا چاہئے کیونکہ ایک چیز بڑوں کو بظاہر بہت ہی سادہ نظر آتی ہے لیکن ایک بچے کے لئے وہ اپنے اندر گوناگوں پیچیدگیاں رکھتی ہے اور بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔

④ ٹھوس سے مجرد کی طرف چلیں یعنی مجرد تصورات قائم کرانے کے لئے ٹھوس

اشیاء کی مدد لی جائے مثلاً بچوں کو گنتی پہاڑے جوڑنا، گھٹانا وغیرہ سکھانے کے لئے انگلیوں بال فریم، گولیوں اور املی کے بیجوں وغیرہ سے مدد لی جائے تو بڑی سہولت ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ بغیر کسی چیز کی مدد کے جوڑنے گھٹانے لگتے ہیں۔ اسی طرح ماڈل، تصاویر، نقشہ جات وغیرہ کی مدد سے مجرد تصورات آسانی سے قائم کرا جاسکتے ہیں۔ بالکل نئی یا نامانوس چیز کا تعارف کرانا ہو تو اس کا ماڈل یا تصویر دکھانے سے تصورات واضح بنتے ہیں۔

اس گر سے فائدہ اٹھانے کے لئے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں:

☆ اسباق کی ابتدا ٹھوس چیزوں اور متعین و مقرون مثالوں سے ہو لیکن اختتام حتی الامکان مجرد تصورات پر ہونا چاہئے۔

☆ ٹھوس اشیاء یا متعین و مقرون مثالوں سے اسی وقت تک امداد لی جائے جب تک ضروری ہو، رفتہ رفتہ مجرد تصورات قائم کرانے کی فکر کی جائے۔

⑤ غیر معین اور غیر واضح تصورات کو معین اور واضح کریں بچوں کے تجربات محدود اور مشاہدات ناقص ہوتے ہیں اس لئے مختلف چیزوں کے بارے میں ان کے تصورات غیر واضح ہوتے ہیں معلم کو چاہئے کہ وہ انہیں رفتہ رفتہ معین اور واضح کرے تاکہ بچوں کا علم پختہ اور قابل اعتماد ہو۔ یہ کام اسی طرح ہوسکتا ہے کہ بچوں کو تجربات و مشاہدات سے کافی مواقع دیئے جائیں اور ان کی قوت مشاہدہ کی بخوبی تربیت ہو تاکہ وہ مشاہدے میں آنے والی چیزوں سے سرسری نہ گزر جایا کریں۔ بچوں کے ناقص اور غلط تصورات کو ٹھیک اور واضح کرنے اس کے لئے تصاویر، نقشہ جات توضیح و تشریح اور مثالوں سے مدد لی جائے ہمارے یہاں عام طور پر بچوں کو اصطلاحی الفاظ کی تعریف اور مشکل الفاظ کے معنی رٹوا دیئے جاتے ہیں اور اسی پر اطمینان کر لیا جاتا ہے حالانکہ اس طرح نہ تو تصورات واضح بنتے اور نہ مفہوم بخوبی سمجھ میں آتا ہے مندرجہ بالا طریقوں سے

اس کا ازالہ ہونا چاہئے۔

⑥ خاص سے عام کی طرف چلیں۔ یعنی خاص خاص واقعات پہلے بتائے جائیں اور عمومی بحثیں بعد میں چھیڑی جائیں کوئی عام اصول اخذ کرنے یا کسی عمومی نتیجے پر پہنچنے کے لئے بچوں کو جانچنے پرکھنے اور تجربہ و مشاہدہ کرنے کے کافی مواقع دیئے جائیں اخلاقی اصول اور ضابطے سمجھانے کے لئے نظری بحثیں کرنے کے بجائے متعین واقعات بتائے جائیں' تاریخی شخصیتوں کے چیدہ واقعات پہلے سنائے جائیں اور باقاعدہ تاریخ اور قوموں کے عروج وزوال کی داستان تسلسل کے ساتھ بعد میں بتائی جائے۔

آسانی کے لئے اساتذہ عموماً پہلے قاعدے ضابطے رٹوا دیتے یا اصول اور کلیے یاد کرا دیتے ہیں اور طلبہ کو خود تجربات کر کے ان نتائج پر پہنچنے کا موقع نہیں دیتے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح ایک بات بچوں کو دوسرے کے اعتماد پر یاد کرنی پڑتی ہے جسے وہ بخوبی سمجھ بھی نہیں پاتے اور جلد ہی بھول جاتے ہیں۔

البتہ تجربات و مشاہدات وغیرہ پر طلبہ کا صرف اتنا ہی وقت خرچ کرایا جائے جتنا ناگزیر ہو جب کوئی عام اصول اخذ ہو جائے تو مزید جانچ پرکھ یا مشاہدات و تجربات اور مثالوں وغیرہ پر وقت صرف نہ کرایا جائے بلکہ اس اصول اور کلیے کو مزید مسائل کے حل کرنے پر استعمال کرایا جائے۔

⑦ مکمل سے اجزاء کی طرف چلیں یعنی پہلے کل پر بحیثیت مجموعی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے پھر ایک ایک جز کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی جائیں۔ اس طرح ابتدا میں ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آ جائے گا اور پورا خاکہ ذہن میں محفوظ رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ ایک ایک جز کی تفصیلات سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

ابتدا میں بچوں کی نظر اجزاء اور ان کی تفصیلات پر نہیں جاتی بلکہ وہ پوری چیز پر

مجموعی نظر ڈالتے اور ہر چیز کا ایک مکمل تصور ذہن میں رکھتے ہیں۔ معلم کو رفتہ رفتہ ایک ایک جز کی وضاحت کر کے پوری چیز کا زیادہ واضح اور متعین تصور قائم کرانا چاہئے۔

اجزا پر بحث کرنے کے بعد کل سے ان کا ربط بھی ملانا چاہئے۔

⑧ فطرت کی پیروی کریں یعنی بچے ذہنی و جسمانی حیثیت سے جس مرحلے سے گزر رہے ہوں اس مرحلے کی خصوصیات پیش نظر رہیں اور ان کی فطرت و طبیعت جن چیزوں کو قبول کر سکتی ہو وہی کچھ پڑھائیں اور سکھائیں۔ فطری تقاضوں اور بنیادی خواہشات اور میلانات و دلچسپیوں کو ملحوظ رکھیں اور جائز حدود میں ان کو پوری رعایت دیں۔ بچوں کی فطرت سے جنگ نہ کریں اور نہ خلاف فطرت ان پر کچھ ٹھونسیں اس سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے محنت تو رائیگاں جاتی ہی ہے اکثر ردعمل بہت شدید ہوتا ہے بعض لوگ بچوں کو قبل از وقت ذہنی طور پر بالغ بنادینے کی بہت کوشش کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے بچے کو بچے کی حیثیت سے پروان چڑھنے دیا جائے اور تدریس میں خود اس کی عمر ذہنی و جسمانی حالت' اس کی فطرت' اس کے میلانات و رجحانات' اس کے جذبات و احساسات وغیرہ کا پورا لحاظ رکھا جائے اسی صورت میں اسباق کامیاب اور مؤثر ہو سکتے ہیں۔

⑨ منطقی کے بجائے نفسیاتی ترتیب سے چلیں یعنی مضامین کے مواد کو بچوں کے سامنے اس ترتیب سے پیش نہ کریں جس ترتیب سے عموماً علمی کتابوں میں پیش کئے جاتے ہیں بلکہ ترتیب وہ ہو جسے بچوں کا ذہن قبول کر سکے۔ مثال کے طور پر پڑھانا سکھانے میں منطقی ترتیب تو یہ ہے کہ پہلے حروف تہجی پر عبور کرایا جائے پھر اعراب بتائے جائیں پھر دو حرفی سہ حرفی چہار حرفی۔ ایسے الفاظ پڑھائے جائیں جن میں حروف الگ الگ ہوں پھر حروف کے جوڑ پیوند اور

مخلوط الفاظ پھر جملے اور آخر میں عبارتیں پڑھائی جائیں ظاہر ہے یہ ترتیب منطقی اعتبار سے تو درست ہے مگر تجربہ شاہد ہے کہ بچوں کے لئے یہ ترتیب اتنی خشک اور بے معنی ثابت ہوتی ہے کہ وہ قطعاً دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کے برعکس اگر بچوں کو پہلے خوش رنگ' مانوس اور بڑی تصاویر یا اصل اشیاء کی مدد سے چند مختصر جملے جن میں الفاظ کی زیادہ سے زیادہ تکرار ہو سالم پڑھادیں پھر ان کا تجزیہ کر کے الفاظ اور الفاظ کا تجزیہ کر کے حروف اور ان کی آوازوں کی پہچان کروادیں تو بچوں کے لئے ان میں معنویت بھی ہوتی ہے اور دلچسپی بھی اسی طرح ریاضی میں منطقی ترتیب تو یہ ہے کہ پہلے نقطہ' پھر خطوط اس کے بعد زاویوں پھر مسطح شکلوں اور آخر میں ٹھوس اشیاء کی بحث آئے لیکن بچوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے ٹھوس اور مسطح شکلیں بتائی جائیں اور خطوط' زوایا اور نقطے کی بحث بعد میں آئے۔

لیکن واضح رہے کہ مضامین کی منطقی ترتیب بھی بڑی اہمیت وافادیت کی حامل ہے۔ منظم اور مربوط علم اور علوم وفنون پر عبور اسی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر حاصل ہوسکتا ہے اور بالآخر بچوں کو رفتہ رفتہ اس طرف لانا اسی پر ہے اس لئے تدریس کو مؤثر بنانے کے لئے ابتدائی درجات میں ترتیب الٹ دی جائے وہ بھی ناگزیر حد تک' صرف سبق کو دلچسپ اور مؤثر بنانے کے لئے جوں ہی منطقی ترتیب سے مواد پیش کرنے کی گنجائش نظر آئے اسی ترتیب کو ملحوظ رکھیں۔

(۱۰) مستثنیات سے پہلے عام قاعدے سکھائے جائیں: یعنی پہلے عام قاعدے و ضابطے متعدد مشقوں کے ذریعے بخوبی ذہن نشین کرادیئے جائیں پھر استثنائی صورتیں بتائی جائیں ورنہ ذہن انتشار و پراگندگی کا شکار ہو جائے گا اور جو قاعدہ بتایا جائے گا اس میں بھی شک وتذبذب کی کیفیت پیدا ہوگی جس سے ذہن میں محفوظ رکھنے اور بروقت یاد آنے میں دشواری ہوگی مثلاً بیٹی' لڑکی' کاپی'

کرسی، بکری، مرغی وغیرہ مثالوں سے یہ قاعدہ اخذ کراتے ہیں کہ جن الفاظ کے آخر میں ی ہو وہ مونث ہی ہوتے ہیں اسی سانس میں یہ بھی نہ بتا دیا جائے کہ ہاتھی پانی، گھی، دہی وغیرہ اس قاعدے سے مستثنا ہیں بلکہ انہیں بعد کے لئے موخر کر دیا جائے۔

⑪ تدریس کے معاون

سامان اور تدابیر۔ تدریس کے جہاں چند بنیادی اصول اور ضابطے ہیں جن کا لحاظ کامیاب تدریس کے لئے ضروری ہے وہیں کچھ تدابیر اور امدادی سامان ہیں جن کو حسب ضرورت استعمال کرنا چاہیے۔

مثلاً:

① سوال و جواب۔
② بیان
③ تختہ سیاہ
④ توضیح وتشریح
⑤ نقشے، ماڈل، چارٹ، تصاویر (جاندار کی نہ ہونی چاہئے) وغیرہ
⑥ ہوم ورک (گھر پر کرنے کے لئے کام)۔
⑦ درسی کتب
⑧ امدادی سامان
⑨ دارالمطالعہ اور لائبریری
⑩ امتحانات جانچ اور جائزے

سوال و جواب: تدریس میں سوالات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جو اساتذہ مسلسل بولے جاتے ہیں نہ خود سوال کرتے اور نہ طلبہ کو سوال کرنے کا موقع دیتے ہیں ان کی تدریس سے طلبہ کو بہت کم فائدہ پہنچتا ہے ایسے اسباق میں بچے بہت کم عملی

دلچسپی لیتے ہیں۔

**سوالات کی اہمیت وافادیت:** موزوں سوالات کی بڑی اہمیت وافادیت ہے ان کے ذریعے

☆ تجسس کو بیدار کر کے بچوں کو سبق پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ سبق میں ان کی توجہ ودلچسپی برقرار رکھی جاسکتی ہے۔

☆ غیر متوجہ طلبہ کو متوجہ کرنے اور سست رفتار طلبہ کو ہٹکارنے اور ہمت بندھانے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

☆ طلبہ کو غور وفکر اور مشاہدہ ومطالعہ پر اکسایا جاسکتا ہے۔

☆ ان کی صلاحیت کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

☆ طلبہ کو ان کی غلطیاں محسوس کرائی جاسکتی ہیں۔

☆ اسباق کو آگے بڑھانے میں مدد لی جاسکتی ہے۔

☆ اسباق کا اعادہ کرایا جاسکتا ہے۔

**اغراض:** پڑھاتے وقت معلم کو طرح طرح کے سوالات کرنے پڑتے ہیں کچھ سبق کی ابتدا میں کچھ درمیان میں اور کچھ اختتام پر۔

**۱) تمہیدی سوالات:**

یہ سبق کے شروع میں کئے جاتے ہیں تعداد میں تھوڑے اور بہت ہی آسان ہوتے ہیں نیز موضوع سے ان کا قریبی تعلق ہوتا ہے ان کی غرض یہ ہوتی ہے۔

☆ بچوں کی سابقہ لیاقت کا پتہ چل جائے تاکہ اسی بنیاد پر نئی معلومات فراہم کی جائیں۔

☆ بچوں کے ذہن کو سبق کے لئے تیار اور یکسو کیا جاے۔

☆ سبق کی غرض وغایت اور ضرورت وافادیت ان پر بخوبی واضح ہو جائے۔

ب) درمیانی سوالات:

سبق کے بیچ میں متعدد سوالات کئے جاتے ہیں جن کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ:

☆ معلم اندازہ کر سکے کہ بچے سبق کو بخوبی سمجھ رہے ہیں۔
☆ سبق میں بچوں کی دلچسپی اور توجہ برقرار رہے۔
☆ سبق کو آگے بڑھانے میں طلبہ عملی حصہ لیں۔
☆ سبق کے مشکل حصے واضح اور ذہن نشین ہوتے ہیں۔
☆ غور وفکر کا موقع ملے اور معلومات میں تسلسل رہے۔
☆ نئی معلومات کا سابقہ معلومات سے ربط قائم ہو۔
☆ بچوں کے روزمرہ کے واقعات' تجربات ومشاہدات وغیرہ سے جدید معلومات کا مقابلہ وموازنہ ہو سکے۔
☆ کچھ مشاہدہ کرانے یا کسی چیز پر توجہ مرکوز کرانے میں مدد ملے۔
☆ غیر متوجہ طلبہ کو متوجہ کیا جا سکے اور سست رفتار طلبہ کو ساتھ لیا جا سکے۔

ج) اختتامی سوالات:

سبق کے آخر میں کچھ سوالات اس غرض سے کئے جاتے ہیں کہ:

☆ پورے سبق کا اعادہ ہو جائے۔
☆ سبق کے ذریعے جو کچھ بتایا اور سکھایا گیا ہے بچوں کو اسے استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔
☆ بچوں کو کسی ہوم ورک یا عملی کام پر آمادہ کیا جا سکے یا حل طلب مسئلہ کی شکل میں انہیں کوئی کام دیا جا سکے۔

## سوالات کیسے ہوں؟

سوالات سے مذکورہ بالا اغراض و مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ان میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جائیں:

☆ سوالات کی زبان صاف شگفتہ عام فہم اور زوائد سے پاک ہو تا کہ بچوں کی سمجھ میں بخوبی آ سکے کہ آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں زبان کی شگفتگی ان کی توجہ کھینچے اور جواب سوچنے پر آمادہ کرے۔ بعض لوگ سوالات میں بلاوجہ غیر ضروری الفاظ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً پوچھتا ہے "آنحضرت ﷺ کس سن میں پیدا ہوئے" اس طرح کے زوائد سے سوالات کی زبان پاک ہونی چاہئے۔

☆ زبانی سوالات چھوٹے اور ان کی عبارت بہت مختصر ہو تا کہ پورا سوال بآسانی بچوں کے ذہن میں محفوظ رہ سکے مثلاً حضور ﷺ نے ہجرت کیوں فرمائی؟ ایک موزوں زبانی سوال ہے اسی کو اگر ان الفاظ میں پوچھا جائے۔ "حضور ﷺ نے مکہ چھوڑ کر جو آپ کا وطن بھی تھا اور عرب کا مرکزی شہر بھی مدینہ کیوں ہجرت فرمائی جب کہ وہ شہر آپ کے لئے اجنبی بھی تھا اور مکہ سے کافی بھی؟" تو یہ سوال ناقص ہوگا۔

☆ طلبہ کی صلاحیت کا لحاظ رکھ کر بنائے گئے ہوں نہ اتنے آسان ہوں کہ طلبہ ان پر توجہ دینے یا غور کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھیں اور نہ اتنے مشکل ہوں کہ بچے جواب دینے کی ہمت ہی نہ کر سکیں۔

☆ سبق کے دوران جتنے سوالات کیے جائیں وہ آپس میں اتنے مربوط ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے لازمی جز معلوم ہوں اور سب کا بحیثیت مجموعی اصل سبق سے قریبی تعلق ہو۔ اس طرح خیالات میں بھی تسلسل رہتا ہے اور غیر متعلق باتوں پر وقت ضائع نہیں ہوتا۔

☆ دو یا زائد سوالات ملا کر نہ پوچھے جائیں مثلاً نماز کے اوقات، رکعتیں اور فائدے بتاؤ؟ محمود غزنوی نے کہاں کہاں اور کیوں حملہ کیا؟

☆ سوالات واضح معین اور غیر مبہم ہوں تا کہ بچوں کا ذہن اصل جواب کی طرف منتقل ہو ایسے سوالات ہرگز نہ کئے جائیں جن کے ایک سے زیادہ جواب ہو سکتے ہوں مثلاً:

☆ سامنے کیا نظر آ رہا ہے؟ یا نقشے میں کیا دکھائی دے رہا ہے؟ دونوں صورتوں میں متعدد جوابات ممکن ہیں۔

☆ سوالات صرف یادداشت یا حافظہ سے متعلق نہ ہوں بلکہ فکر انگیز بھی ہوں تا کہ بچوں کو سوچنے اور غور وفکر کرنے پر آمادہ کر سکیں۔

☆ ابتدائی درجات میں سوالات عموماً سیدھے سادے اور ایسے ہوں جن میں بچوں کو خوب بولنا پڑے البتہ اونچی جماعتوں میں قدرے پیچیدہ ہوں تا کہ بچوں کو غور وفکر اور استدلال سے کام لینا پڑے۔

☆ خبردار کئے بغیر دھوکے اور مغالطے میں ڈالنے والے سوالات نہ کئے جائیں مثلاً ایک لڑکا ایک گھنٹے میں تین میل جاتا ہے تو پانچ لڑکے ایک گھنٹے میں کتنے میل جائیں گے؟

☆ سوالات ایسے نہ ہوں جن کے جوابات صرف ''ہاں'' ''نہیں'' یا ایک ہی لفظ میں پورے ہو جائیں اگر اس طرح کے سوالات پوچھنے ہی پڑیں تو ساتھ ہی کیوں یا کیسے وغیرہ بھی ہونا چاہئے تا کہ جواب دینے میں کچھ جدوجہد کرنی پڑے اور معلم کو اطمینان ہو سکے کہ بچے نے سوچ سمجھ کر ''ہاں یا نہیں'' کہا ہے۔

سوالات ایسے بھی نہ ہوں جن کے اندر ہی جواب موجود ہو یا جو اپنے اندر جواب کی طرف خود اشارہ کر رہے ہوں۔

مثلاً کیا حضرت عیسیٰ نبی نہیں تھے؟ گینڈا گھاس چرنے والا جانور ہے یا پھاڑ

کھانے والا؟ وغیرہ۔

☆ کچھ بتاتے ہی الٹ کر سوال نہ کر لیا گیا ہو مثلاً آنحضرت ﷺ ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے، حضور ﷺ کس سنہ میں پیدا ہوئے؟ البتہ اگر کوئی بچہ غیر متوجہ ہو یا کھویا کھویا سا نظر آئے تو اس سے اچانک اس طرح کا سوال کیا جا سکتا ہے یا اس طرح کا سوال کہ فلاں بچے نے کیا جواب دیا؟ وغیرہ

سوالات کرنے کا طریقہ:

جس طرح موزوں سوالات بنانا ایک فن ہے جس میں کافی احتیاط، سوجھ بوجھ اور مشق و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح سوالات کرنا بھی فنی مہارت چاہتا ہے سوالات پوچھتے وقت مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہنے چاہئیں۔

☆ پورے درجے کو مخاطب کر کے سوال کیا جائے، البتہ جواب کسی ایک ہی بچے سے مانگا جائے۔

صرف لائق بچوں ہی کو مرکز نگاہ نہ بنائے رکھیے ☆

☆ چند مخصوص بچوں ہی سے سوالات نہ کئے جائیں بلکہ باری باری سب سے پوچھا جائے البتہ اس باری میں کوئی خاص ترتیب نہ ہو ورنہ جن سے پوچھا جا چکا ہو گا یا جن کی باری نہ ہو گی وہ توجہ نہیں دیں گے۔

☆ سوال کرتے وقت صاف بولا جائے تاکہ پورا درجہ بخوبی سن سکے اور سوال کا اصل مدعا ظاہر کرنے والے لفظ پر خاص طور سے زور دیا جائے۔

☆ سوالات ہرگز نہ دہرائیں الا یہ کہ کسی وجہ سے طلبہ سن یا سمجھ ہی نہ سکے ہوں ایسی صورت میں پھر سے سوال کیا جائے یا کوئی آسان سوال کر کے اصل سوال کی طرف رہنمائی کر دی جائے۔

موقع ہو اور ضرورت سمجھیں تو تختہ سیاہ پر سوال لکھ دیا کریں خصوصاً جانچ یا ہوم ورک کے لئے سوالات تختہ سیاہ پر لکھ دینا بہتر ہے۔

☆ غیر متوجہ طلبہ سے اچانک سوال کیا جائے۔

☆ سوالات کرنے کا لہجہ خوش گوار اور ہمدردانہ ہو تا کہ بچے خود اعتمادی کے ساتھ جواب دینے پر آمادہ ہو جائیں' خوف و ہراس یا جھجک محسوس نہ کریں۔

☆ جواب حاصل کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔

کبھی کبھی تکرار از حد سود مند ثابت ہوتی ہے:

☆ اگر ایک بچہ ٹھیک جواب دے دے تو بھی بعض اور بچوں سے جواب مانگے جائیں۔

☆ کبھی کبھی بچوں کو بھی سوال کرنے کا موقع دیا جائے اور سوال کرنے پر انہیں اُکسایا جائے ساتھ ہی درجے کی فضا ایسی بنائی جائے کہ دوران تدریس جو بات سمجھ میں نہ آئے طلبہ بے جھجک پوچھ سکیں' اس سے بچوں کے سمجھنے بوجھنے غور وفکر کرنے' سبق میں پوری دلچسپی لینے میں مدد ملتی ہے البتہ غیر متعلق سوالات کو نظر انداز کر دیا جائے' سوال اگر ضروری اور مفید ہو تو بعد میں علیحدہ سے اس کا جواب دے دیا جائے۔

☆ سوالات اطمینان سے کیے جائیں۔ جلد بازی کرنا یا سوالات کی بوچھاڑ کر دینا ٹھیک نہیں۔ اس سے بچے گھبرا اور بوکھلا جاتے ہیں۔

طلبہ کے جوابات:

سوالات سے پورا پورا فائدہ اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب طلبہ کے جوابات کے سلسلے میں مناسب طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ بچوں کے جوابات خندہ پیشانی سے سنے جائیں انہیں جواب دینے پر اکسایا جائے صحیح جوابات پر شاباش دی جائے غلط یا احمقانہ جوابات پر طنز و تعریض سے گریز کیا جائے لایعنی اور غیر متعلق جوابات نظر انداز کر دیے جائیں۔

☆ طلبہ کے بعض غلط لیکن ''دلچسپ'' جوابات سے درجے میں شگفتگی اور مسرت کی لہر دوڑانے کا کام لیا جا سکتا ہے البتہ ایسا کرتے وقت جواب دینے والے بچے کے جذبات کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے۔

☆ صرف ان جوابات کو بالکل ٹھیک شمار کیا جائے جو زبان سے قواعد کی رو سے بالکل ٹھیک ہوں۔

سوال سے متعلق ہوں۔

جتنی بات پوچھی گئی ہے اس سے کم ہوں نہ زیادہ۔

پورے جملے میں دیئے گئے ہوں لیکن اس پر ہمیشہ اصرار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ کبھی کبھی فطری جواب ادھورے جملوں ہی میں ہو جاتا ہے۔

پوری آواز سے دیا گیا ہوتا کہ پورا درجہ بآسانی سن سکے۔

اگر ان پہلوؤں سے نقص ہو تو قبول کرنے سے پہلے اس کی اصلاح کرا دی جائے۔

☆ حتی الامکان بچوں ہی کے جوابات جزوی ردوبدل کے بعد قبول کر لئے جائیں اگر پورا جواب صحیح نہ ہو تو جتنا جز ٹھیک ہو اتنا ہی قبول کر لیا جائے' باقی حصہ مزید سوالات کر کے یا وقت کم ہو تو خود بتا کر مکمل کرا لیا جائے اس سے بچوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

☆ ٹھیک جوابات کو دوسرے طلبہ سے دہروا دیا جائے کبھی کبھی طلبہ کے اچھے جوابات کو درجے کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جائے۔

☆ ٹھیک جواب فوراً قبول کر لینے کے بجائے بعض اور طلبہ سے پوچھ لینے کے بعد قبول کیا جائے تاکہ دوسرے بچوں کی معلومات کے بارے میں بھی اندازہ ہو سکے۔

☆ جواب سوچتے وقت بولا نہ جائے اور نہ جواب کے درمیان مداخلت کی جائے

اگر مدد کی ضرورت ہو تو کسی دوسرے بچے سے دلوادی جائے۔

☆ بچہ اگر غلط جواب دے یا جواب ہی نہ دے سکے تو فوراً بتا نہ دیا جائے بلکہ یا تو مزید سوالات کر کے جواب کی طرف رہنمائی کی جائے یا دوسرے بچوں سے صحیح جواب حاصل ہونے کے بعد اس سے دہروادیا جائے۔

☆ طلبہ کے سارے غلط جوابات قابل اعتنا نہیں ہوتے لیکن وہ جوابات جن سے اندازہ ہو کہ بچہ بات سمجھ ہی نہیں سکا ہے اس کی ضرور اصلاح کی جائے ساتھ ہی بھی واضح کیا جائے کہ اس کا جواب کیوں غلط ہے۔

☆ لاپروائی یا گستاخی سے دیئے گئے جوابات پر کبھی کبھی ہمدردی و دلسوزی سے سرزنش مفید ہوتی ہے۔

☆ اجتماعی جوابات عام طور پر نہ مانگے جائیں اور نہ قبول کئے جائیں البتہ اعادہ یا مشق کی صورت میں وقت بچانے کے لئے کبھی کبھی ایسا کیا جاسکتا ہے۔

☆ بچوں کو اس کا عادی بنایا جائے کہ جس سے سوال کیا جائے وہی جواب دے دوسرے نہ بول پڑیں کیونکہ اکثر ذہین بچوں کے بول پڑنے کی وجہ سے دھوکا ہو جاتا ہے کہ سب کو آتا ہے اور بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اکثریت سمجھی ہی نہیں۔

☆ اگر پورا درجہ یا زیادہ طلبہ بار بار غلط جواب دیں تو سب کا پتہ لگا کر ازالہ کیا جائے اسباب عموماً یہ ہوسکتے ہیں۔

① سوالات طلبہ کی لیاقت سے اونچے ہوں۔

② تدریس کے طریقے میں خامی ہو اور سبق سمجھ میں نہ آرہا ہو۔

③ درجے کا نظم وضبط ٹھیک نہ ہو۔

④ بچے تھک گئے ہوں۔

⑤ سبق خشک' بے جان اور غیر دلچسپ ہو۔

۱) کسی شخص جگہ یا چیز کے بارے میں بیان:

کسی شخص جگہ' جانور چیز یا واقعہ کے متعلق کچھ بیان کرنا ہو تو مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہنے چاہئیں۔

☆ معلم کے ذہن میں اس کا اتنا واضح تصور ہو گویا اس نے خود غور سے دیکھا ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس نے اس کا گہرا مطالعہ یا مشاہدہ کیا ہو۔

☆ آسان الفاظ اور موزوں زبان میں واضح نقشہ کھینچا جائے تا کہ بچوں کے ذہن میں صحیح تصورات قائم ہوں۔

☆ حتی الامکان اختصار سے کام لیا جائے۔ بہت زیادہ تفصیلات سے بچوں کا ذہن الجھ جاتا ہے' البتہ جتنا کچھ بتایا جائے اس کی اتنی واضح منظر کشی کی جائے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

☆ پہلے کل کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جائے پھر ایک خاص ترتیب سے تفصیلات بتائی جائیں۔

☆ زبانی بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ حسب موقع ماڈل' تصویر' چارٹ اور نقشے وغیرہ سے مدد لی جائے۔

☆ ان دیکھی اور نا معلوم چیزوں کے متعلق بتاتے وقت دیکھی ہوئی یا معلوم چیزوں سے مقابلہ و موازنہ کیا جائے تا کہ فرق و مماثلت بخوبی سمجھ میں آ جائے۔

☆ جو کچھ بیان کرنا ہو اس کا مختصر خاکہ پہلے سے مرتب کر لیا جائے اور بیان میں اس ترتیب کا لحاظ رکھا جائے تا کہ کڑی سے کڑی ملتی جائے۔

☆ جو کچھ بیان کرنا ہو اسے مسلسل اور ایک ہی سر میں نہ بیان کیا جائے بلکہ دو یا تین مناسب اجزا میں تقسیم کر کے باری باری ایک جز پیش کیا جائے ہر جز کے اختتام پر سوالات کر کے اعادہ کرا دیا جائے اور پھر خلاصہ نوٹ کرا دیا جائے۔

ب) کہانیاں کہنا:

کہانیاں شروع سے تعلیم وتربیت کا نہایت دلچسپ اور مؤثر ذریعہ رہی ہیں کون ہے جسے کہانیوں میں لطف نہیں آتا لیکن بچے تو ان کے بہت ہی دلدادہ ہوتے ہیں' دادی اماں کے جہاں اور بہت سے احسانات ہوتے ہیں جن سے بچے ان کی طرف کھنچتے ہیں وہاں سب سے زیادہ کشش ان کی کہانیوں کی وجہ سے ہوتی ہے کہانیوں سے ان کے فطری ذوق کا اندازہ اس اصرار سے ہوسکتا ہے جو کہانیاں سننے کے لئے وہ کرتے رہتے ہیں وہ ہمہ تن متوجہ ہوکر سنتے ہیں یہاں تک کہ ان کی نیند اڑ جاتی ہے اور دادی اماں کی جان اس وقت چھوٹتی ہے جب سنتے سنتے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

اہمیت وافادیت:

کہانیوں سے بچوں کی ذہنی' اخلاقی اور معاشرتی تربیت میں بڑی مدد ملتی ہے وہ اپنے کو ہیرو کا قائم مقام بنا کر اپنے اوپر اس جیسی تمام کیفیات طاری کر لیتے ہیں سنتے سنتے اچھل پڑتے ہیں اور چہرے بشرے نیز جسم کی حرکات وسکنات سے صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے دل ودماغ پر بھی وہی کچھ گزر رہی ہے جو کہانی میں ہیرو پر گزرتی ہے۔

② قوت متخیلہ کی نشوونما' نصب العین اور آورش کی تشکیل' سیرت سازی اور اعلیٰ تخیلات کو پروان چڑھانے میں کہانیاں بہت زیادہ معاون ثابت ہوتی ہیں۔

③ مشکل اور خشک مضامین کہانیوں کے سہارے آسان دلچسپ اور قابل قبول بن جاتے ہیں۔

④ مجرد تصورات اور اصولی باتیں کہانیوں کے ذریعے باآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

کوشش کیجئے کہ بچوں کو تخلیقی کاموں پر ابھاریئے:

۵ زبان سکھانے' الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کرنے' خیالات و جذبات کے اظہار پر قدرت حاصل کرنے میں بھی کہانیاں بڑی معاون ہوتی ہیں۔

۶ اسلامیات' تاریخ' جغرافیہ' سیرت وغیرہ سے متعلق معلومات ان کے ذریعے با آسانی فراہم کی جاسکتی ہیں جو انہیں کے سہارے اچھی طرح یاد بھی ہو جاتی ہیں۔

☆ قابل لحاظ امور:

ابتدا میں کہانیاں سادہ اور مختصر ہونی چاہئیں رفتہ رفتہ طویل اور پیچیدہ۔

☆ الفاظ آسان' جملے اور زبان شگفتہ ہونی چاہئے۔

☆ واقعات باہم مربوط اور بچوں ہی کی زندگی سے متعلق نیز ان کے ذوق' فہم' مشاہدے اور تجربے سے قریب ہونے چاہئیں۔

☆ قصے کا ہیرو حتی الامکان بچہ ہو اور اس کی حرکات و سکنات یا کارنامے واضح پس منظر میں بیان کئے جائیں۔

☆ قصے کا مواد بچوں کی لیاقت نفسی خصوصیات اور دلچسپی کو پیش نظر رکھ کر منتخب کرنا چاہئے۔

☆ کہانیوں کے افراد' مقامات اور اشیاء کو تعین کے ساتھ بتانا چاہئے۔

☆ کہانیاں حرکت اور جوش سے بھرپور ہونا چاہئیں ان میں دوڑ بھاگ' اچھل کود مقابلہ و مسابقت' ہمت و شجاعت اور سیر و سیاحت اور مہمات و اکتشافات وغیرہ کے واقعات ہونے چاہئیں۔

☆ مکالمات کی فراوانی ہونی چاہئے۔

☆ کہانی مسلسل پھیلتی جائے تاکہ توجہ مرکوز اور دلچسپی برقرار رہے۔

☆ اگر ایک شگفتہ جملہ یا فقرہ تھوڑے وقفہ پر دہرایا جاسکے تو چھوٹے بچوں

کو بہت لطف آتا ہے۔

☆ کہانی خواہ کسی مضمون سے متعلق ہو اس میں قصہ پن غالب ہونا چاہئے البتہ وہ مقصد ہمہ وقت پیش نظر رہنا چاہئے جس کے لئے وہ کہانی سنائی جارہی ہے۔

☆ مشہور و معروف کہانیوں کو من وعن پیش کرنے کے بجائے حسب ضرورت بچوں کی لیاقت و صلاحیت کے مطابق ڈھال کر پیش کرنا چاہئے لیکن تاریخی کہانیوں میں اس کا لحاظ رہے کہ تاریخی حقائق یا واقعات مجروح نہ ہونے پائیں۔

☆ بعض کہانیاں جگ بیتی کے بجائے آپ بیتی کے طور پر پیش کی جائیں تو زیادہ لطف دیتی ہیں۔ ایسی کہانیاں بچوں کو یاد ہو جاتی ہیں اور وہ انہیں بآسانی بیان کر سکتے ہیں اس لئے کبھی کبھی ہیرو ہی کی زبان سے کہانی کہلوانی چاہئے۔

☆ بچپن میں بھوت پریت اور جن و پری کے قصوں سے توہم پرستی پیدا ہوتی ہے اور عنفوان شباب میں جاسوسی یا عشقیہ کہانیوں سے بے حیائی اور جرائم پیشگی اس لئے اس طرح کی کہانیوں سے محفوظ رہنا چاہئے۔

☆ کہانی معلم کو خوب یاد ہونی چاہئے تا کہ سناتے وقت روانی رہے بیچ بیچ میں رکنا یا کتاب کھول کر دیکھنا نہ پڑے ورنہ سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

☆ کہانیوں کے جو حصے مکالمے کی شکل میں پیش کئے جاسکتے ہوں انہیں کبھی درجے یا مجمع کے سامنے بطور مکالمہ پیش کرنے کا موقع دینا چاہئے البتہ ایسی کہانیاں مکالمے کے لئے منتخب نہ کرنی چاہئیں جن سے کسی بچے کو گھناؤنا پارٹ ادا کرنا پڑے ورنہ اس بچے پر وہی کیفیات طاری ہوں گی اور اس کا اندیشہ رہے گا کہ وہی کہیں جڑ نہ پکڑ جائیں۔

☆ کہانیاں سنانے کا طریقہ: کہانیاں ہمیشہ زبانی سنانی چاہئیں پڑھ کر سنانے میں نہ تو لطف ہی آتا ہے اور نہ وہ کیفیت ہی طاری ہوتی ہے جس کے لئے کہانی سنائی جاتی ہے اگر کبھی پڑھ کر سنانا ہی پڑے تو اندازِ بیان زبانی سنانے کا سا ہونا

چاہیے۔

☆ انداز خوشگوار ولب ولہجہ فطری ہونا چاہیے حسب ضرورت آواز میں اتار چڑھاؤ اور حرکات وسکنات سے جوش وجذبے کا اظہار بھی ضروری ہے۔

☆ معلم جب خود مزے لے کر کہانی سناتے اور واقعات سے تاثر کا اظہار کرتے ہیں تو بچے بھی لطف لیتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں' اس لئے زبان' بیان' انداز ہر چیز سے مطلوبہ کیفیت اور فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆ کہانی مسلسل سنانے کی بجائے دو تین موزوں اجزاء میں تقسیم کر کے سنانا چاہیے ایک جز سنانے کے بعد موزوں سوالات کے ذریعے اہم واقعات کا اعادہ کرا کے اگلا جز پیش کرنا چاہیے آخر میں سوالات کر کے پوری کہانی کا خلاصہ سن لینا چاہیے۔

☆ الفاظ میں واضح نقشہ کھینچے اور ہر واقعہ کا پس منظر بیان کرنے کے بعد بھی حتی الامکان توضیحی تصاویر دکھانی چاہئیں اور تختہ سیاہ کی مدد سے مزید وضاحت کرنی چاہیے۔

☆ معلوماتی کہانیوں میں سے مناسب سوالات کے ذریعے وہ باتیں اخذ کرا لینی چاہئیں جن کے لئے کہانی کی مدد لی گئی تھی۔

☆ کہانی سنانے کے دوران میں وہ مقصد ہمہ وقت ذہن میں رہنا چاہیے جس کے لئے وہ کہانی سنائی جارہی ہے۔

☆ کہانی کے وہ حصے جنہیں بچوں سے مکالمے کے طور پر بعد میں پیش کرانا ہو' سناتے وقت معلم انہیں مکالمے ہی کی شکل میں پیش کرے۔

☆ کبھی کبھی بچوں کو بھی کہانیاں سنانے کا موقع دینا چاہیے اور اس ضمن میں انتخاب' پیش کش وغیرہ کے سلسلے میں مناسب رہنمائی ہونی چاہیے۔

④ تختہ سیاہ (بلیک بورڈ):

تدریس کو آسان، مؤثر اور دلچسپ بنانے میں تختہ سیاہ کو بھی بہت زیادہ دخل ہے، سبق کو واضح کرنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سے بہت کم اساتذہ کماحقہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اہمیت وافادیت:

سبق کے مشکل حصوں کی توضیح وتشریح کے لئے تختہ سیاہ بہت ہی سستی اور موزوں سطح ہے حسب ضرورت اسی پر نہایت واضح اور خوش رنگ تصاویر چارٹس اور نقشے وغیرہ بنائے جا سکتے ہیں جن میں وقت اور پیسے کی بھی بچت ہوتی ہے اور بنانے کا سلیقہ ہو تو پہلے سے بنی یا چھپی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں یہ زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔

☆ بچوں کے سامنے اس پر جو لکھا اور بنایا جاتا ہے اسے بچے زیادہ غور اور توجہ سے دیکھتے ہیں، ان کی سمجھ میں بخوبی آتا ہے اور ضرورت ہو تو وہ بآسانی اس کی نقل بھی اتار سکتے ہیں۔

☆ زبانی پڑھاتے رہیں تو بچوں کو صرف کانوں سے کام لینے کا موقع ملتا ہے اور مسلسل سنتے رہنے سے وہ اکتا بھی جاتے ہیں تختہ سیاہ کی وجہ سے انہیں آنکھوں سے بھی کام لینے کا موقع ملتا ہے اور بولنا بند کر کے جب معلم تختہ سیاہ استعمال کرنے لگتا ہے تو کام کی نوعیت میں تبدیلی واقع ہو جانے کی وجہ سے اکتاہٹ بھی دور ہو جاتی ہے اور توجہ و دلچسپی پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے نیز ایک سے زائد حواس سے کام لینے کی وجہ سے سمجھنے اور یاد رکھنے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔

☆ طلبہ کو زبانی کوئی ہدایت دی جائے یا حل کرنے کے لئے کوئی مسئلہ یا ہوم ورک تو کبھی کبھی وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہا کچھ جاتا ہے اور بچے کرتے کچھ اور ہیں تختہ سیاہ پر نوٹ کر دینے سے کام متعین ہو جاتا ہے اور طلبہ بھٹکنے یا شبہ میں

پڑنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

☆ تختہ سیاہ کی بدولت سبق کا خلاصہ اور مختصر نوٹ مربوط و مرتب شکل میں طلبہ کو مل جاتے ہیں جسے وہ بآسانی یاد بھی کر سکتے ہیں اور اپنی کاپیوں پر صحت کے ساتھ نوٹ بھی کر سکتے ہیں سبق کے خاص خاص پوائنٹ پر توجہ مرکوز کرانے میں بھی تختہ سیاہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔

استعمال:

تختہ سیاہ معلم کی بائیں جانب اس انداز سے لگایا جائے کہ سطح چمکے نہیں اور پورا درجہ باآسانی دیکھ سکے نیز معلم کو وہاں تک پہنچنے اور لکھنے میں آسانی ہو۔

☆ استعمال سے پہلے تختہ سیاہ خوب صاف کر لیا جائے جھاڑن اگر قدرے کم استعمال کیا جائے تو بہتر ہے مگر بہت گیلا نہ ہو۔ کام ختم ہونے کے بعد جلد از جلد صاف کر دیا جائے۔

☆ تختہ سیاہ پر جو کچھ لکھا یا بنایا جائے وہ نہایت صاف واضح، صحیح سیدھی سطح نیز موٹے اور یکساں خط میں ہو۔

☆ ۳ کھریا سرے کے قریب پکڑی جائے' ۴۵ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے تختہ سیاہ پر لکھا جائے' موٹا لکھنا ہو تو چاک کا سرا گھس لیا جائے' لمبی لکیر کھینچنی ہو تو دونوں سروں کے نقطے متعین کر کے ملا دیئے جائیں اور رنگ بھرنا ہو تو تختہ سیاہ کو پٹ کر دیا جائے۔

☆ لکھتے وقت چاک سے کھر کھراہٹ کی آواز نہ نکلے ورنہ توجہ بھٹکے گی بسا اوقات سرے پر کنکری آجانے سے آواز نکلتی ہے' ایسی صورت میں سر توڑ کر کنکری نکال دی جائے۔

☆ پورے درجے کا خیال رکھ کر لکھا جائے اور کبھی کبھی پیچھے جا کر اطمینان کر لیا جائے کہ سب کو بخوبی دکھائی دے رہا ہے۔

☆ درجے کی طرف پیٹھ کر کے نہیں بلکہ ایک پہلو یا جانب سے لکھا جائے لکھتے وقت درجے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے یا کچھ بولتے یا پوچھتے جانا چاہئے تاکہ درجے کا نظم وضبط برقرار رہے۔

④ توضیحات وتشریحات پڑھاتے وقت متعدد ایسے مواقع آتے ہیں جب معلوم کو کسی مشکل نامانوس، غیر واضح یا مبہم بات کی توضیح وتشریح کرنی پڑتی ہے تاکہ

☆ اشکال دور ہو جائے۔

☆ تصورات واضح بنیں۔

☆ بات بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔

یہ توضیحات وتشریح دو طرح کی ہوتی ہیں۔

① زبانی۔

② مرئی یعنی نظر آنے والی مثلاً تصاویر، نقشہ جات، گلوب، چارٹ وغیرہ۔

زبانی توضیحات زبانی تشریح کرتے وقت حسب ضرورت وموقع مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں مثلاً

☆ مشکل الفاظ کا مفہوم سمجھانے کے لئے یا تو آسان مترادفات دے دیئے جاتے ہیں یا ان کی ضد بتادی جاتی ہے یا انہیں جملوں میں استعمال کر کے مفہوم واضح کر دیا جاتا اور محل استعمال بتادیا جاتا ہے توضیح طلب الفاظ ہوں تو اختصار سے واقعہ سنا دیا جاتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ ہوں تو ان کی تعریف بیان کر کے مثالوں سے وضاحت کر دی جاتی ہے۔

☆ نامانوس چیز کا واضح تصور دلانے کے لئے کسی مانوس چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے یا اس سے موازنہ ومقابلہ کر کے مماثلت وفرق واضح کر دیا جاتا ہے۔

☆ حکایت، روایت، چٹکلے، ضرب المثل وغیرہ کی مدد سے کسی مجرد تصور کی توضیح کر دی جاتی ہے۔

☆ مشکل عبارت کا مفہوم اپنے آسان الفاظ اور سادہ انداز میں بیان کر دیا جاتا ہے۔

قابل لحاظ امور:

توضیح وتشریح سے پہلے اس کی ضرورت محسوس کرائی جائے تاکہ بچے غور سے سنیں تشریح سے پہلے اگر بچوں ہی کو اشکال حل کرنے کی دعوت دی جائے تو وہ تشریح کی ضرورت با آسانی محسوس کرلیں گے۔

بچوں ہی کی زبان اور اندازِ بیان میں تشریح کی جائے تاکہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آجائے اور بچے حسب ضرورت خود بھی تشریح کرسکیں۔

وضاحت کرتے وقت سبق کی اصل غرض وغایت پیش نظر رہے اور حتیٰ الامکان اختصار سے کام لیا جائے تاکہ غیر متعلق یا لایعنی تفصیلات میں وقت ضائع نہ ہو۔

☆ تشریح کے ضروری پوائنٹ اگر تختہ سیاہ پر نوٹ کر دیئے جائیں تو افادیت بڑھ جاتی ہے۔

☆ زبانی بتا دینے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ ممکن ہو تو تختہ سیاہ پر شکلیں اور گراف وغیرہ کھینچ کر مزید وضاحت کی جائے۔

☆ تشریح وتوضیح کے دوران طلبہ کو زیادہ سے زیادہ پوچھنے کا موقع دیا جائے۔

## ⑤ تصاویر، ماڈل چارٹ وغیرہ:

ابتدائی درجات میں مؤثر تدریس کے لئے مختلف چیزیں، ان کے ماڈل، تصاویر اور چارٹ وغیرہ کا استعمال نہایت مفید اور ضروری ہے کیونکہ ان کی مدد سے

☆ نئی معلومات بآسانی بہم پہنچائی اور ذہن نشین کرائی جاسکتی ہیں۔

☆ بچوں کے تصورات صحیح اور واضح بنتے ہیں۔

☆ سبق میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور بچے توجہ دیتے ہیں۔

☆ بیان کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔
☆ زبانی تشریح کے مقابلے میں ان کی بدولت ذہن میں زیادہ گہرے نقوش بنتے ہیں چنانچہ بات زیادہ دنوں تک یاد رہتی ہے۔
☆ مشاہدہ کی تربیت ہوتی ہے اور قابل توجہ پہلوؤں پر بچوں کی نظریں جمنے لگتی ہیں۔مرئی توضیحات مندرجہ ذیل اقسام کی ہوتی ہیں:

① اصل اشیاء
② ماڈل' تصاویر' پرمناظر گلوب وغیرہ
③ تصاویر' فوٹو' سبزیاں' پوسٹر وغیرہ
④ نقشے' خاکے' گراف' چارٹ وغیرہ
⑤ عمل یا تجربہ کر کے دکھانا یا مشاہدے کے لئے لے جانا۔

اصل اشیاء پڑھاتے وقت اگر اصل اشیاء بچوں کے سامنے پیش کی جاسکیں اور بچوں کو انہیں دیکھنے چھونے اور کھانے پینے کی چیزیں ہوں تو سونگھنے اور چکھنے کا بھی موقع مل سکے تو معلومات نہایت واضح ہوں گی اور تصورات صحیح قائم ہوں گے اس لئے جو چیزیں باآسانی حاصل ہوسکتی ہوں اور درجے میں لائی بھی جاسکیں یا ان تک باآسانی پہنچا جاسکے ان کے بارے میں تو معلومات اسی انداز سے بہم پہنچائی جائیں چھوٹے بچوں کے ضمن میں تو ایسا کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ ان کے تجربات و مشاہدات ناقص اور محدود ہوتے ہیں اور تصاویر نقشہ جات' چارٹوں وغیرہ کی مدد سے وہ بخوبی سمجھ نہیں پاتے اصل اشیاء کو حتیٰ الامکان ان کے پس منظر ہی میں دکھانا چاہئے مشاہدے کے وقت اہم پہلوؤں کی طرف بچوں کو متوجہ کرنا چاہئے ورنہ بہت سی اہم باتیں وہ اپنے طور پر دیکھ نہیں پاتے اور نہ قوت مشاہدہ کی تربیت ہو پاتی ہے۔

② ماڈل جغرافیہ' تاریخ اور عام سائنس میں متعدد ایسے مناظر اور اشیاء کے بارے میں معلومات بہم پہنچانی ہوتی ہیں جن تک رسائی مشکل ہے یا جو بہت بڑی ہوتی

ہیں یا کسی اور وجہ سے درجے میں لائی نہیں جا سکتیں مجبوراً ان کے ماڈلوں سے کام چلانا پڑتا ہے ماڈل سستے مگر صاف اور صحیح بنانے یا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے ماڈل اشیاء کے بھی ہوتے ہیں اور مناظر و نقشہ جات کے بھی جو ٹھوس ہونے کی وجہ سے بچوں کے لئے قابل فہم بھی ہوتے ہیں اور جاذب نظر بھی لیکن چونکہ اصل کے مقابلے میں عموماً نہایت چھوٹے ہیں اس لئے ان کو دیکھ کر غلط تصورات قائم ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ماڈل کے ساتھ اس کی اصل تصویر بھی دکھائی جائے تا کہ سائز اور پس منظر وغیرہ کے متعلق صحیح تصورات قائم ہوں۔

③ تصاویر، پوسٹر وغیرہ: بچے کہانیوں کی طرح تصاویر کے بھی بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ کوئی تصویر سامنے آئے تو اس کو غور سے دیکھنے اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے خواہشمند ہوتے ہیں چنانچہ خوش رنگ پوسٹرز اور تصاویر کی وجہ سے سبق بہت دلچسپ بھی ہو جاتا ہے اور قابل فہم بھی واضح تصورات قائم کرانے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے ان کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

☆ شکلیں بہت بڑی خوش رنگ اور جاذب نظر ہوں اور ان میں صرف وہی تفصیلات نمایاں طور پر دکھائی گئی ہوں جن کے لئے وہ بچوں کے سامنے پیش کرنی ہیں۔

☆ خود بنائی یا ساتھ اساتذہ کی مدد سے تیار کی جا سکیں تو بہتر ہے۔

☆ ہر معلم کو ایک ایسا البم تیار کرنا چاہئے جس میں اپنے مضامین سے متعلق شکلیں برابر اکٹھی کی جاتی رہیں تا کہ بر وقت دکھائی جا سکیں۔ پرانے انگریزی رسائل سے خاصا ذخیرہ اکٹھا ہو سکتا ہے۔

☆ پوسٹرز وغیرہ تیار کرنے میں بڑے بچوں سے بھی مدد لی جائے۔

☆ ہر معلم کو جدید طرز کی سادہ شکلیں بنانے کی مشق کر لینی چاہئے یہ نہایت آسانی سے اور بہت کم وقت میں تیار ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود بڑی مؤثر ہوتی ہیں۔ بچے انہیں زیادہ پسند کرتے ہیں۔

### ④ نقشے' چارٹ' گراف وغیرہ:

نو دس سال کے بچے اصل اشیاء یا ان کے ماڈلوں اور تصویروں کی جگہ نقشوں اور خاکوں کی مدد سے بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں اس لئے رفتہ رفتہ ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے تاریخ میں نقشہ جات اور ٹائم چارٹ سے جغرافیہ اور عام سائنس میں مختلف طرح کے خاکوں' نقشہ جات' گلوب' گراف اور چارٹوں وغیرہ سے مدد لینی چاہئے۔

### ⑤ عمل' تجربہ' مشاہدہ:

زبانی سمجھانے کے مقابلے میں اگر بچوں کے سامنے کر کے دکھا دیا جائے مثلاً نماز پڑھنے کا پورا طریقہ تو بات باآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے ایسے تمام مواقع پر زبانی سے زیادہ عملی مظاہرہ مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح عام سائنس اور جغرافیہ وغیرہ کے ضمن میں تجربہ کر کے دکھانا یا بچوں کو تجربہ اور مشاہدہ کا موقع فراہم کرنا بھی معلومات کو واضح کرنے میں بہت معاون ہوتا ہے اور ان سے بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔

☆ قابل لحاظ امور توضیحات کے انتخاب میں بچوں کی عمر ذہنی استعداد اور دلچسپیوں کو ملحوظ رکھا جائے تاکہ بچوں کے لئے جاذب توجہ بھی ہوں اور قابل فہم بھی ان سے بات بھی بخوبی سمجھ میں آ جائے گی اور یادداشت میں باآسانی محفوظ ہو جائے گی۔

☆ جس چیز کی وضاحت کے لئے استعمال کی جا رہی ہے اس سے براہِ راست متعلق ہو اور حتیٰ الامکان صرف ان تفصیلات پر مشتمل ہو جن کی واقعی ضرورت ہے غیر متعلق یا غیر ضروری تفصیلات سے بات واضح ہونے کے بجائے اور

گنجلک ہو جاتی ہے۔

☆ درجے کے سامنے سلیقے سے پیش کی جائیں تاکہ ہر بچہ بخوبی دیکھ سکے قابل توجہ پہلوؤں کی طرف مناسب سوالات یا ہدایات کے ذریعہ متوجہ کیا جائے تاکہ ضروری امور مشاہدے سے نہ رہ جائیں۔

☆ توضیحات کے ضمن میں بچوں کو جتنے زیادہ سے زیادہ حواس سے کام لینے کا موقع دیا جا سکے اتنا ہی مفید ہوتا ہے مثلاً دیکھنے' چھونے' سونگھنے' چکھنے کی آواز نکلتی ہو تو سننے کے مواقع اس طرح زیادہ صحیح اور واضح تصور بن سکے گا۔

ابتدائی درجات میں اصلی اشیاء یا ان کے ماڈل دکھائے جائیں پھر بتدریج تصاویر' نقشہ جات اور گراف وغیرہ سے کام چلایا جائے۔

☆ تمام توضیحی سامان ایک ساتھ بچوں کے سامنے نہیں لانا چاہئے بلکہ آڑ میں رکھنا چاہئے اور حسب موقع وضرورت ایک ایک کو درجے کے سامنے پیش کرنا چاہئے ورنہ بچوں کی توجہ بھٹکتی ہے اور تجسس ختم ہو جانے کے بعد وہ کشش بھی باقی نہیں رہتی جو دکھاتے وقت مطلوب ہے۔

☆ بچوں کے سامنے پیش کر کے فوراً ہٹا نہ لیا جائے بلکہ اتنی دیر سامنے رکھا جائے کہ انہیں تسکین ہو جائے اور ضروری امور کا وہ بخوبی مشاہدہ کر لیں۔

☆ ہر مدرسے کو نقشہ جات' گلوب' ماڈل' البم مختلف قسم کے پوسٹرز' تصاویر' چارٹ وغیرہ زیادہ سے زیادہ اکٹھا اور تیار کرنا چاہئیں تاکہ تدریس کو مؤثر اور دلچسپ بنانے میں اساتذہ ان سے مدد لے سکیں۔ آج کل اس طرح کی متعدد فرمیں کام کر رہی ہیں جن کے ہاں سے طرح طرح کے تعلیمی سامان بکفایت حاصل ہو سکتے ہیں۔

## ⑥ تعلیمی سیر وسیاحت اور پکنک:

سماجی اور فطری ماحول سے متعلق متعدد ایسے عنوانات شامل نصاب ہوتے ہیں جن کے بارے میں واضح تصورات نہ تو کتابوں کے ذریعے ممکن ہیں اور نہ درجے میں بٹھا کر روایتی تدریس سے بلکہ بچوں کو خود موقع پر لے جا کر غائر مشاہدہ کرانے ہی سے صحیح معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں مثلاً کارخانوں' منڈیوں' ندی نالوں' فصلوں اور فطری مناظر وغیرہ کے متعلق' اسی طرح متعدد ایسے اجتماعی' انفرادی و معاشرتی اوصاف ہیں جن کی تربیت کے فطری مواقع درجے میں ہاتھ نہیں آتے بلکہ ان کے لئے باہر نکلنا ضروری ہوتا ہے۔

روایتی تدریس سے جہاں بچے عموماً گھبراتے اور چھٹیوں کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں' تفریح میں انہیں بڑا مزہ آتا ہے' وہ پوری دلچسپی اور گہرے انہماک سے ان میں شریک ہوتے ہیں اور اس ضمن کی متعدد مشکلات اور پریشانیوں کو بخوشی جھیل لیتے ہیں ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت کے ایسے مفید و مؤثر ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی امکانی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔

تعلیمی سیاحتوں میں تعلیم کا مقصد مقدم ہونا چاہئے اور پکنک میں تربیتی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ درجے کی فضا یہاں بھی طاری رہے' بلکہ جائز حدود میں بچوں کو آزادی' دلچسپی اور تفریح کی پوری گنجائش دی جائے۔

تعلیمی اغراض کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا مشاہدہ کرانا مقصود ہے بچے اس کا بخوبی مشاہدہ کر سکیں' ان کی قوت مشاہدہ کی تربیت ہو' ان کے تصورات واضح ہوں' معلومات میں اضافہ ہو' سبق کا مقصد احسن وخوبی سے پورا ہو' فطری وسماجی ماحول اور ان کا اشیاء کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کا ذوق ابھر آئے۔

تربیتی اغراض سے مراد یہ ہے کہ بچے چلنے پھرنے' کھانے پینے' ملنے جلنے کے آداب سیکھیں' سفر اور اس کے انتظامات کا تجربہ حاصل کریں' مل بانٹ کر کھائیں

پئیں' ایک دوسرے کی مدد کریں' ان کو گھر سے باہر کی محنت و مشقت کی زندگی کا تجربہ ہو اور سفر میں کھانے پینے' نماز اور آرام وغیرہ سے متعلق ضروری انتظامات کے لئے راہ پیدا کرنے کا انہیں سلیقہ آئے۔

ابتدائی درجات میں یہ پروگرام بہت لمبے نہ ہونے چاہئیں چھوٹے بچوں کے لئے عام طور پر گھنٹے دو گھنٹے کے اور مدرسے یا آبادی کے قریب ہی' بڑے بچوں کے لئے عموماً تین چار گھنٹے اور قدرے فاصلے پر' اس طرح کے مختصر پروگرام وقفے سے متصل گھنٹوں یا آخری گھنٹوں میں ہو سکتے ہیں البتہ کبھی کبھی دن بھر کا پروگرام وقفے سے ہونا چاہئے تاکہ تعلیمی و تربیتی دونوں اغراض حاصل ہو سکیں اس طرح کے پروگرام ہفتے کے آخری دن یا چھٹیوں میں مناسب ہوتے ہیں تاکہ واپسی پر آرام کا کچھ مل سکے۔

قابل لحاظ امور:

ان سیاحتوں سے پورا فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ طلبہ کی تعداد اتنی ہو کہ سنبھالنے میں زیادہ دشواری نہ ہو۔
☆ روانگی سے قبل سیاحت کی غرض بچوں پر اچھی طرح واضح کر دی جائے۔
☆ سفر کا پورا خاکہ ان کے مشورے سے مرتب کیا جائے' ضروری سامان کی فہرست تیار کر لی جائے اور ان کی فراہمی نیز نگرانی کا کام طلبہ کی ٹولیوں سے انجام دلایا جائے۔
☆ جس جگہ لے جانا ہو مدرس ایک بار وہاں جا کر تفصیلی معلومات خود حاصل کر آئیں۔
☆ کم سے کم وقت اور کم سے کم پیسہ خرچ کیا جائے تاکہ یہ سیاحتیں تعلیم میں حارج یا جیب پر بار نہ ہوں۔

☆ سارے کام حتی الامکان بچوں ہی سے انجام دلائے جائیں۔
☆ جائز حدود میں بچوں کو پوری آزادی دی جائے۔

## ⑦ دیگر امدادی سامان:

مندرجہ بالا اشیاء کے علاوہ اگر استطاعت ہو تو مندرجہ ذیل اشیاء سے بھی تدریس کو مؤثر اور دلچسپ بنانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے اور طلبہ کو متعدد نئی معلومات ان کی مدد سے باآسانی بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔

☆ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے وہ پروگرام جو بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے نشر ہوتے ہیں۔
☆ گراموفون کے وہ ریکارڈ جو تلفظ وغیرہ سکھانے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔
☆ ٹیپ ریکارڈنگ مشین کی مدد سے فراہم کیا جانے والا مواد۔
☆ بچوں کے پروگرام جو تعلیم وتربیت کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔
☆ پوسٹرز کی مدد سے پیش کی جانے والی تصاویر اور مناظر۔
☆ رسائل واخبارات جو بچوں ہی کے لئے نکلتے ہیں۔

## ⑧ ہوم ورک:

لکھنے پڑھنے یا عملی واخلاقی تربیت سے متعلق وہ کام جو طلبہ کو گھر پر کرنے کے لئے دیا جاتا ہے ہوم ورک کہلاتا ہے۔

بچوں میں اپنے قد کے لحاظ سے کافی توانائی ہوتی ہے وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی مصروفیت چاہتے ہیں چونکہ مدرسے میں وہ صرف چند گھنٹے گزارتے ہیں گھریلو ذمہ داریاں بھی ان پر برائے نام ہی ڈالی جاتی ہیں' اس لئے ان کے پاس فاضل توانائی بھی ہوتی ہے اور فرصت کے لمحات بھی لیکن مناسب رہنمائی اور مفید مصروفیات نہ ہونے کی صورت میں اکثر ان کی قوتیں غلط رخ پر پڑ جاتی ہیں اور بیش وقت

لمحات فضول اور مضر کاموں میں ضائع ہونے لگتے ہیں بچوں کی فاضل توانائی اور فرصت کے اوقات کو کارآمد بنانے اور مفید کاموں میں لگانے کے لئے ہوم ورک نہایت ضروری ہے۔

بے مقصد ہوم ورک کی قباحتیں:

ہوم ورک دینے کا عام طور پر جو رواج چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے' الفاظ معنی یاد کرنے انشاو ترجمہ اور قواعد کی مشقیں یا ریاضی کے سوالات حل کرنے کا جو خشک کام دن بھر مدرسے میں ہوتا ہے اس کا باقی ماندہ حصہ گھر سے پورا کر کے لانے کے لئے دے دیا جاتا ہے اسے مکمل کرانے کی ذمہ داری سرپرست کی سمجھی جاتی ہے چنانچہ وہ طلبہ بڑے سعادت مند کہلاتے ہیں جو بروقت کام کر لاتے ہیں اور وہ سرپرست بہت اچھے سمجھے جاتے ہیں جو اس ضمن میں پورا تعاون کرتے ہیں' خواہ اس کے لئے انہیں ٹیوٹر ہی کیوں نہ رکھنا پڑے۔ اس کے برعکس ان طلبہ کو سزا کا مستوجب سمجھا جاتا ہے جو ہوم ورک پورا نہیں کرتے اور ان سرپرستوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے جو کام پورا کرنے کا معقول بندوبست نہیں کرتے ہوم ورک کے اس روایتی انداز میں متعدد خرابیاں ہیں اس لئے اس پر سخت تنقید کی جاتی ہے مثلاً

☆ بچوں پر کام کا بہت زیادہ بار پڑ جاتا ہے جس سے ان کی صحت متاثر ہوتی ہے۔
☆ جو کام بچے دن بھر اسکولوں میں کرتے ہیں اور جن سے وہ اکتا چکے ہوتے ہیں وہی کام جب ان پر لاد دیا جاتا ہے تو وہ اسے بیکار سمجھتے ہیں اور اسے خوشی سے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے چنانچہ ہوم ورک پورا کرنے کے لئے انہیں اکثر سزا دینی پڑتی ہے جس کے نتیجے میں بچے تعلیم ہی سے بھاگنے لگتے ہیں۔
☆ آزادی کی ساعت اپنی دلچسپی کے مشاغل و مصروفیات میں حصہ لینے کا بچے وقت ہی نہیں پاتے حالانکہ یہ بھی تمام چیزیں ان کی تعلیم و تربیت کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

☆ کتنے بچے ایسے ہوتے ہیں جن کے گھریلو حالات اس طرح کے کاموں کی اجازت نہیں دیتے یا وہ اپنے طور پر کر ہی نہیں سکتے وہ سزا کے ڈر سے دوسروں کی نقل کرنے اور معلم کو دھوکا دینے کی عادت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

☆ معلم اپنی ذمہ داری سے بچتے، کتراتے اور اسے زبردستی سرپرستوں پر ڈالتے ہیں اور اس ضمن میں طلبہ کو پریشان کرتے ہیں۔

اہمیت وافادیت:

لیکن یہ اعتراضات دراصل ہوم ورک کی نوعیت، مقدار اور اس ضمن میں معلم کے رویے پر ہیں اگر ان کا ازالہ ہو جائے تو ہوم ورک کی اہمیت وافادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ہوم ورک اگر سلیقے سے دیا جائے اور ہمدردی سے جانچا جائے تو یہ تعلیم کا بہت ہی مؤثر ذریعہ ہے اور اس سے مندرجہ ذیل فوائد متوقع ہیں:

☆ بچے فرصت کے اوقات کو آوارہ گردی یا شرارت میں ضائع کرنے کے بجائے گھر ہی پر مفید کاموں میں صرف کرتے ہیں۔

☆ کسی مدد یا مداخلت کے بغیر خود خاکہ بنا کر کام انجام دینے کا انہیں سلیقہ آتا ہے اور آزاد مطالعہ کی عادت پڑتی ہے۔

☆ درجے میں کئے ہوئے کاموں میں مشق و مہارت حاصل کرنے اور پڑھے ہوئے مواد کو بہتر یا اس کا اعادہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

☆ غیر نصابی مصروفیات ومشاغل جو اب نصاب ہی کا اہم جز شمار ہوتے ہیں ان کی تکمیل میں مدد ملتی ہے نیز جس مضمون کے مشغلے سے انہیں زیادہ لگاؤ ہوتا ہے اس پر مزید توجہ صرف کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔

☆ بعض ایسے کام جو بچے اپنے طور پر کر سکتے ہیں ان میں معلم کا وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے چنانچہ وہ اس بچے ہوئے وقت کو تدریس کے دوسرے ضروری کاموں میں صرف کرسکتا ہے۔

☆ نصابِ تعلیم جو معاشرے کی پیچیدگی اور وسعت میں اضافہ کے ساتھ روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اس کی تکمیل ہوم ورک کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

☆ سرپرستوں کو اپنے بچوں کی رفتارِ ترقی کا اندازہ ہو سکے گا اور وہ معلم کے تعاون اور مشورے سے مناسب اقدام کر سکیں گے۔ اس طرح ہوم ورک سرپرستوں سے روابط کے قیام اور گھر اور مدرسے میں تعاون کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

☆ بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور وہ اپنی معلومات نیز مشق و مہارت میں اضافے کے لئے پابندی سے محنت و مشقت کرنے کے عادی بنیں گے۔

☆ ہوم ورک کے ذریعے طلبہ میں بعض ایسے مستقل ذوق پروان چڑھائے جا سکتے ہیں جن سے ان کے لمحاتِ فرصت زندگی بھر مفید کاموں میں صرف ہو سکیں۔

## قابلِ لحاظ امور:

ہوم ورک دینے میں بچوں کی عمر ان کی ذہنی و جسمانی حالت ان کے گھریلو حالات ان کی صلاحیت و استعداد اور ان کی دلچسپیاں پیشِ نظر رہنی چاہئیں' بچوں کے کھانے کھیلنے کے دن ہوتے ہیں انہیں اس کے پورے مواقع ملنے چاہئیں چھ سات سال کی عمر تک تو انہیں کوئی ہوم ورک نہ دینا چاہئے دس سال کی عمر تک جو کچھ درجے میں ہو جائیں اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے البتہ مدرسہ کے عجائب گھر کے لئے پھول پتیاں' چڑیوں کے پر' پھلوں کے بیج' گھونگھے' شیشے اور چینی کے خوبصورت ٹکڑے' ٹکٹ تصویریں وغیرہ جمع کرنے مشاہدات و معلومات میں اضافہ کے لئے منظم پروگرام کے تحت سیر پر جانے' پھول بوٹے لگانے' گھریلو سامان کے ماڈل' کوئی ماڈل یا کسی چیز کی ڈرائنگ بنانے' گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے' والدین کی خدمت' غریبوں معذوروں کی امداد' چھوٹے بھائی بہنوں کو بہلانے' مسجد کی صفائی وغیرہ کے کام دیئے جا سکتے ہیں یا پڑھنے کے لئے آسان نظموں کے مجموعے وغیرہ دیئے جائیں بعد کے درجات میں بھی طلبہ کی انفرادی دلچسپی استعداد' گھریلو حالات اور گھر میں بچے کی ذمہ

داریوں، والدین کی مصروفیات علالت، معاشی حالت وگھر کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے اور اتنا ہی کام دینا چاہئے جتنا دوسروں کی مدد کے بغیر محدود وقت میں خود بآسانی انجام دے سکتے ہوں۔

☆ مختلف مضامین کے اساتذہ کو مل کر ہوم ورک کا ایسا نظام الاوقات مرتب کرنا چاہئے جس سے ان کے دیئے ہوئے کاموں میں ہم آہنگی رہے بچوں پر کام کا بار بھی نہ ہونے پائے اور ہر معلم اپنی باری پر ضروری ہوم ورک دے سکے صدر مدرس کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے ورنہ ہر معلم اپنے ہی مضمون کا زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہتا ہے اور بچے بلاوجہ پستے ہیں۔ نظام الاوقات کے ذریعہ پابند کردیا جائے کہ کوئی معلم محدود اور متعین وقت سے زیادہ کام نہ لے۔

☆ تعطیلات اس لئے ملتی ہیں کہ بچے مدرسے کی فکروں سے آزاد کچھ دوسری نوعیت کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں لیکن اساتذہ عموماً تعطیلات میں بھی علمی انداز ہی کا بہت سا ہوم ورک دے دیتے ہیں جو بچوں کی طبیعت پر بار بھی ہوتا ہے اور دیگر دلچسپ اور ضروری مصروفیات کے باعث وہ کر بھی نہیں پاتے اور بلاوجہ سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ تعطیلات بچوں کی صحت وصفائی، جسمانی اخلاقی مذہبی و معاشرتی تربیت کے لئے بہت مناسب موقع فراہم کرتی ہیں، اس لئے ہوم ورک ان سرگرمیوں سے مناسب رکھنے والا اور ایسا ہونا چاہئے جس میں گھر کے دوسرے افراد بھی دلچسپی لے سکیں۔

☆ خفگی کے موڈ یا سزا کے طور پر ہوم ورک ہرگز نہ دیا جائے اور نہ اس انداز سے کہ بچے اسے بہت ہی مشکل اور ناقابل حل شمار کرنے لگیں بلکہ انہیں آمادہ کرلیا جائے اور دیتے وقت یہ یقین دلایا جائے کہ تھوڑی سی جدوجہد سے وہ اسے حل کرلیں گے اور کام ہونا بھی اس معیار کا چاہئے کہ بچے کوشش کرکے خود پورا کر سکیں اس طرح مزید کام کے لئے ہمت بندھتی ہے اگر کام اتنا مشکل ہو کہ

باوجود کوشش وہ حل ہی نہ کر سکیں تو مایوسی طاری ہوگی اور مزید کام کے لئے ان کی طبیعت آمادہ نہ ہوگی۔

☆ جو کام بھی دیا جائے اس کے بارے میں یہ یقین کرلیا جائے کہ اس سے بچوں کے فرصت کے اوقات کو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے کار آمد بنانے میں مدد ملے گی اور اپنے طور پر مطالعہ یا کسی اور مفید مشغلہ میں لحات فرصت صرف کرنے کے عادی بنیں گے۔

☆ اصول سمجھانے اور اس کا استعمال بتانے نیز ابتدائی مشق کرانے کا کام درجے میں کرالیا جائے پھر مزید مشق و مہارت کیلئے ایسا کام دیا جاسکتا ہے جس کو بچے اپنے طور پر محنت کر کے حل کر سکتے ہیں۔

ہوم ورک کی بروقت جانچ اور اصلاح ہونی چاہئے ورنہ بچوں کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ان میں ڈھیل پیدا ہوگی۔

☆ تحریری کام کی جانچ اور اصلاح بچوں سے درجے میں یا گھر پر جو تحریری کام بھی لیا جائے اس کام کی اصلاح اگرچہ مشکل کام ہے لیکن ہے نہایت ضروری کیونکہ اسی طرح بچے اپنی غلطیوں سے واقف ہو کر اپنی اصلاح کر سکیں گے۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں:

☆ کام کی تکمیل کے بعد جلد از جلد اصلاح کر دی جائے۔ اصلاح اگر رہنمائی کر کے خود بچے کے ذریعے کرائی جاسکے تو بہت اچھا ہو ورنہ حتی الامکان اس کے سامنے ہونی چاہئے اس طرح بچے کی سمجھ میں اپنی غلطی بخوبی آجائے گی اور اس سے بآسانی چھٹکارا پا سکے گا۔

☆ تحریری کام سے قبل زبانی مشق کرالی جائے تو غلطیاں کم ہوں گی اور اصلاح میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔

☆ تصحیح کے علاوہ علامات مقرر کر کے طلبہ کو ان سے مطلع کر دینا چاہئے اس طرح

وقت کم صرف ہوگا۔

☆ مشترک غلطیوں کی اصلاح اجتماعی طور پر ہونی چاہئے تا کہ وہی بات ہر ایک کو علیحدہ نہ سمجھانی پڑے۔

☆ اچھے کاموں پر موزوں ریمارک اور ناقص پر ضروری ہدایات دی جائیں اس سے آگے کے کام میں مدد ملے گی۔

## ⑧ موزوں درسی کتب کا انتخاب:

درسی کتب وتدریس کے کام میں موزوں درسی کتب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ان کی وجہ سے معلم کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اسباق کے لئے بہت زیادہ نوٹ لینے اور مشقیں تیار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کم صلاحیت کے اساتذہ بھی ان کی مدد سے کام چلا لیتے ہیں مشق واعادہ کے لئے طلبہ کے پاس درسی کتب کی شکل میں پورا مواد ہر وقت موجود رہتا ہے۔

## موزوں کتب کا انتخاب:

بازار میں درسی کتب تو طرح طرح کی ملتی ہیں لیکن مختلف حیثیتوں سے موزوں ان میں بہت کم ہی ہوتی ہیں بچوں کے لئے وہی کتب منتخب کی جائیں۔

☆ جو تعصب وتنگ نظری اور کفر وشرک سے پاک ہوں۔

☆ جن سے اعلیٰ نصب العین اور پاکیزہ نظریۂ حیات بنانے' سیرت کو سنوارنے اور خیالات کو بلند کرنے میں مدد ملے۔

☆ جن کی زبان سلیس و بامحاورہ' طرزِ بیان شگفتہ اور بچوں کے لئے دلچسپ اور قابل فہم ہو۔

☆ جو بچوں کی عمر' نفسی کیفیات' میلانات ورجحانات اور فطری دلچسپیوں کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہوں۔

☆ جن کا کاغذ مضبوط، ٹائٹل جاذب نظر، طباعت صاف اور صحیح، حروف واضح اور جلی کم قیمت اور سائز و حجم اتنا ہو کہ بچوں کو مدرسہ لانے لے جانے میں زحمت نہ ہو اور جو آسانی سے دستیاب ہوسکیں۔

☆ جو نصاب میں منظور شدہ عنوانات پر حتی الامکان حاوی ہوں تاکہ باہر سے مدد لینے کی کم ہی ضرورت پڑے۔

☆ جو خوش رنگ مناظر اور ضروری شکلوں اور خاکوں وغیرہ سے مزین ہوں۔

☆ جو موزوں مشقوں اور طریق کار وغیرہ سے متعلق ضروری ہدایات سے بھرپور ہوں۔

☆ جن کی تیاری میں حالات وضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو اور جن کا مواد بچوں کے تجربات ومشاہدات اور روزمرہ زندگی سے متعلق اور مربوط کر کے پیش کیا گیا ہو۔

☆ جن کے اسباق بچوں کا تجسس ابھارنے انہیں پڑھنے پر آمادہ کرنے ان کی توجہ کو کھینچنے اور ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں معاون ہوں۔

## درسی کتب کا استعمال:

صرف درسی کتب پڑھا دینے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ضروری معلومات اپنی طرف سے بھی فراہم کی جائیں۔

☆ ہر کتاب کے تمام اسباق یکساں ضروری اور مفید نہیں ہوتے اس لئے پوری کتاب سبق سبق پڑھانے اور رٹوانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ بعض خود سمجھنے میں آنے والے غیر ضروری یا کم مفید حذف کر کے ان کی جگہ علیحدہ سے ضروری مواد فراہم کیا جائے اور بعض آسان اسباق کا کچھ جز پڑھا کر باقی طلباء پر چھوڑ دیا جائے۔

☆ مشقیں اور طریق تعلیم سے متعلق ہدایات عموماً درسی کتب کی جان ہوتی ہیں لیکن بہت کم اساتذہ ان سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض تو انہیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے اور انہیں زبانی تحریری طور پر حل کرانے کی پوری کوشش کرنی چاہئے۔

☆ پڑھاتے وقت اپنی طرف سے بھی سوالات اور مشقیں دے کر بچوں کو طبع آزمائی کا موقع دینا چاہیے۔

☆ کوشش کی جائے کہ کم سے کم درسی کتب سے کام چل جائے۔

☆ جغرافیہ، عام سائنس اور دیگر معلومات مضامین کی تدریس میں درسی کتب کے ساتھ مشاہدہ اور تجربہ پر پوری توجہ دی جائے۔

۱۰

# ادارے کی تنظیم کے اصول

# باب : ⑩

## ① اصول مقصدیت:

ہر ادارے کے قیام کے کچھ اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ اس ادارے میں انجام دی جانے والی ہر فعالیت کا رخ ان مقاصد کے حصول کی طرف ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق مدرسے کی ہر تدریسی اور سماجی سرگرمی میں ان اغراض و مقاصد کا پر تو نظر آنا چاہئے جن کے لئے وہ مدرسہ قائم کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کا مطمح نظر ایک ایسے اسلامی جمہوری معاشرے کا قیام ہے جو "فوز العظیم" (عظیم فلاح) کے حصول کا باعث ہو اور جو تمام دنیا کے لئے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہو ظاہر ہے کہ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے مدارس میں ایسی فعالیتوں کا بندوبست کرنا ہوگا جو بچوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کریں اور انہیں سچے مسلمان بنائیں اسی طرح مدارس میں ان اساتذہ کو متعین کیا جائے گا جو اسلام اور جمہوریت کے پرستار ہوں اسی اصول کے تحت پاکستانی مدارس کے اغراض و مقاصد اور تعلیمی سرگرمیوں کی نوعیت ہندوستان یا انگلستان سے مختلف ہوگی۔ ایسے ہی ایک عام سکول اور پبلک سکول کے درمیان ایک پیشہ وارانہ سکول اور جامع ہائی سکول کے مقاصد اور مسائل میں اختلاف ہوگا اسی طرح کا فرق صنعتی علاقے میں قائم مدارس اور زرعی معاشرے میں قائم مدارس سے ہوگا۔

تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس بات سے آگاہ ہیں کہ دنیا کے اکثر معاشروں میں بچے کو آزادانہ طور پر اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کرنے کا موقع دینے کو تعلیم کا مقصد سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بچے کی انفرادیت پر

زور دیا جاتا ہے۔ ایسے مدارس میں فوجی قسم کا نظم و ضبط ان مدارس کی اس بنیادی پالیسی کے خلاف ہوگا جس کی رو سے یہ قرار پایا ہے کہ بچے کی تربیت جمہوری انداز میں کی جائے۔ لیکن بعض معاشرے ایسے بھی ہیں جہاں انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور جہاں فرد کی انفرادیت کو اجتماعی مقاصد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہی بات ہے کہ مختلف معاشروں میں مدارس کی تنظیم کرتے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ ایسے ہی آمریت کے تحت قائم کردہ مدارس کا نظم و نسق جمہوریت کے تحت قائم کردہ مدارس کے نظم و نسق سے مختلف ہوگا۔

اس اصول کے تحت یہ ضروری ہے کہ ادارے اور اس نظم و نسق کے مقاصد کا تعین کر لیا جائے اور تمام متعلقہ اشخاص انہیں اچھی طرح سمجھ لیں۔

## ② اصول جامعیت:

اصول جامعیت سے مراد یہ ہے کہ مدرسے میں اتنے مختلف اقسام کے مشاغل، تحریکات اور فعالیتیں مہیا کی جائیں کہ وہاں تعلیم حاصل کرنے والا ہر بچہ اپنے طبعی رجحانات، ضروریات اور دلچسپیوں کے مطابق ان فعالیتوں میں حصہ لے سکے۔

ہر مدرسے کے کچھ عمومی مقاصد ہوتے ہیں جن کا تعین معاشرہ کرتا ہے۔ مثلاً بچوں کے دلوں میں مذہب اور جمہوریت کا احترام راسخ کرنا، جذبۂ حب الوطنی کی نشو و نما، محنت اور دستی کام کی عظمت کا احساس، بزرگوں کا ادب، خود اعتمادی، مسائل کو غور و فکر سے حل کرنے کا ملکہ، حسن سلوک، اخوت، رواداری، شائستگی غرض اخلاق جلیلہ کی تربیت اور سیرت و کردار کی تعمیر وغیرہ لیکن اس کے ساتھ ہی مدرسے میں آنے والے طلباء کے کچھ خصوصی مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً صنعتی علاقے کے رہنے والے صنعتی علوم سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے صنعتی علوم کی تدریس تجربہ گاہوں اور ورکشاپوں کا انتظام کرنا ہوگا۔ زرعی معاشرے سے آنے والے بچے زرعی علوم

میں مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں' ان کے لئے زراعت کی تعلیم' زرعی آلات' فارم اور ماہر زراعت استاد کا بندوبست لازمی ہے۔ ایسے ہی فوجی گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طلباء کے لئے جو اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خود کو دفاع وطن کے مقدس فریضے کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں ملٹری سائنس کی تدریس کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ چونکہ مدرسے کا معاشرہ مختلف عناصر پر مشتمل ہوتا ہے' ان سب کے لئے ان کی ضروریات کے مطابق پسندیدہ سرگرمیوں کی تنظیم اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا مدرسے کے فرائض میں شامل ہے۔

ایک اور بات جسے ذہن میں رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ بچوں کے خاندانی پس منظر اور اس لحاظ سے ان کی قابلیت اور ذہنی استعداد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بعض بچے ایسے مفلس گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لئے جسم و جان کا رشتہ بھی قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ غم روزگار ان کے والدین کو اس کی فرصت ہی نہیں دیتا کہ وہ تعلیم کے سلسلے میں بچوں کی کوئی مدد کر سکیں یا انہیں لوازمات مہیا کر سکیں۔ چنانچہ ایسے بچے پس ماندہ رہتے اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے بچے جو مالی لحاظ سے خوشحال خاندانوں سے آتے ہیں ذہنی لحاظ سے مطمئن ہونے کی وجہ سے تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور ہر میدان میں دوسرے بچوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ہر دو گروہوں میں مختلف نفسیاتی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں' نظم و نسق میں اس فرق کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

اسی طرح پڑھے لکھے گھرانوں سے آنے والے بچے ان پڑھ گھرانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی نسبت زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔ مؤخر الذکر طبقے کے بچوں کے لئے خصوصاً ان کے لئے جو پڑھائی میں پس ماندہ رہ جائیں معالجاتی تدریس کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔

بعض اوقات ایک ہی مدرسے میں شہری اور دیہاتی دونوں طرح کے بچے جمع ہو

جاتے ہیں طبعی میلانات اندازِ کار اور زبان کے لحاظ سے ان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہمیں مدرسے کی سرگرمیوں کو اس طرح ترتیب دینا چاہئے کہ دونوں ان سے یکساں مستفید ہو سکیں۔

نفسیات کی رو سے ہر بچے کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی، تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کی متوازن نشوونما ہو۔ انفرادی لحاظ سے بچے کا یہ حق ہے کہ اس کی مکمل ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی تربیت ہو، وہ علوم و فنون حاصل کر کے کسب معاش کے قابل ہو اور دنیاوی آسائشوں سے متمتع ہو سکے، اسے اپنی شخصیت کی تہذیب و تکمیل اور معاشرے میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے تمام مواقع اور سہولتیں میسر ہونی چاہئیں۔ فرد کی بقا کا انحصار معاشرے پر ہے اور ہر معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ فرد کو تحفظ مہیا کرے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استعداد سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اس کے ساتھ ہی فرد کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ جس معاشرے کا حصہ ہے اسے اپنی قابلیت سے مستفید کرے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے کی تعمیر افراد سے ہی ہوتی ہے اور انہیں پر اس کے عروج و زوال کا دارومدار ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

فرد جہاں اپنے مستقبل کو سنوارتا ہے وہاں وہ قوم اور ملک کی طرف سے عائد کردہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اہلیت بھی پیدا کرتا ہے۔ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں توازن بھی معاشرے کی پائیداری کا ضامن ہے۔ مدرسے میں وہ رواداری اور دوسروں سے مل جل کر رہنے کا سبق بھی سیکھتا ہے۔ بچے کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں انفرادی اور اجتماعی کی متوازن نشوونما ضروری ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر مدرسے کا یہ فرض ہے کہ وہ ان دونوں کے لئے تدریسی اور غیر تدریسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع اور سہولتیں مہیا

کرے۔

یوں بھی جدید نظریۂ تعلیم کی رو سے بچے کو مدرسے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور مدرسے کی تمام فعالیتوں کا اِنصرام بچے کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اصول جامعیت کا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے میں اتنے متنوع مشاغل کا اہتمام کیا جائے کہ بچے کی شخصیت کا کوئی پہلو تربیت سے محروم نہ رہ جائے۔ ہر بچے کی دلچسپی کے مطابق اسے مصروف رکھنے کا بندوبست تاکہ وہ جسمانی طور پر صحت مند' ذہنی طور پر بیدار اور سماجی شعور سے بہرہ ور ہو سکے۔

## ⑶ اصول کفایت شعاری:

اصول کفایت سے مراد یہ ہے کہ مدرسے میں جو لوازمات' سہولتیں اور مواقع میسر ہوں ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور جن فعالیتوں کا اہتمام کیا گیا ہے ان کی انجام دہی میں ساز و سامان' وقت اور محنت سے پورا استفادہ کیا جائے تاکہ مادی یا انسانی وسائل کا ضیاع نہ ہو۔ مثلاً دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مدارس کی لائبریریوں میں کثیر تعداد میں کتب موجود ہوتی ہیں لیکن تقسیم کا موزوں انتظام نہ ہونے کی وجہ سے طلباء کے ہاتھوں تک نہیں پہنچتیں' ان پر گرد کی تہیں جمتی رہتی ہیں یا پھر وہ دیمک کی خوراک بنتی رہتی ہیں۔ اسی طرح سائنس کی تجربہ گاہ میں بہت سا سامان پڑا ہوتا ہے' لیکن بے توجہی' کاہلی اور بدانتظامی کی وجہ سے طلباء کو تجربات کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجتاً ان پر خرچ کیا گیا تمام روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔

اسی طرح کھیلوں کے لئے میدان اور سامان تو موجود ہے لیکن اس کے لئے بہت کوئی کم وقت محفوظ کیا جاتا ہے۔ عموماً صرف چند گنے چنے طلباء کو کھیلنے کا موقع ملتا ہے' جبکہ ان کی بیشتر تعداد کھیلنے سے محروم رہ جاتی ہے۔

ایسے ہی بعض مدرسوں میں کئی کمرے خالی پڑے رہتے ہیں یا ان میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوتا ہے لیکن استعمال میں آنے والے کمروں میں موزوں تعداد سے زیادہ طلباء

بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ کئی دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اساتذہ کے پیریڈ کم لگائے جاتے ہیں جماعت میں طلباء کی تعداد زیادہ رکھی جاتی ہے' اس طرح کئی کمرے خالی رہ جاتے ہیں۔

اس اصول کی خلاف ورزی اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ایک استاد کسی خاص مضمون کا ماہر ہے لیکن اسے دوسرا مضمون پڑھانے کے لئے کہا جاتا ہے چنانچہ نہ صرف اس استاد کی قابلیت رائیگاں جاتی ہے بلکہ طلباء کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ بعض اساتذہ کو سکاؤٹنگ اور کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ان کو ان کھیلوں کی مبادیات کا پتہ نہیں ہوتا لیکن انہیں ان کا انچارج بنا دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی کوئی استاد بزم ادب اور اس قسم کی دوسری غیر نصابی فعالیتوں کے لئے بالکل موزوں نہیں لیکن ذمہ داری اس کے سپرد کر دی جاتی ہے' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ شعبے بد نظمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس اصول کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ مدرسے میں صرف اتنی فعالیتیں شروع کی جائیں جن کے لئے خاطر خواہ انتظام کیا جا سکے۔ نیز فعالیتوں کی تقسیم کرتے وقت صدر معلم اپنی پسند یا ناپسند کو درمیان میں نہ لائے بلکہ اساتذہ کی دلچسپی اور اہلیت کے پیش نظر کام سپرد کرے۔ اسی طرح مضامین اور مشاغل کا انتخاب بچے کے رجحان طبع اور اہلیت پر چھوڑ دیا جائے' معلم اس کی رہنمائی تو ضرور کرے مگر اپنی مرضی نہ ٹھونسے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مدرسے میں کم سے کم مادی یا انسانی وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔

## ④ اصول اشتراک وتعاون:

اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے میں ہر معاملے میں اشتراک وتعاون اور اتحاد کی فضا قائم ہو۔ جمہوریت کا دور دورہ ہو اور تمام کام باہمی مشاورت اور خوش دلانہ تعاون سے انجام پائیں۔ مدرسے کے ہر کارکن کی عزت نفس کا خیال رکھا

جائے۔صدر مدرس حسن خلق سے کام لے' اساتذہ بھی صدر معلم کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئیں اور ہر معاملے میں ان کے ساتھ دلی تعاون کریں۔صدر معلم کی طرف سے آمرانہ طرز عمل اور اساتذہ کی جانب سے عدم تعاون کا مظاہرہ ادارے کی تباہی کا باعث ہوتا ہے' سب کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ان سب کا مشترکہ مقصد بچوں کی بہترین تربیت ہے' کسی بات کو وقار کا مسئلہ بنانا دانشمندی کے خلاف ہے' انہیں چاہئے کہ تمام مسائل کو باہمی افہام و تفہیم اور رواداری سے کام لے کر حل کیا جائے۔

اکثر صدر معلم تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں چنانچہ وہ دوسروں کی رائے پر عمل کرنا اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانا کسر شان سمجھتے ہیں' یہ رویہ نہایت نقصان دہ ہے۔صدر معلم کے لئے اچھا طرز عمل یہ ہے کہ وہ نہ صرف اساتذہ کو اعتماد میں لے کر انہیں مدرسے کی تمام ذمہ داریوں میں شریک کرے بلکہ وہ تمام تعلیمی سرگرمیوں میں طلباء کا بھی تعاون حاصل کرے۔یہ تعاون جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ رضا و رغبت سے حاصل کیا جائے' دھمکیوں سے کام نہ لیا جائے کیونکہ یہ اچھے نظم و نسق کی دلیل نہیں۔ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ خوف یا ڈر شخصیت کا قاتل ہے' اس سے ذہن ماؤف اور کارکردگی مفلوج ہو جاتی ہے۔صدر معلم کو اساتذہ کے لئے اور اساتذہ کو طلباء کے لئے مشفق رہنما بننا چاہئے۔

## ⑤ سادگی اور خوش سلیقگی

سادگی اور خوش سلیقگی سے مراد یہ ہے کہ مدرسے کے قواعد و ضوابط کو غیر ضروری طور پر پیچیدہ' طویل اور ناگوار نہ بنایا جائے۔ہر کام میں سادہ طریق کار استعمال کیا جائے تاکہ الجھنیں پیدا نہ ہوں اور تمام کام سلیقہ مندی سے طے پائیں۔ایسے ضوابط سے پرہیز کیا جائے جن سے کوئی مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اور جو محض خانہ پری کے لئے ہوں یہ خواہ مخواہ بار خاطر اور آزردگی کا باعث بنیں گے۔ان پر عمل کے لئے بے جا

اصرار نہ کیا جائے۔ نظم ونسق کی جزئیات پر نظر رکھی جائے، لیکن غیر ضروری تفاصیل سے پرہیز کیا جائے۔ جملہ فعالیتوں میں مکمل ہم آہنگی پیدا کی جائے، کوئی بھی چیز بے موقع اور بے جوڑ معلوم نہ ہو ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ نظم ونسق کی بنیاد محنت پر رکھی جائے اس میں سستی اور کاہلی کے لئے کوئی جگہ نہ ہو تاہم اساتذہ اور طلباء کی قوت کارکردگی کا لحاظ ضرور رکھا جائے۔ اچھے نظم ونسق کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ نازک مواقع کے لئے پیش بندی کر لی جائے۔

خوش سلیقگی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تمام پروگراموں کے لئے مؤثر منصوبہ بندی کا اہتمام کیا جائے تاکہ کام منظم طور پر انجام پائیں۔ فیصلے ٹھوس اور واضح ہونے چاہئیں، ان میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔

## ⑥ ذمہ داری اور اختیار:

نظم ونسق کا ایک عمدہ اصول یہ ہے کہ جس کارکن یا استاد کو کوئی ذمہ داری سونپی جائے اسے پورا کرنے کا مکمل اختیار بھی دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اکیلا صدر معلم مدرسے کی تمام فعالیتیں خود انجام نہیں دے سکتا، اسے تفویض کار کرنا پڑتی ہے۔ مثلاً اسے کئی کام سیکنڈ ماسٹر یا اساتذہ کو منتقل کرنے پڑتے ہیں۔ تقسیم کار کرتے وقت صدر معلم کو چاہئے کہ وہ جسے کام کرنے کے لئے کہے اسے اس کے لئے مناسب اتھارٹی بھی دے تاکہ وہ اسے آزادانہ غور وفکر کے ذریعے موزوں لائحہ عمل کے مطابق انجام دے سکے، اس کی راہ میں خواہ مخواہ رکاوٹیں کھڑی نہ کی جائیں۔ صدر معلم ضرورت پڑنے پر اس کی رہنمائی ضرور کرے، لیکن عدم اعتماد اور بے جا مداخلت سے اس کی حوصلہ شکنی نہ کرے۔ اسی اصول کے مطابق اگر کسی فعالیت کی تنظیم طلباء کے سپرد کی جائے مثلاً بزم ادب کا انعقاد، سوشل سروس کا انتظام یا زرعی پلاٹ کی درستی تو ان پر مکمل اعتماد کیا جائے اور انہیں اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر ان کی منصوبہ بندی اور انتظام کرنے دیا جائے۔

اس اصول کے تحت ہر شخص کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اسے کیا ذمہ داری سونپی گئی ہے اور وہ کس کے سامنے جوابدہ ہے؟ تقسیم کار کرتے وقت یہ دیکھ لیا جائے کہ ایک شخص کو ایک نوعیت کے کام دیئے گئے ہیں جو باہم متضاد تو نہیں ورنہ مدرسے کی سرگرمیوں میں ہم آہنگی اور اشتراک ممکن نہ ہوگا۔ ذمہ داری سپرد کرتے وقت کارکنوں کی اہلیت واستعداد اور دلچسپی کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

⑦ پیشہ وارانہ نشوونما:

اچھے نظم ونسق کا تقاضا ہے کہ مدرسے میں ایسا ماحول قائم کیا جائے جس میں اساتذہ بغیر کسی رکاوٹ کے شوق، لگن اور مبلغانہ جوش وخروش کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے سکیں، وہ ذہنی طور پر زیادہ بیدار ہوسکیں اور ان پر نظر کی گہرائی اور فکر کی بلندی پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے ان کو تمام سہولتیں میسر ہوں۔ علمی استعداد بڑھانے اور پیشہ وارانہ مہارت میں کمال حاصل کرنے کے لئے تمام جذبات، نظریات اور تعلیمی تحریکوں سے متعارف ہونے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ انہیں جدید ترین طریقہ ہائے تدریس سے واقفیت دلانے کے لئے تعلیمی کانفرنسوں اور تجدیدی کورسوں کا اہتمام بھی ضروری ہوگا۔ اساتذہ کو تعلیمی میدان میں نئے تجربات کرنے کی طرف رغبت دلائی جائے۔ بدقسمتی ہے ہمارے ہاں عموماً ان مواقع سے بھی بہت کم فائدہ اٹھایا جاتا ہے جو مدرسے میں آسانی سے حاصل ہوسکتے ہیں مثلاً شعبہ جاتی اجلاس جن میں شریک ہوکر اساتذہ مختلف شعبوں کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتے، اپنے تجربات سے دوسروں کو مستفید کرتے اور کاموں میں ربط وہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اب محض رسمی کارروائی بن کر رہ گئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدرسے کے نظم ونسق کی روح اور کارکردگی ایسی ہو کہ اس سے عملے کی پیشہ وارانہ نشوونما میں مدد ملے۔ اس کا انحصار بہت حد تک صدر معلم کی قائدانہ صلاحیتوں پر ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اساتذہ کی اس بات میں حوصلہ افزائی کرے کہ وہ مدرسے کی زندگی کے مختلف

پہلوؤں کا مطالعہ کریں۔ نیز وہ مذکورہ بالا سہولتوں کی فراہمی کا اہتمام کردے تاکہ ان کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی تربیت ہو۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اچھا نظم ونسق وہی ہے جس میں اساتذہ کو اپنی روزمرہ تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ مہارت کے مواقع بھی ملیں ناتجربہ کار اساتذہ کی مدد کی جائے اور تمام لوگوں کو اپنی استعداد اور کارکردگی کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔

## ⑧ معاشرے کے ساتھ قریبی تعلق:

کوئی تعلیمی ادارہ اس وقت تک اعلیٰ کارکردگی نہیں دکھا سکتا جب تک اسے معاشرے کا قریبی تعاون حاصل نہ ہو۔ اپنے تعلیمی اور عام قسم کے مسائل کے حل میں اسے معاشرے سے رہنمائی اور مدد لینی چاہئے یہ طلبہ کی غیر حاضری یا نظم وضبط کا مسئلہ ہو یا پڑھائی میں ان کی عدم دلچسپی' اساتذہ اور والدین کا باہمی تعاون اچھے نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ اسی طرح ساز وسامان یا طلباء کیلئے گنجائش کی کمی وغیرہ قسم کے مسائل معاشرے کی مدد سے خوش اسلوبی سے حل ہو سکتے ہیں۔ مدرسے اور معاشرے میں قریبی ربط وضبط کی بدولت مدرسے کو معاشرے کی ضروریات اور خواہشات کا علم ہوتا رہتا ہے اور وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو ان کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ نیز معاشرے کے عالم فاضل افراد سے مدرسے کے معاملات میں رہنمائی لی جا سکتی ہے۔

## ⑨ اصول اصلاح وترمیم:

اس سے مراد یہ ہے کہ مدرسے کے منتظمین بدلے ہوئے حالات نئی تحقیقات اور نظریات کے تقاضوں کے مطابق نظم ونسق میں موزوں ترمیم کرتے رہیں۔ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نظم ونسق کا جو ڈھانچہ ایک بار قائم کیا گیا ہے وہ اتنا اعلیٰ وارفع ہے کہ اب اس میں کسی اصلاح وترمیم یا اضافے کی ضرورت نہیں۔ تعلیم میں نئے نئے خیالات

راہ پاتے اور مسائل جنم لیتے رہتے ہیں۔ اگر نظم و نسق جاندار اور بے لچک ہوگا تو وہ نئے زمانے کے تقاضے کو پورا نہیں کر سکے گا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں غیر مؤثر ہو کر رہ جائیں گی۔ تبدیلی و اصلاح کا عمل کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ مدرسے کا نظم و نسق اتنا لچک دار ہو کہ وہ معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ قوانین اور ضابطوں کو حرف آخر نہیں سمجھ لینا چاہئے بلکہ موقع محل اور ضروریات کے مطابق اس میں مناسب ترمیمات کر لینی چاہئیں تاہم کوئی بھی تبدیلی محض برائے نام تبدیلی وہی اچھی ہے جو کام کو سادہ، آسان اور ہموار بنا دے۔

اسی اصول کے تحت مدرسے کی عمارت کا نقشہ اور تعمیر ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں بوقت ضرورت آسانی سے توسیع ممکن ہو اگر عمارت مستطیل طرز کی ہے تو اس کی بنیادیں اتنی مضبوط بنائی جائیں کہ اوپر ایک یا دو منزلیں تعمیر کی جا سکیں۔ بہتر ہے کہ عمارت E یا H شکل کی بنائی جائے کیونکہ اس میں توسیع کرنے سے اصل منصوبہ قائم رہتا ہے۔

**⑩ جائزہ:**

مدرسے کے مختلف پروگراموں اور پالیسیوں میں اتنی لچک ہونی چاہئے کہ ان سے نظم و نسق میں سہولت ہو نظم و نسق میں جائزے کی گنجائش ضرور رکھی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ منتظمین اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔ جائزہ صرف پروگرام کے آخر میں ہی نہیں، بلکہ ہر قدم پر لیا جائے تاکہ خامیاں اور نقائص دور ہوتے رہیں۔

# اساتذہ اور امتحان کی تیاری

اس سے قبل مختلف لحاظ سے امتحان کی اقسام کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے اندازہ ہوگا کہ امتحان بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ ماہرین حسب موقع ان فوائد سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں امتحان کی جو اقسام عمدگی کے لحاظ سے بیان کی گئی ہیں یعنی (۱) معیاری امتحان اور (۲) استاد ساختہ امتحان۔ انہیں اسکول کی تدریسی وتعلیمی دنیا میں خاص طور سے اہمیت دی جاتی ہے' کیونکہ ان کی مدد سے مندرجہ ذیل فوائد کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔

① امتحانات کے ذریعہ اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ طلبہ نے اسکول میں پڑھائے جانے والے مختلف مضامین میں کس قدر لیاقت ومہارت حاصل کی ہے؟

② ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اساتذہ نے کس دلچسپی اور مستعدی سے اپنے تدریسی فرائض انجام دیئے ہیں انہیں اپنے متعلقہ مضمون سے کس حد تک دلچسپی ہے اور انہوں نے نصاب کی تکمیل کس قدر کرائی ہے؟

③ طلبہ کے بارے میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کی رغبت رکھتے ہیں وہ تعلیم کے کس شعبہ میں کامیاب رہیں گے اور عملی دنیا میں کس پیشہ سے متعلق ہونا ان کے لئے مفید ہوگا وہ اعلیٰ تعلیم کے اہل ہیں یا نہیں۔

④ امتحانات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی جماعت یا گروہ میں کون سا طالب علم سب سے اچھا ہے اور کون سا طالب علم سب سے کمزور جا رہا ہے؟ اچھے طالب علم کی ہمت افزائی اور رہنمائی کر کے اسے کس طرح مزید کامیابیوں سے ہم کنار کیا جا سکتا ہے اور کمزور طالب علم کے لئے کیا اصلاحی تدابیر کی جائیں کہ وہ

مناسب سطح تک زیور تعلیم سے آراستہ ہو سکے؟

۵ طلبہ میں صلاحیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' وہ تعلیم میں دلچسپی لیتے اور محنت کرتے ہیں نیز یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں سے زائد نمبرات حاصل کریں اس سے تعلیمی معیار پر اچھا اثر پڑتا ہے اور طلبہ کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۶ اساتذہ اور طلبہ دونوں میں فرائض کی ادائیگی کا احساس پیدا ہوتا ہے وہ بہترین کارکردگی کے جذبہ سے سرشار ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے' اس کا امتحان ہوگا' اس سے جدوجہد کا جذبہ فروغ پاتا ہے جو ایک مستحسن جذبہ ہے۔

۷ امتحانات سے طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی کی کمزوریوں کی نشان دہی ہوتی ہے انہیں اپنے آپ کو سنبھالنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس طور پر ان کی بہترین رہنمائی ہوتی ہے۔

۸ امتحانات سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قومی سطح پر تعلیم کا جو مقصد متعین کیا گیا تھا اس کا حصول کس حد تک ممکن ہو سکا ہے' نیز تعلیم کا جو معیار پیش نظر تھا وہ پوری طرح قائم ہو سکا یا نہیں؟

امتحانات کی مدد سے مندرجہ بالا فوائد اسی وقت حاصل کئے جا سکتے ہیں جب کہ ان کی تیاری مناسب طور پر کی جائے جہاں تک معیاری امتحانکا تعلق ہے' اسے باقاعدہ طور پر کسی ادارہ کے زیرنگرانی تیار کیا جاتا ہے مثلاً تعلیمی بورڈ' یونیورسٹی یا اس طرح کا کوئی اور ادارہ' اس طرح کا امتحان وسیع پیمانہ پر مرتب کیا جاتا ہے' وہ کسی خاص عمر اور خاص جماعت کے طلبہ کے لئے ہوتا ہے اور اسے کسی خاص ملک یا علاقے کے تمام تعلیمی اداروں میں وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے اس طرح کا رسمی امتحان کسی ایک سکول میں بھی مرتب کیا جا سکتا ہے جو کسی خاص عمر اور کسی خاص جماعت کے تمام طلبہ کے لئے ہو' اسکول کے محض ایک یا دو سیکشن تک محدود نہ ہو۔ اس

طرح کے امتحانات کو مقررہ اصولوں کے تحت مرتب کیا جاتا ہے اور پھر ضابطہ کے تحت بہت سارے طلبہ یا معمولوں پر ان کا استعمال کر کے ان کو معیاری بنایا جاتا ہے ان کے باقاعدہ طور پر معیار تیار کئے جاتے ہیں اور اس بات کا تعین کر دیا جاتا ہے کہ اس امتحان کا نتیجہ اس طرح آئے گا خواہ اسے کہیں بھی اور کسی بھی وقت استعمال کیا جائے اس طور پر معیاری امتحان وسیع پیمانہ پر استعمال کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس کی مدد سے پورے ملک یا علاقے یا سکول کے معیار تعلیم کو برقرار رکھا جاتا ہے معیاری امتحان کی تیاری کے مختلف مراحل کا ذکر ہم آئندہ چل کر کریں گے۔

## استاد ساختہ امتحان:

غیر معیاری امتحان کو استاد ساختہ یا غیر رسمی بھی کہتے ہیں اس طرح کا امتحان کسی اسکول کی کسی خاص جماعت اور جماعت کے سیکشن کے طلبہ کی تعلیمی کیفیت کا جائزہ لینے کے لئے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس امتحان کو جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے عموماً کوئی استاد جماعت مرتب کرتا ہے اور کسی وقت بھی طلبہ سے اس کا جواب دینے کے لئے کہہ سکتا ہے، کبھی تدریس کے دوران طلبہ کو چند سوالات دے دیئے اور کبھی ہفتہ کے اختتام پر اور یہ کہا کہ ان سوالات کے جوابات تحریر کرو۔ اس طرح کے امتحانات محدود پیمانہ پر استعمال کئے جاتے ہیں، کبھی یہ کسی جماعت کے محض ایک سیکشن تک محدود ہوتے ہیں اور کبھی چند سیکشن تک۔

غیر رسمی یا استاد ساختہ امتحانات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان کی مدد سے استاد جماعت کو طلبہ کی تعلیمی ترقی اور محنت و دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی اسے مختلف طریقہ ہائے تدریس کے مؤثر اور غیر مؤثر ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے، اسے یہ طے کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ کن کن تدابیر کو بروئے کار لا کر اپنے معلّمی کے فرائض بطریق احسن انجام دے سکتا ہے اور طلبہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ

پہنچا سکتا ہے۔

## استادساختہ امتحان کی تیاری:

غیر رسمی امتحان کی اسی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ استاد جماعت کو امتحان مرتب کرنے کے اصولوں سے واقف ہونا چاہئے اس کے تین اسباب ہیں۔

① استاد کمرۂ جماعت میں زیادہ تر غیر رسمی امتحان استعمال کرتا ہے اگر وہ اس کے مرتب کرنے کے اصولوں سے واقف ہو تو آسانی کے ساتھ اچھے امتحانات مرتب کرسکتا ہے۔

② اگر استاد امتحان مرتب کرنے کے اصولوں سے واقف نہ ہو تو وہ معروضی اور موضوعی دونوں قسم کے امتحانات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا کیونکہ امتحان سے بہتر نتائج اسی وقت برآمد ہو سکتے ہیں جب کہ استاد انہیں موزوں طریق پر استعمال کرسکتا ہو۔ اس کے علاوہ اس بات کا امکان ہے کہ غیر تربیت یافتہ اور ناواقف استاد اپنی لاعلمی کے باعث ایسے معروضی امتحانات مرتب کرے جو موضوعی امتحان سے بھی کم معتبری کے حائل ہوں۔

③ اگر استاد امتحان مرتب کرنے میں مہارت رکھتا ہو تو وہ ایسے غیر رسمی امتحانات مرتب کرسکتا ہے جو معیاری اور رسمی امتحانات کی طرح معتبری اور جواز کے حامل ہوں۔ جن مقامات کے اسکولوں میں معمول کے مطابق تعلیم دی جارہی ہو اور جہاں کے اسکولوں کا نصاب تعلیم ایک دوسرے سے مختلف ہو وہاں استاد ساختہ امتحان اسکول اور جماعت کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوگا۔

مندرجہ بالا بیان سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ استاد کے لئے غیر رسمی امتحان مرتب کرنے کے اصولوں سے واقف ہونا ضروری ہے یہ وہیں غیر رسمی امتحان

کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان اصولوں پر غور کریں' جو غیر رسمی امتحان مرتب کرتے وقت استاد جماعت کے پیش نظر رہنے چاہئیں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اصول بڑے اہم ہیں۔

① امتحان کی منصوبہ بندی۔
② امتحان کی تیاری۔
③ امتحان کی جانچ۔
④ امتحان کی تشخیص قدر۔

## امتحان کی منصوبہ بندی:

استاد کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اطمینان بخش امتحان مرتب کرے ایسا کرنے کے لئے اسے سکون و اطمینان کے ساتھ کافی غور و فکر کرنے اور کوشش و محنت سے کام کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک استاد اس طرح کام نہ کرے گا ایک عمدہ اور قابل اطمینان امتحان مرتب نہیں کیا جا سکتا اس سلسلے میں بہتر یہ ہے کہ کئی اساتذہ باہم مل کر مشورہ اور غور و فکر کے بعد امتحان مرتب کریں' اس طرح سے جو امتحان مرتب کیا جائے گا' وہ زیادہ بہتر اور جامع ہوگا۔

عمدہ اور کامیاب امتحان اسی وقت مرتب کیا جا سکتا ہے جب کہ پہلے سے توجہ اور احتیاط کے ساتھ اس کی منصوبہ بندی کی جائے' ان مقاصد کا تعین کیا جائے جن کے حصول کے لئے امتحان مرتب کیا جا رہا ہے' ان اغراض کا لحاظ رکھا جائے جن کی نشان دہی نمبروں کی مدد سے کرنا چاہتے ہوں' ان حالات کا خیال رکھا جائے جن میں امتحان کو استعمال کرنا ہے اس طرح سے امتحان کی منصوبہ بندی میں مندرجہ ذیل چار اصولوں کی پیروی کرنا ضروری ہے۔

## تدریس کے نتائج کا جائزہ:

اس بات کا جائزہ لینے کے لئے کہ تدریس کس حد تک مؤثر ہوتی ہے اور طلبہ نے اس سے کس حد تک استفادہ کیا ہے' سوالات کی نوعیت کا تعین کیا جائے بالفاظ دیگر یہ بات طے کر لی جائے کہ سوالات کس طرح سے پوچھے جائیں تا کہ یہ جائزہ لیا جاسکے کہ طلبہ نے تدریس سے کس حد تک استفادہ کیا ہے؟

## نصاب کے اہم حصوں کی تکمیل کا جائزہ:

مقامی وقومی مقاصد کے تحت نصاب کے جس حصہ پر زور دیا گیا ہو اور یہ بتایا گیا ہو کہ نصاب کے اس مخصوص حصہ کی تدریس ذرا واضح اور مؤثر طور پر کی جائے گی' نصاب کے اس اہم حصہ کا تعین کیا جائے اور پھر امتحان مرتب کرتے وقت اس حصہ پر مناسب تعداد میں سوالات پوچھے جائیں اور اُسے مناسب اہمیت دی جائے۔

## مقاصد کی عکاسی:

امتحان میں سوالات اس طرح سے مرتب کئے جائیں کہ ان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اس کے ذریعہ کس طرح کے مقاصد حاصل کرنے ہیں اور طلبہ کی کس طرح کی قابلیت کی جانچ مقصود ہے؟

## حالات کی عکاسی:

امتحان اس طرح سے مرتب کیا جائے کہ اس کی نوعیت سے اس بات کی عکاسی ہو کہ اسے کن حالات میں استعمال کیا جاسکتا ہے؟

## تدریس کے نتائج کا جائزہ:

استاد کو اسکول کے مقاصد اور جس مضمون کا امتحان مرتب کیا جارہا ہے' اس کے نصاب سے واقف ہونا چاہئے کسی بھی مضمون کا نصاب مرتب کرتے وقت ابتدا میں

اس کے تدریسی مقاصد بیان کر دیئے جاتے ہیں تدریس کے مؤثر و غیر مؤثر ہونے کا جائزہ لینے کے لئے ان مقاصد کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان مقاصد کے تحت جو تعلیم دی جائے گی طلبہ پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ انہی مقاصد کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو تعلیم و تدریس کے نقطۂ نگاہ سے موزوں ہوں اور جن کی بنیاد پر تعلیمی و تدریسی ترقی کا جائزہ لیا جا سکتا ہو غیر ضروری اور عام طور پر بیان کئے جانے والے مقاصد کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔

جب استاد کو تدریس کے تمام مقاصد کا واضح طور پر اور بخوبی علم ہو گا تو وہ امتحان مرتب کرتے وقت ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے' اسے اس بات پر غور و فکر کرنے میں آسانی ہو گی کہ طلبہ نے کس مقصد کو کس قدر کامیابی کے ساتھ حاصل کر لیا ہو گا اور اس کامیابی کا جائزہ لینے کے لئے مناسب اور موزوں طریقۂ کار کیا ہے؟ اس کے ساتھ ہی معلم کو اس بات کا اندازہ کرنے میں بھی آسانی ہو جائے گی کہ اس نے جو کچھ پڑھایا ہے اور تدریسی مقاصد کے حصول کی جو کوشش کی ہے' طلبہ نے اس سے کس قدر استفادہ کیا ہے؟ نیز اس نے جو طریقۂ تدریس اختیار کیا ہے' وہ کس حد تک مؤثر اور کامیاب رہا ہے؟ اگر اسے توقع کے مطابق کامیابی نہیں ہوئی ہے تو طریقۂ تدریس میں کس طرح اصلاح اور تبدیلی کر کے متوقع کامیابی سے ہم کنار ہوا جا سکتا ہے؟

ماہرین تعلیم نے تدریس کے نتائج کا بہتر طور پر جائزہ لینے کے لئے اپنے اپنے انداز میں تدریسی مقاصد کی درجہ بندی کی ہے۔ مسٹر ایل ای راتھ نے تدریسی مقاصد کو آٹھ بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے مسٹر ای آر اسمتھ نے ان تدریسی مقاصد کو دس بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ مسٹر بلوم اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے تدریسی مقاصد کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے جب ہم اس تمام تقسیم پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر بلوم کی تین تقسیموں میں سے کسی نہ کسی ایک تقسیم کی ذیل میں

آ جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ نصاب سازی کے وقت مقاصد کے تعین کے سلسلہ میں بلوم کے مقرر کردہ تین شعبوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور انہیں کو بنیاد بنا کر نصاب کے مقاصد کو بیان کیا جاتا ہے۔

مسٹر بلوم کے مقرر کردہ تین شعبوں کی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کسی قدر وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے وہ تین شعبے یہ ہیں:

① شعبہ علم

② شعبہ جذبات

③ شعبہ حرکت جسمانی

شعبہ علم:

اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ کو جو نصاب پڑھایا گیا ہے، انہوں نے اس سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، کیا کچھ سیکھا ہے، انہیں کن کن باتوں کا علم ہوا ہے، ان کی ذہنی اہلیت نے کس حد تک ترقی کی ہے؟ غرض اس شعبہ میں طلبہ کی قابلیت اور اہلیت وغیرہ شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو امتحانات مرتب کیے جاتے ہیں، ان میں اس شعبہ کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے امتحان میں طلبہ کی علمی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کا جائزہ لینے کے لئے سوالات مرتب کیے جاتے ہیں طلبہ کے جواب پر غور کر کے ان کی علمی قابلیت کا تعین کیا جاتا ہے اور تجربات کی روشنی میں نصاب میں مناسب ردوبدل کیا جاتا ہے اور اسے طلبہ کے لئے بہتر و مفید بنانے کی کوشش کی جاتی ہے غرض شعبہ علم میں از بر کردہ بات کا اعادہ، اشیاء کو پہچاننا اور ذہنی اہلیت سے تعلق رکھنے والی باتیں شامل ہیں یہ شعبہ امتحان میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔

مشہور ماہر نفسیات مسٹر بلوم نے شعبہ علم میں چھ باتوں کی وضاحت کی ہے، جو یہ ہیں:

① لیاقت۔

② تفصیل۔

اطلاق:

میں یہ بات شامل ہے کہ تجریدی اور مقرون باتوں کو جو محض خیالی اور تصوراتی ہوتی ہیں' کوئی طالب علم مادی طور پر اور خصوصی طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت کس حد تک رکھتا ہے؟ مثلاً شہری آزادی اور شہری حقوق کے اصولوں کو موجودہ حالات سے متعلق کرنے کی کس قدر صلاحیت ہے یا کسی قانون یا اصول کو عملی طور پر کس حد تک اپنایا جاسکتا ہے؟

تجزیہ:

کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے مختلف حصوں کی نشان دہی کی جائے اور ان کے باہمی تعلق کو بیان کیا جائے یا کسی تصور و خیال کے مختلف حصے کئے جائیں اور ان کی تشریح کی جائے یا مختلف خیالات کے باہمی تعلق کی وضاحت اس طور پر کی جائے کہ ان کا فرق واضح ہو جائے کہ وہ کسی فریضہ اور حقیقت میں کس حد تک فرق کر سکتا ہے' وہ کسی تاریخی واقعہ کو پڑھ کر کس حد تک یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ لکھنے والے کا نقطہ نظر کیا ہے؟

نظریہ:

میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلباء مختلف باتوں اور مختلف عناصر کو باہم مربوط کر کے کسی ایسے واضح نتیجہ پر پہنچنے کی صلاحیت کس قدر رکھتے ہیں' جو اب تک واضح نہ تھے؟ اس مرحلے میں طلبہ کی اس صلاحیت کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ وہ اپنے خیالات اور بیانات کو بہتر طور پر منظم کر کے لکھنے کی مہارت کس حد تک رکھتے ہیں؟

تشخیص قدر:

میں دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ مختلف لوگوں کے خیالات' تصانیف اور دوسری باتوں

وغیرہ کے بارے میں رائے دینے اوران کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی صلاحیت کس حدتک رکھتے ہیں؟ لوگوں نے کسی بات کے متعلق جو دلائل دیئے ہیں طلبہ میں یہ اندازہ کرنے کی صلاحیت ہو کہ ان میں منطقی طور پر کیا مغالطہ ہے یہ اور اسی طرح کی دوسری باتیں تشخیص قدر میں شامل ہیں۔

## شعبہ جذبات:

شعبہ جذبات میں طلبہ کی دلچسپی' رویہ' پسند و ناپسند اور ماحول سے مطابقت وغیرہ شامل ہیں اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ کس طرح کے افعال کی تحسین وتعریف کرتے ہیں اور حالات سے کس طور پر مطابقت حاصل کرتے ہیں؟ یہ ایسی چیزیں ہیں جو تعلیم کے مقاصد میں باقاعدہ طور پر بیان نہیں کی جاتیں' اس میں معلم کے سابقہ تجربات بھی اثر انداز نہیں ہوتے' بلکہ طلبہ خود ہی اپنے جواب اور تحریر سے ان چیزوں کا اظہار کرتے ہیں۔

## شعبہ حرکت جسمانی:

حرکت جسمانی کے شعبہ میں طلبہ کی صحت' جسمانی حرکت اور کام کرنے کی صلاحیت وغیرہ شامل ہیں اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ مختلف اشیاء کی خرید و فروخت کس طرح کر سکتے ہیں وہ تقریر کس انداز میں کرتے ہیں' ٹائپ کس طرح کر سکتے ہیں اور گھر کے کام کاج میں ان کا کیا انداز ہوتا ہے؟

مندرجہ بالا بیان سے یہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ تعلیمی مقاصد اور امتحانی مدت کی درجہ بندی کے کئی طریقے ہیں۔ طریقے میں خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی چیزیں موجود ہیں آسان تر منصوبہ بالکل عام قسم کا ہوتا ہے یہ منصوبہ جس قدر تفصیلی ہوگا کمرہ جماعت میں تدریسی فرائض انجام دینے والے استاد کے لئے اسی قدر پیچیدہ اور مشکل ہوگا کسی بھی منصوبہ میں خواہ وہ کتنا ہی تفصیلی اور جامع ہو' تمام حالات و

کیفیات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا' البتہ منصوبہ کی تکمیل اور اس کے قابل استعمال ہونے میں مسٹر بلوم کے متذکرہ بالا تین شعبے اور پہلے شعبے کی چھ اقسام کو بڑا دخل ہے۔

## تدریسی اکائی کے لئے امتحان کی منصوبہ بندی:

اگر نصاب کے کسی ایک حصہ کی تدریس کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کا جائزہ لینا مقصود ہو اور استاد کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے نصاب کا جو حصہ پڑھا دیا ہے طلبہ نے اس سے کس حد تک استفادہ کیا ہے تو ایسا کرنے کے لئے استاد جو امتحان مرتب کرے' اس میں دو یا ان سے زائد اساتذہ کا تعاون حاصل کر لیا اور پھر مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن میں رکھ کر امتحانی سوالات مرتب کرے۔

## مقاصد کا تعین اور درجہ بندی:

نصاب کے جس حصہ کی تدریس کی کامیابی و ناکامی کا جائزہ لینا مقصود ہو سب سے پہلے یہ غور کیا جائے کہ اس حصہ کی تدریس کے مقاصد کیا ہیں' اس کی تدریس سے طلبہ میں ذہنی' جسمانی اور جذباتی طور پر کیا تبدیلی رونما ہو سکتی ہے؟

دو یا زائد اساتذہ مقاصد کی درجہ بندی مسٹر بلوم کے مقرر کردہ تین شعبوں میں کریں' پھر شعبہ تعلیم کی مزید درجہ بندی کریں۔ مقاصد کی یہ درجہ بندی وہ اپنے اپنے طور پر علیحدہ علیحدہ کریں' پھر بعد میں وہ اپنی اپنی درجہ بندیوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کریں' اگر ان میں کوئی فرق ہو تو آپس میں گفتگو اور مشورہ کر کے اس کو دور کریں۔

## مقاصد کی ترتیب اور وقت کا تعین:

مقاصد کے تعین اور ان کی درجہ بندی کے بعد اس بات پر غور کیا جائے کہ ہر مقصد کو کس قدر اہمیت حاصل ہے' نیز اس کی قدر و قیمت کیا ہے' ہر مقصد کے حصول کی جانچ کس ترتیب سے کی جائے گی اور اسے کتنا وقت دیا جائے گا؟ جو مقصد جس قدر

نصاب کے کس حصہ کی تدریس پر زیادہ زور دیا گیا ہے' پھر مختلف مسائل کی اہمیت کے لحاظ سے ان کو امتحان میں مناسب وقت دیا جائے زیادہ اہم مسائل پر زیادہ وقت دیا جائے اور کم اہم مسائل پر کم وقت دیا جائے۔ کم اور زیادہ وقت دینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ایک سوال پر زیادہ منٹ اور گھنٹے دیئے جائیں اور دوسرے سوال پر کم بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہم عنوانات پر زیادہ سوالات مرتب کئے جائیں تا کہ ان کا جواب دینے میں زیادہ وقت صرف ہو' اسی طرح کم اہم عنوانات پر کم سوالات مرتب کئے جائیں تا کہ ان کا جواب دینے میں کم وقت صرف ہو۔

## امتحان کی نوعیت سے مقصد کی عکاسی:

امتحان مرتب کرتے وقت امتحان دینے والے طلبہ کی صرف عمر اور تجربہ کی جانچ پر توجہ نہ دی جائے بلکہ اس طرح کے عوامل پر بھی توجہ دی جائے جو امتحان کے منعقد کرنے کے وقت رونما ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ امتحان لینے کے لئے کتنا وقت مل سکتا ہے امتحانی پرچہ کی نقل تیار کرنے کی کتنی سہولت ہے اور امتحان میں کام آنے والی اشیاء کی لاگت کیا ہو گی؟

## امتحان کی تیاری:

امتحان کی منصوبہ بندی اور مقاصد کی درجہ بندی کرنے کے بعد دوسرا اہم قدم اصل امتحان کی تیاری کا ہے یہ بڑا ہی اہم مسئلہ ہے کیونکہ یہ امتحان کا اصل حصہ ہے امتحان کی تیاری کے بقیہ تمام اقدامات اسی حصہ کی بہتر طور پر تیاری کے لئے کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مسٹر جولیان سی اسٹینلے نے چند اہم تجاویز پیش کی جائیں' جن پر عمل پیرا ہو کر امتحان کی تیاری بہتر طور پر کی جا سکتی ہے۔

## امتحان کا ابتدائی مسودہ بعجلت ممکنہ مرتب کیا جائے:

استاد کو چاہئے کہ وہ ہر روز جب اپنے تدریسی فرائض انجام دے تو اس دن کے

سبق سے متعلق سوالات نوٹ کر لے اس طرح ایک مقررہ مدت کے بعد نصاب کے جس قدر حصہ کی تدریس مکمل ہوگی' اس پر سوالات تیار ہو جائیں گے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ نصاب کے اس مکمل شدہ حصے کے متعلق کوئی ایسا اہم نکتہ نہ رہ جائے گا جس پر سوال تیار نہ ہو۔ اگر روزانہ کی تدریس کے بعد ممکنہ سوالات نوٹ نہ کئے گئے تو بہت سی ایسی اہم اور غیر معمولی باتیں نظر انداز ہو جائیں گی جو نصابی کتب میں نہیں پائی جاتیں مگر جن کے بارے میں طلبہ کو معلومات ہونی چاہئیں جب روزانہ کے سبق کے بعد اہم باتوں کے متعلق سوالات نوٹ کئے جائیں تو استاد کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ امتحان کے تکمیلی مسودہ میں ان کو جگہ دے سکے اس طور پر امتحان زیادہ جامع اور مفید ہوگا' اس کی مدد سے طلبہ کی قابلیت وصلاحیت کا اندازہ بہتر طور پر لگایا جا سکے گا۔

## امتحان میں ایک سے زائد قسم کے سوالات ہوں:

امتحان میں اگر ایک ہی طرح کے سوالات ہوں تو طلبہ ان کا جواب دیتے دیتے بالکل اکتا جائیں گے' اگر امتحان طویل ہو تو ان کی اکتاہٹ اور بھی بڑھ جائے گی اس لئے مناسب یہ ہے کہ امتحان میں مختلف قسم کے سوالات شامل کئے جائیں بہتر یہ ہے کہ امتحان میں موضوعی اور معروضی دونوں قسم کے سوالات ساتھ ساتھ شامل کئے جائیں ایسا کیا جا سکتا ہے کہ ایک سوال موضوعی قسم کا ہو' پھر چند سوالات معروضی قسم کے یا امتحان کے ایک حصہ میں چند سوالات موضوع قسم کے ہوں اور دوسرے حصہ میں معروضی قسم کے سوالات شامل کئے جائیں ایسا کرنے سے طلبہ کی امتحان سے دلچسپی قائم رہے گی اور وہ پرچہ سے اکتاہٹ محسوس نہ کریں گے۔

## امتحان کے تقریباً نصف سوالات مشکل ہوں:

سوالات اس طرح مرتب کئے جائیں کہ ان کی نصف تعداد یعنی ۵۰ فیصد کا

جواب طلبہ آسانی سے دے سکیں۔ اس سلسلہ میں یہ خیال رکھا جائے کہ امتحان کے شروع کے دو سوالات اتنے آسان ہوں کہ تقریباً تمام شرکاء امتحان کا جواب آسانی سے دے سکتے ہوں بہت مشکل اور بہت آسان سوالات امتحان سے خارج کر دیئے جائیں یعنی جن سوالات کے جواب ۱۰ فیصد سے کم طلبہ دیں انہیں امتحان سے خارج کر دیا جائے اور جن سوالات کے جواب ۹۰ فیصد سے زائد طلبہ دیں انہیں بھی امتحان سے خارج کر دیا جائے۔

سوال نمبر تین بقیہ سوالات میں سب سے آسان ہو' یہ سوال ایسا ہو کہ امیدواروں میں سے تقریباً ۹۰ فیصد اسے کر سکتے ہوں بقیہ سوالات مشکل کی چڑھتی ہوئی ترتیب میں رکھے جائیں۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سوالات کی دشواری اس طرح کی ہو کہ طلبہ کے درمیان زیادہ سے زیادہ امتیاز ہو جائے' جب کسی گروہ کے طلبہ کو امتحان دیا جائے تو اس گروہ کا اوسط درجہ کا طالب علم اس امتحان کے سوالات کا جواب دے کر تقریباً ۵۰ فیصد نمبر حاصل کر لے۔ اس طور پر ایک ہی امتحان ایک اوسط درجہ کے گروہ کے طلبہ کے لئے مناسب ہوگا جب کہ وہی امتحان ایک کمزور قسم کے گروہ کے طلبہ کے لئے مشکل ہوگا اور ایک قابل قسم کے گروہ کے طلبہ کے لئے آسان ہوگا اس طرح امتحان سے پورے گروہ کے متعلق مجموعی طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اوسط درجہ کا کمزور قسم کا ہے یا قابل قسم کا ہے؟

عام طور پر استاد ساختہ امتحان میں مشکل سوالات کم ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو پاس کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اب جب کہ ہماری نئی تعلیمی پالیسی کے تحت طلبہ کو امتحان میں فیل نہیں کیا جا سکتا' استاد ساختہ امتحان میں مشکل سوالات اور بھی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے' اس کی وجہ سے ذہین اور قابل طلبہ کی شناخت مشکل ہو جائے گی۔

اگر کسی شعبہ میں طلبہ کی لیاقت کی جانچ کی جائے اس کا صرف اندازہ لگانا مقصود ہو مثلاً اگر ان کی حسابی اہلیت یا کلرکی کی اہلیت کا اندازہ لگانے کے لئے رفتار کارکردگی کو دیکھا جائے تو ایسے موقع پر امتحان کے تمام سوالات نہایت آسان ہونے چاہئیں۔

## امتحان کے ابتدائی خاکہ میں مطلوبہ تعداد سے زائد سوالات ہوں:

امتحان کو آخری شکل میں تیار کرنے میں جس قدر سوالات رکھنے ہوں' بہتر ہے کہ اس کے ابتدائی مسودے میں اس سے زائد سوالات شامل کئے جائیں مثلاً اگر امتحان میں بیس سوالات رکھنے ہوں تو ابتدائی مسودہ میں پچیس یا تیس سوالات شامل کئے جائیں تاکہ جب ان سوالات کی جانچ کی جائے تو جو سوالات کمزور معلوم ہوں یا امتحان میں مناسب توازن قائم رکھنے کے لئے ان کی ضرورت محسوس نہ ہو انہیں امتحان سے خارج کیا جا سکے' امتحان کے ہر حصہ کے لئے ابتدائی مسودہ میں مطلوبہ تعداد سے ۲۵ فیصد سے لے کر ۵۰ فیصد تک زائد سوالات مرتب کرنے چاہئیں۔

## امتحان کا تنقیدی جائزہ:

امتحان پر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ناقدانہ نگاہ ڈالنی چاہئے اس بات پر غور کیا جائے کہ نصاب میں شامل شدہ تمام عنوانات کو امتحان میں مناسب اہمیت دی گئی ہے یا نہیں؟ امتحان کے سوالات کو اس کے اصل مسودہ سے مقابلہ کر کے دیکھنا چاہئے اگر امتحان کو احتیاط اور غور سے پڑھا جائے تو اس میں کچھ قابل اعتراض سوالات مل سکتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس مضمون کا امتحان بنایا گیا ہے اسی مضمون کے دوسرے اساتذہ اس امتحان پر تنقید اور تبصرہ کریں کیونکہ امتحان میں کچھ ایسے سوالات ہو سکتے ہیں جن کی اہمیت مشتبہ ہو' کچھ سوالات ایسے ہو سکتے ہیں جن کی عبارت غیر واضح ہو یا جن کے جوابات ایسے آئے ہوں جو سوال پوچھنے والے کی

توقع کے مطابق نہ ہوں' سوالات کے الفاظ اور عبارت کا ناقدانہ طور پر جائزہ لینا چاہئے تاکہ کوئی لفظ یا عبارت مبہم اور ذومعنی نہ ہو' کیونکہ اس کی وجہ سے مختلف جوابات آسکتے ہیں۔

## سوالات کی عبارت سے جواب کا تعین:

سوالات اس طرح مرتب کئے جائیں کہ ان کی عبارت سے یہ واضح ہو جائے کہ کیا کچھ جواب ہونا چاہئے؟ اگر امتحان میں ذومعنی الفاظ یا محاورے استعمال کئے جائیں تو ان سے درست جواب کی طرف راہنمائی نہ ہوگی اس طرح کا خیال خاص طور پر معروضی امتحان میں رکھنا چاہئے اس کے علاوہ نصابی کتاب کے ہو بہو الفاظ سے سوالات مرتب نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ ایسی صورت میں طلبہ بغیر سمجھے ہوئے صرف رٹ کے جواب دیں گے' سوالات کی عبارت میں الفاظ کے ہجے اور قواعد کے ایسے اصول استعمال کئے جائیں جن سے سوالات کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

معروضی امتحان میں آسان الفاظ اور عبارات استعمال ہوتی ہیں' اسی بناء پر طلبہ اسے دوسری قسم کے امتحان پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا جواب دینے میں کم لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے امتحان میں سوالات اس طرح مرتب کئے جائیں کہ ان کے جواب کی مدد سے طلبہ کی پوری لیاقت و اہلیت کا اندازہ ہو جائے' ورنہ نصاب کو نہ پڑھنے والا شخص بھی سطحی قسم کے سوالات کے جواب اپنی عام لیاقت و ذہانت سے کچھ نہ کچھ دے ہی دے گا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سوالات میں مشکل الفاظ اور پیچیدہ ساخت کے جملے استعمال کئے جاتے ہیں کہ طلبہ ان کا جواب جانتے ہوئے بھی یہ سمجھ نہیں پاتے کہ ان کو کیا جواب دینا ہے؟ حالانکہ اگر یہی سوالات آسان الفاظ اور جملوں کی صورت میں پوچھے جاتے تو طلبہ بہت اچھے جواب دیتے طلبہ کی پڑھنے کی صلاحیت اور ان کی عام لیاقت کی جانچ کے لئے تو مشکل الفاظ اور پیچیدہ جملے استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن اگر

کسی مضمون میں ان کی صلاحیت و قابلیت کی جانچ مقصود ہو تو آسان الفاظ اور سیدھی سادی عبارت سے ہی کام لینا چاہئے' اگر ایسا نہ کیا گیا تو امتحان سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہ کئے جاسکیں گے۔

## سوال کے صرف ایک حصہ سے نہیں بلکہ پورے سوال سے جواب کا تعین ہو

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طلباء کسی سوال کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں اور استاد اسی سوال کا مفہوم کچھ اور سمجھتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ سوال کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس کے ایک حصہ سے کوئی مفہوم واضح ہوتا ہے اور پورے سوال سے کوئی اور مفہوم نکلتا ہے' طلبہ سوال کا ایک حصہ پڑھ کر اس کے مفہوم کو لے لیتے ہیں اور سوال کے بقیہ حصے کو نظر انداز کر دیتے ہیں امتحان مرتب کرنے والے استاد کو سوال کی عبارت اس طرح کی بنانی چاہئے کہ طلبہ اس کے ایک حصہ سے ہی کوئی مفہوم اخذ نہ کریں بلکہ پورے سوال کو پڑھ کر ان پر کوئی مفہوم واضح ہو استاد جب کوئی سوال مرتب کرے تو پہلے اس پر خوب غور وخوض کر لے اور یہ اندازہ کر لے کہ طلبہ سوال کے کسی حصہ کو نظر انداز تو نہیں کر سکتے۔

## ایک طرح کے سوالات ایک ساتھ ہوں:

امتحان میں جب معروضی قسم کے سوالات رکھے جاتے ہیں' تو کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تکمیلی جائزہ' غلط صحیح کی جانچ اور کثیر انتخابی قسم کے سوالات بے ترتیب انداز میں یوں ہی رکھ دیئے جاتے ہیں' یہ طریقۂ کار مناسب نہیں' امتحان میں ایک قسم کے سوالات ایک ساتھ رکھنے چاہئیں' اس سے نمبر دینے اور طلبہ کو بھی یہ موقع ملتا ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے ذہن کو کسی خاص قسم کے سوالات کا جواب دینے میں لگائیں اور سوالات کی وہ قسم ختم ہو جائے تو پھر دوسری قسم کی طرف توجہ دیں۔

## سوالات بتدریج مشکلات کی طرف بڑھایئے:

امتحان میں جتنی قسم کے سوالات رکھے جائیں' ان میں یہ خیال رکھا جائے کہ ابتدائی سوالات آسان ہوں اور پھر بتدریج مشکل ہوتے جائیں آسان ترین سوال کو امتحان کے شروع میں اور مُشکل ترین سوال کو امتحان کے آخر میں رکھنا بڑا ہی ضروری ہے' طلبہ پر اس کا بڑا اچھا نفسیاتی اثر ہوتا ہے اگر امتحان کے شروع میں ہی مشکل سوال رکھ دیا جائے تو اس سے طلبہ کی ہمت شکنی ہوگی خاص طور پر اوسط درجہ کے طلبہ اور کمزور طلبہ پر اس کا بڑا برا اثر پڑے گا۔ اگر سب سے آسان سوال امتحان کے شروع میں اور سب سے مشکل سوال آخر میں رکھا جائے تو آسان سوال کو اوسط درجہ کے اور کمزور طلبہ آسانی سے کرلیں گے اور آخر کے مشکل سوال کو صرف وہ طلبہ ہی حل کرسکیں گے جو زیادہ اہل اور ذہین ہوں گے اور حقیقت یہ ہے کہ مشکل سوال رکھنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ صلاحیتوں کے طلبہ کا پتہ چلایا جائے۔

## صحیح جوابات ترتیب سے نہ ہوں:

معروضی امتحان میں ہر سوال کے کئی کئی ممکنہ جوابات دیئے جاتے ہیں' جن میں سے صرف ایک جواب صحیح ہوتا ہے' طلبہ کو صحیح جواب پر نشان لگانا ہوتا ہے' ان ممکنہ جوابات میں صحیح جواب بے ترتیب ہونا چاہئے ورنہ طلبہ محض اندازے سے صحیح جواب کا پتہ لگالیں گے اور سوال پر غور کیے بغیر اس کا جواب دیں گے۔

## طلبہ کے جواب کا تحریری ریکارڈ رکھا جائے:

اس بات کا انتظام کیا جائے کہ طلبہ کے جوابات کا باقاعدہ طور پر تحریری ریکارڈ رکھا جائے' اس طرح کا اندراج چیک لسٹ یا ایک طرح کے شرح بندی کے پیمانے کی صورت میں رکھا جاسکتا ہے اس طرح کے اندراج سے طلبہ کی عادات واطوار اور ان کے کردار کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

## ہدایات مختصر مگر واضح اور جامع ہوں:

امتحان کے انعقاد کے سلسلہ میں جو ہدایات دی جائیں' وہ مختصر ہوں' مگر اس قدر واضح اور جامع ہوں کہ طلبہ کے گروہ کا سب سے کم اہلیت کا طالب علم بھی آسانی سے سمجھ لے کہ اسے کیا کرنا ہے؟ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی کمزوری کے باعث ویسا نہ کر سکے طلبہ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ سوالات پر کہاں اور کس طرح نشان لگانا ہے' اسے ایسا کرنے کے لئے کتنا وقت دیا گیا ہے اور اسے کس حد تک قیاس آرائی کرنی چاہئے؟ تفصیل سے جواب دیتے یا محض نشان لگانے کا انحصار طلبہ کی عمر اور امتحانات میں حصہ لینے کے تجربہ پر ہے مثال کے طور پر بہت کم عمر کے طلبہ سے یہ کہنا بہتر ہے کہ صحیح جواب کے نیچے لکیر کھینچو' اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ''صحیح جواب کو خط کشیدہ کرو'' تو یہ درست نہ ہوگا۔

نچلی جماعتوں میں استاد کو ہدایات بلند آواز سے پڑھنی چاہئیں اور امتحانی پرچہ پر جو ہدایات درج ہوں طلبہ خاموشی سے ان پر عمل کریں جب امتحان غیر مانوس قسم کا یا پیچیدہ ہو تو نمونے کے سوالات دیئے جائیں اور ان کے صحیح جواب پر نشان لگا کر یہ سمجھایا جائے کہ دیئے ہوئے سوالات کے جواب کس طرح دیئے جائیں گے؟ استاد جماعت بعض اوقات اس طرح کی وضاحت تختہ سیاہ پر کر دیتا ہے اور اس بات کا اطمینان کر لیتا ہے کہ طلبہ سمجھ گئے ہیں۔

## امتحان کی جانچ:

جب امتحان منصوبے کے مطابق تیار ہو جائے تو پھر اس کی جانچ کرنی چاہئے اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

① امتحان مجموعی طور پر کس قدر و قیمت کا حامل ہے؟

② ہر سوال کی قدر و قیمت کیا ہے اور انہیں کیونکر بہتر بنایا جا سکتا ہے؟

ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھ کر ہی امتحان کی قدر و قیمت کی جانچ کرنی چاہیئے جانچ کے وقت جو سوالات ناموزوں ثابت ہوں انہیں امتحان سے خارج کر دینا چاہیئے اور جن سوالات میں تغیر و تبدل اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہو' ان میں ایسا کرنا چاہیئے۔

امتحان کی جانچ کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اصول مناسب ہوں گے یہ اصول امتحان کو آخری شکل دینے کے وقت بھی دوسرے اصولوں کے ساتھ کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

## بہتر حالات کا تعین:

اس بات پر غور کیا جائے کہ امتحان کو کن حالات میں منعقد کیا جائے گا' کیونکہ امتحان کے سوالات کے عمدہ جوابات آنے کا انحصار صرف امتحان پر نہیں ہوتا' بلکہ اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ امتحان کو کن حالات میں منعقد کیا گیا ہے عام طور پر اس بات کو اچھا خیال کیا جاتا ہے کہ امتحان کا انعقاد طلبہ کے جانے پہچانے ماحول یعنی کمرۂ جماعت میں کیا جائے جب امتحان کو محض جانچنے اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ لگانے کے لئے منعقد کیا جائے تو طلبہ کو کمرۂ جماعت میں ہی سوالات حل کرنے کو دیئے جائیں' ان کی نگرانی احتیاط سے کی جائے تاکہ نقل اور دھوکہ بازی کا امکان نہ رہے جہاں کہیں نقل اور دھوکہ بازی کا امکان زیادہ ہو' وہاں طلبہ کو اس طرح بٹھایا جائے کہ ہر دوسری نشست خالی ہو اور طلبہ کے درمیان کافی فاصلہ ہو یا اگر طلبہ قریب قریب بیٹھے ہوں تو امتحان کے سوالات کی ترتیب ایک دوسرے سے مختلف ہو یعنی امتحان کی مختلف نقول میں سوالات مختلف ترتیب سے دیئے گئے ہوں۔

## مناسب وقت کا تعین:

امتحان کی جانچ کے بعد طلبہ کو اس کا جواب دینے کے لئے مناسب وقت دینا

ضروری ہے' خواہ بعد میں جب امتحان اپنی آخری شکل میں آ جائے تو اتنا وقت نہ دیا جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ جانچ کے وقت سوالات کی ترتیب کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتی کبھی مشکل سوال پہلے ہوتا ہے اور آسان بعد میں اور اس کے بعد پھر کوئی مشکل سوال ہوتا ہے اس سے طلبہ کو کافی دقت ہوتی ہے اور وہ جواب دینے میں زیادہ وقت لیتے ہیں اگر انہیں کافی وقت نہ دیا جائے تو طلبہ امتحان کے تمام سوالات کے جواب نہ دے سکیں گے' اگر انہیں وقت زیادہ دیا جائے تو وہ تمام سوالات کے جواب دے سکیں گے اور استاد کو امتحان کے ہر سوال کی امتیازی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں آسانی ہوگی جب تمام طلبہ امتحان کے تمام سوالات کا جواب دے کر نمبر حاصل کریں گے تو اس سے ان کی اہلیت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے گا' برخلاف اس کے اگر کم وقت دیا جائے تو کچھ ذہین طلبہ تو تمام سوالات کے جواب دیں گے مگر کمزور اور اوسط درجہ کے طلبہ تمام سوالات کے جواب نہ دے سکیں گے اور اس طور پر طلبہ کی صحیح اہلیت کا اندازہ نہ ہو سکے گا امتحان کی جانچ کے وقت سوالات کا جواب دینے کے لئے زیادہ وقت دینے سے امتحان کا بھی مقصد پورا ہوتا ہے اور طلبہ کی اہلیت اور تجربہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

## جوابات کی یکساں اہمیت:

معروضی امتحان میں نمبر دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر درست جواب کو یکساں اہمیت دی جائے اور ہر جواب کا نمبر برابر ہو۔ معروضی امتحان میں مشکل یا اہم سوالات کے نمبر زیادہ نہیں ہوتے یا آسان سوالات کے نمبر کم نہیں ہوتے بلکہ آسان و مشکل ہر طرح کے سوالات کے درست جواب دینے پر برابر اور یکساں نمبر دیئے جاتے ہیں ایسا ہی کچھ موضوعی قسم کے امتحان میں بھی ہونا چاہئے' جس قدر سوالات کے جوابات طلبہ سے طلب کئے جائیں ان سب کے نمبر مساوی ہوں' خواہ طالب علم آسان سوال کے جواب دے' خواہ مشکل سوال کے' درست جواب دینے پر یکساں

نمبر ملیں۔

امتحان کی جانچ کے وقت طلبہ کو سوالات کے جواب دینے کے لئے جو کہا جاتا ہے تو یہ معمولی قسم کا امتحان ہوتا ہے اس میں یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ تمام سوالات کو یکساں اہمیت دی جائے اس قسم کے امتحان میں اس بات کا لحاظ نہ کیا جائے کہ کس طالب علم نے مشکل سوالات حل کئے ہیں اور کس نے آسان؟ صرف اتنا دیکھا جائے کہ کس طالب علم نے کس قدر سوالات صحیح حل کئے ہیں اور اس بنا پر کتنے نمبر پائے ہیں؟ اسی کم یا زیادہ کا لحاظ کر کے طلبہ کا درجہ مقرر کیا جائے۔

# جوابی کلید اور نمبر دینے کے اصول

طلبہ کے جوابات پر نمبر دینے سے قبل جوابی کلید اور نمبر دینے کے اصول تیار کیے جائیں۔ اس سلسلہ میں استاد اپنی مرضی سے کوئی مناسب طریقۂ کار اپنا سکتا ہے مثلاً وہ یہ کر سکتا ہے کہ امتحان کی ایک غیر استعمال شدہ نقل لے کر اس میں درست جواب لکھے اور پھر طلبہ کے جواب کے ساتھ اس کلید کو رکھ کر ان کے جواب کے صحیح یا غلط ہونے کی جانچ کرے اور نمبر دے، معروضی امتحان میں عام طور پر یہی طریقۂ کار اختیار کیا جاتا ہے کبھی ایسا بھی کیا جاتا ہے کہ صحیح جواب کی کلید الگ سے تیار کی جاتی ہے اور طلبہ کی جوابی بیاض پر اس کا موازنہ کر کے ان کے جواب کے صحیح یا غلط ہونے کی جانچ کی جاتی ہے اور نمبر دیئے جاتے ہیں یہ نمبر عام طور پر صحیح عدد ہوتے ہیں، کسری عدد مثلاً ۱/۲، ۱/۴ یا ۵، ۲۵ وغیرہ سے گریز کیا جاتا ہے۔ موضوعی قسم کے امتحان میں ہر سوال کو کئی کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور پورے سوال کے لئے جس قدر نمبر ہوتے ہیں، ان کو سوال کے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے مثلاً اگر ۲۰ نمبر کے کسی سوال کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تو ہر حصہ کے لئے ان ۲۰ نمبروں میں سے الگ الگ نمبر مقرر کر دیئے جاتے ہیں اس کے علاوہ سوالات کے مثالی جوابات کا ایک دستہ تیار کیا جاتا ہے جس میں اس بات کا تعین کیا جاتا ہے کہ ہر سوال کا جواب کس نوعیت اور کس انداز کا ہونا چاہئے پھر یہ طے کیا جاتا ہے کہ املا، قواعد اور الفاظ کے غلط استعمال پر کس حساب سے نمبر کاٹے جائیں گے، ریاضی کے امتحان میں بھی اسی طرح اصول بنا لیا جاتا ہے کہ آیا بالکل صحیح جواب پر نمبر دیا جائے گا یا صحیح عمل کو ترجیح دی جائے گی خواہ جواب غلط ہو گیا ہو۔

## امتحان کی تشخیص قدر:

طلبہ کی جوابی بیاض پر نمبر دینے کے بعد طلبہ کے جواب کی ماہیت اور خود امتحان کی ماہیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ضروری ہے ایک استاد جماعت کو اگرچہ امتحان کے نتیجہ کی روشنی میں اپنے طلبہ کے حصوں سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے' لیکن اس کو اپنے مرتب کردہ امتحان کی ماہیت سے بھی دلچسپی ہونی چاہئے کیونکہ صرف اچھے امتحان سے ہی مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

امتحان کی تشخیصی قدر کے لئے اسٹینلے نے مندرجہ ذیل پانچ اصول تجویز کئے ہیں:

## امتحان کی موزونیت کا خیال:

سب سے پہلے دیکھا جائے کہ امتحان مجموعی طور پر کس قدر دشوار ہے' شرکائے امتحان کی کس قدر تعداد نے زیادہ نمبر حاصل کئے ہیں حصول کے امتحان میں اگر ۵۰ فی صد طلبہ نے اونچے نمبر حاصل کئے ہوں تو اسے مناسب سمجھا جائے۔ امتحان کے کسی انفرادی سوال کی دشواری کا تعین کرنے میں یہ دیکھا جائے کہ اس کا صحیح جواب کتنے فی صد طلبہ نے دیا ہے؟ وہ سوالات جن کے جوابات محض چند طلبہ نے یا تقریباً تمام طلبہ نے دیئے ہوں' معمولی قدر و قیمت کے ہوتے ہیں ان سے صرف قابل ترین اور کمزور ترین طلبہ میں امتیاز کیا جا سکتا ہے طلبہ کی مہارت اور ان کے تشخیصی جائزے میں سوالات کی دشواری نسبتاً غیر اہم خیال کی جاتی ہے' البتہ امتحان حصول میں اسے اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

## جواب سے کمزور اور ذہین طلبہ میں امتیاز ہو:

امتحان کے انفرادی سوالات ایسے ہونے چاہئیں جو اعلیٰ صلاحیت کے حامل طلبہ اور کم تر صلاحیت کے حامل طلبہ کے درمیان اور ان طلبہ کے درمیان جنہوں نے

امتحان میں مجموعی طور پر اوسط درجہ کی صلاحیت کے بہت سے طریقے ہیں ان میں سب سے سادہ طریقہ غیر رسمی امتحان میں قابل عمل ہے استاد جماعت کے لئے ایک اطمینان بخش طریقہ یہ ہے کہ وہ امتحان کے ہر سوال کا صحیح یا غلط جواب طلبہ سے حاصل کرے اور پھر اچھے نمبر پانے والے طلبہ کی ۲۷ فی صد تعداد اور کم تر نمبر پانے والے طلبہ کی ۲۷ فیصد تعداد کا تعین کر کے ان کا باہم مقابلہ کرے اور شماریاتی طریقوں سے کام لے کر یہ اندازہ کرے کہ دونوں قسم کے طلبہ کے جواب کے درمیان پایا جانے والا فرق اہم ہے یا نہیں وہ سوالات جن کے جواب اعلیٰ صلاحیت والے طلبہ زیادہ تعداد میں دیں گے ان سوالات سے بے حد مختلف ہوں گے جن کے جواب کم تر صلاحیت والے طلبہ دیں گے وہ سوالات جن کے جواب اعلیٰ صلاحیت والے طلبہ کم تر صلاحیت والے طلبہ کے مقابلہ میں کم دیں گے اور وہ سوالات جن کے جواب دینے میں دونوں قسم کی صلاحیت والے طلبہ برابر ہوں۔ اس طرح کے سوالات امتیاز ظاہر کرنے والے نہ ہوں گے۔ وہ سوالات جو منفی امتیاز ظاہر کریں یعنی جن کے جواب' اعلیٰ صلاحیت والے طلبہ کے مقابلہ میں کم تر صلاحیت والے طلبہ نے زیادہ صحیح دیا ہو۔ یا صفر امتیاز والے سوالات یعنی جن کے جواب دونوں صلاحیت والے طلبہ نے برابر تعداد میں دیا ہو ایسے سوالات پر یا تو نظر ثانی کر کے ان کو موزوں اور بہتر بنایا جائے یا انہیں امتحان سے خارج کر دیا جائے۔

## شرکائے امتحان کا تبصرہ:

پہلے سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ طلبہ امتحان کے سوالات کا جواب دینے میں کیا طریقہ اختیار کریں گے اس لئے بہتر ہے کہ جن طلبہ نے امتحان دیا ہے ان سے سوال کر کے مناسب طریقۂ کار کا تعین کیا جائے اس طریقہ پر عمل کرنے سے اکثر و بیشتر ایسی باتوں کا انکشاف ہوگا جو پہلے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں سوالات کے الفاظ میں ذرا سی تبدیلی سے ان خرابیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے' بعض اوقات ایسے

سوالات کوامتحان سے خارج کر دینا ہی مناسب ہوگا۔

## بیرونی کسوٹی پرامتحان کی جانچ:

مختصر امتحانات کے لئے' جن میں چھوٹی اکائیاں ہوں' اس بات کا امکان ہے کہ مشکل اورکم قدر و قیمت کے حامل ہوں لیکن پھر بھی یہ بعض اوقات امتحان میں طلبہ کے درجہ اور امتحان میں شریک ہونے سے پہلے جماعت میں ان کے مقام کا مقابلہ کرنے میں مفید ثابت ہوتے ہیں ایک طویل اور زیادہ اہم امتحان کے جواز کا تعین بہتر طور پر اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ جماعت میں طلبہ کے حاصل کردہ نمبر کا ایک اچھے معیاری امتحان میں ان کے مقام سے مقابلہ کیا جائے جس زمانہ میں یہ معیاری امتحان لیا جائے اسی زمانہ میں جماعت کے امتحان میں طلبہ کے نمبر اور جماعت میں ان کے مقام کا باہمی موازنہ کیا جائے' دونوں امتحانات میں ایک ہی طرح کے سوالات شامل ہوں۔

## امتحان کی اعتباریت کا اندازہ:

امتحان کی اعتباریت کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے' اگر چہ اعتباریت پر معیاری امتحانوں میں زور دیا جاتا ہے' لیکن اگر استاد ساختہ امتحان میں بھی اس کا لحاظ رکھا جائے تو مناسب ہے اگر امتحان کی اعتباریت کم ہوتو اس سے امتحان کی خوبی مشتبہ ہو جائے گی' لیکن اعلیٰ درجہ کی اعتباریت سے امتحان کی قدر و قیمت لازمی طور پر بڑھ نہیں جاتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جواز اور استعمالیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

## معیاری امتحان

معیاری امتحان مرتب کرنے کا طریقۂ کار بڑی حد تک ویسا ہی ہے جیسا کہ استاد ساختہ امتحان کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ اس امتحان کے مرتب کرتے وقت انہیں چار اہم اقدامات کو زیرِ عمل لایا جاتا ہے جو پہلے بیان کئے جا چکے ہیں معیاری

امتحان اصل میں استاد ساختہ امتحان کی ترقی یافتہ اور زیادہ بہتر شکل ہے۔

معیاری امتحان مرتب کرنے کا سلسلہ ۱۸۴۵ء میں شروع ہوا' اس سال مسٹر ہوریس مین نے بوسٹن کے پبلک سکولوں میں طلبہ کے زبانی امتحانات کی جگہ لینے کے لئے ایک ایسا امتحان رائج کرنے کی کوشش کی جسے تمام سکولوں میں یکساں طور پر استعمال کیا جاسکے تاکہ یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو کہ تمام سکولوں میں طلبہ کا تعلیمی معیار کس قسم کا ہے اس کے علاوہ اس امتحان کے رائج کرنے سے ان کی غرض یہ بھی تھی کہ امتحانات میں ممتحن حضرات کی دخل اندازی کا سد باب کیا جا سکے علاقے کے تمام سکولوں کے طلبہ کو ایک ہی قسم کے سوالات دیئے جائیں' ان سوالات کی تعداد زیادہ ہو اور ان میں مختلف قسم کی باتیں پوچھی جائیں تاکہ طلباء اپنی صلاحیت کا اظہار بہتر طور پر کرسکیں' نیز تمام سکولوں میں امتحان یکساں حالت میں منعقد کیا جائے۔ ہوریس مین کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ممتحن کے مزاج اور اس کے نرم و سخت ہونے کا اثر طلبہ کے نمبر پر نہیں پڑے گا اور ان کی اہلیت و قابلیت کا پتہ عمدگی سے لگایا جا سکے گا' اس کے علاوہ پورے علاقے کے طلبہ کے معیار تعلیم کے یکساں ہونے کا بھی اندازہ لگایا جا سکے گا۔

آج کل کے معیاری امتحان کی بنیاد ہوریس مین کے مندرجہ بالا نظریہ پر ہے آج جب کسی امتحان کے ساتھ ''معیاری'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ:

① تمام طلبہ ایک ہی قسم کے سوالات کا جواب دیں گے۔
② ان سوالات کی تعداد زیادہ ہوگی۔
③ تمام طلبہ کو سوالات کا جواب دینے کے لئے یکساں قسم کی ہدایات دی جائیں گی۔
④ تمام طلبہ کو سوالات کا جواب دینے کے لئے یکساں وقت دیا جائے گا۔

⑤ اس امتحان کی مدد سے طلبہ کے مختلف گروہوں کی کارگزاری کا باہم مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

معیاری امتحان سے اس بات کی نشان دہی نہیں ہوتی کہ کسی خاص منزل پر طلبہ کو کیا سکھایا جانا چاہئے یا کیا سکھایا جا سکتا ہے' اس امتحان سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ طلبہ کو کس منزل کی سطح پر پہنچنا چاہئے یا وہ پہنچ سکتے ہیں معیاری امتحان جو کچھ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے طلبہ کی موجودہ کارگزاری کا پتہ چلتا ہے اس میں تمام طلبہ کے لئے یکساں قسم کے سوالات ہوتے ہیں' اس امتحان کو یکساں حالات میں منعقد کیا جاتا ہے یہ امتحان ایک طالب علم کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور تعلیم کی کسی خاص منزل پر پورے سکولوں کے طلبہ پر بھی اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

## معیاری امتحان کی تیاری:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا' معیاری امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں بھی ویسے ہی اقدامات کئے جاتے ہیں جیسے کہ استاد ساختہ امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں کئے جاتے ہیں پھر بھی معیاری امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں جو اقدامات کئے جاتے ہیں وہ استاد ساختہ امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں کئے جانے والے اقدامات سے بڑی حد تک نمایاں ہیں یہ اقدامات مختصراً مندرجہ ذیل ہیں:

## منصوبہ اور تخصیص:

سب سے پہلے امتحان کا منصوبہ بنایا جاتا ہے اور تخصیصی خاکہ مرتب کیا جاتا ہے' جس میں اس بات کا تعین کیا جاتا ہے کہ امتحان کس طرح مرتب کیا جائے گا اور اس کے ذریعے طلبہ کی کس کس طرح کی لیاقت ومہارت کی جانچ کی جائے گی یہ سب کچھ بڑے غور وفکر اور سوچ وبچار کے بعد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ بہت ہی اہم بات ہے اور امتحان کی افادیت کا انحصار بڑی حد تک اسی پر ہے۔

## سوالات کوتحریر کرنا:

دوسرا اہم کام یہ کیا جاتا ہے کہ امتحان کے سوالات تحریر کئے جاتے ہیں اس سلسلہ میں ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جن کا ذکر استاد ساختہ امتحان کے ضمن میں کیا جا چکا ہے ان سوالات پر نظر ثانی کی جاتی ہے' انہیں با قاعدہ اور منظم طور پر تحریر کیا جاتا ہے۔

## امتحان کی جانچ:

جو سوالات تحریر کئے جاتے ہیں' ان کی جانچ کی جاتی ہے جس طرح اور جس عمر کے طلبہ کے لئے امتحان لے کر سوالات کی موزونیت اور افادیت کا اندازہ کیا جاتا ہے' اس سلسلہ میں طلبہ کی آبادی اور ان کے نمونہ کا تعین بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کیا جاتا ہے تا کہ سوالات سے مناسب طور پر مطلب برآری کی جا سکے۔

## تجزیہ مدت:

سوالات کی اہمیت وافادیت کا تعین کیا جاتا ہے' نہایت آسان اور نہایت مشکل سوالات کو امتحان سے خارج کر دیا جاتا ہے' ان کی جگہ موزوں سوالات رکھے جاتے ہیں' اگر مناسب سمجھا جائے تو کچھ سوالات کی عبارت میں ترمیم اور ردو بدل کر دیا جاتا ہے جو سوالات نئے سرے سے شامل کئے جاتے ہیں یا جن کی عبارت میں ترمیم کی جاتی ہے' انہیں دوبارہ آزمایا جاتا ہے اس کے علاوہ سوالات کو مناسب ترتیب سے رکھا جاتا ہے' عموماً آسان ترین سوال پہلے ہوتا ہے اور آخری سوال سب سے مشکل ہوتا ہے جس کا جواب اعلیٰ صلاحیت کا حامل طالب علم ہی دے سکتا ہے سوالات کو مناسب طور پر گروہ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ایک طرح کے سوالات ایک ساتھ ہوتے ہیں ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ طلبہ سوالات کا جواب آسانی سے دے سکیں۔

**طباعت:**

جب امتحان کی آخری شکل کے لئے تمام سوالات تیار ہو جاتے ہیں تو امتحان کو چھپوایا جاتا ہے اور اسے باقاعدہ طور پر کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے۔

**انعقاد:**

ملکی اور قومی سطح پر امتحان کو قابل استعمال بنانے کے لئے مناسب سکولوں کو منتخب کیا جاتا ہے' ان سکولوں کو قومی نمائندہ سکول کی حیثیت دی جاتی ہے ان نمائندہ سکولوں کے طلبہ کے نمونوں پر امتحان کا انعقاد کیا جاتا ہے نمائندہ سکول کے کسی مرحلہ کے طلبہ کا امتحان لیا جاتا ہے اور ان سے سوالات کا جواب حاصل کیا جاتا ہے۔

**نمبر دینا:**

طلبہ کی جوابی بیاض پر نمبر دیئے جاتے ہیں اس طرح جو خاص نمبر حاصل ہوتے ہیں' انہیں باقاعدہ طور پر استعمال کر کے کوئی خاص نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے' اور اسی کی بنیاد پر معیار مرتب کیا جاتا ہے یعنی اس بات کا تعین کر دیا جاتا ہے کہ اس امتحان کی مدد سے طلبہ کی اس طرح کی صلاحیت کی جانچ کی جائے گی اور اس سے اس طرح کا نتیجہ آئے گا۔

**معتبری اور ارتباط:**

طلبہ کے حاصل کردہ نمبر کی مدد سے اضافی معطیات جمع کئے جاتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور امتحان کی معتبری کا تعین کیا جاتا ہے' نیز اسی طرح کے دوسرے امتحانات سے اس امتحان کے ارتباط کا پتہ چلایا جاتا ہے۔

**دستی کتابچہ:**

امتحان منعقد کرنے اور اس سے نتیجہ نکالنے کے طریقوں کی وضاحت کرنے

کے لئے دستی کتابچہ تیار کیا جاتا ہے اس میں اس امر کی وضاحت وصراحت کی جاتی ہے کہ امتحان منعقد کرتے وقت ہدایات کس طرح دی جائیں امتحان کو کن حالات میں استعمال کیا جائے طلبہ کی جوابی بیاض پر کس اصول سے نمبر دیئے جائیں ان نمبروں کو کس طرح کے معیاری نمبروں میں تبدیل کر کے اس سے کس طرح نتیجہ نکالیں وغیرہ؟

معیاری امتحان کو آخری شکل دینے اور ان تمام مراحل سے گزرنے میں کافی محنت' سرمایہ اور وقت صرف ہوتا ہے عموماً امتحان کے لئے منصوبہ بنانے' تجزیہ مدت اور امتحان کی طباعت تک کے مرحلہ میں جب کہ یہ امتحان سکولوں میں استعمال کرنے کے قابل ہوتا ہے ۳ سال سے لے کر ۵ سال تک کا عرصہ لگ جاتا ہے ان صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد جو معیاری امتحان ہمارے سامنے آتا ہے وہ استاد ساختہ امتحان کے مقابلہ میں زیادہ جامع' بہتر اور مفید ہوتا ہے۔

## معیاری امتحان کے دو اہم پہلو:

معیاری امتحان کے دو پہلو ہیں' جن کا اس کی افادیت پر بڑا اثر پڑتا ہے اول یہ کہ اگر امتحان پورے ملک یا علاقے کے بہت سارے سکولوں کے طلبہ کے لئے بنایا جا رہا ہو تو اس علاقے کے تمام سکولوں میں پڑھائے جانے والے مضامین اور ان کے مقاصد کا اچھی طرح جائزہ لے کر ایسے عنوانات اور مقاصد کا نمونہ لیا جائے جو سکولوں میں مشترک ہوں۔ اس سلسلے میں امتحان مرتب کرنے والوں کو سکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب' نصاب تعلیم اور سکولوں کے متعلق ماہرین کی رپورٹوں وغیرہ کا باقاعدہ طور پر جائزہ لینا چاہئے یہ جائزہ جس قدر احتیاط اور توجہ سے لیا جائے گا امتحان اسی قدر بہتر اور مفید ہوگا' دوسرے یہ کہ معیاری امتحان مرتب کرنے میں نسبتاً طویل عرصہ کی ضرورت ہوتی ہے' کیونکہ اس کی تیاری کے سلسلہ میں جو اقدامات کیے جاتے ہیں ان میں تقریباً ۵ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے' اس میں محنت اور خرچ بھی کافی

آتا ہے اس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ایسا نتیجہ حاصل کیا جائے جو سالہا سال تک وسیع مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جا سکے اگر نصاب اور مقاصد تعلیم کا تجزیہ عمدگی اور دور اندیشی سے کیا جائے تو امتحان نصاب کے بدلتے ہوئے رجحان کے ساتھ عرصہ تک دے سکتا ہے اور اُسے کافی عرصہ تک کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے اگر معیاری امتحان کی تیاری محنت اور ہوشیاری سے کی جائے تو اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

## معیاری امتحان کے فوائد:

معیاری امتحان مندرجہ ذیل دو حالتوں میں کافی مفید ثابت ہوتا ہے جو یہ ہیں:

① معیاری امتحان کی مدد سے دو طلبہ کی صلاحیت کے درمیان امتیاز کیا جا سکتا ہے

② جب طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہو اور ان کی صلاحیت کے متعلق فیصلہ کرنے کی ضرورت ہو

لیکن کوئی ایسے معطیات نہ ہوں جن کی مدد سے کوئی فیصلہ کیا جا سکے ایسی صورت میں معیاری امتحان بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

تعلیم میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو طلبہ کی صلاحیتوں کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہو جاتا ہے مثلاً یہ معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے کہ طلبہ نے مختلف مضامین میں کس حد تک دسترس حاصل کی ہے ان کی قابلیت کی سطح کیا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو جماعتوں میں مختلف تدریسی طریقوں سے تعلیم دی جاتی ہے اور خاص عرصہ کے بعد یہ معلوم کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ کون سا تدریسی طریقہ زیادہ مؤثر بہتر اور مفید ثابت ہوا ہے اس طرح طلبہ کی جوابی بیاض پر جماعت کے اساتذہ نے جو نمبر دیئے ہیں ان کی مدد سے طلبہ کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس طرح کی تمام حالتوں میں معیاری امتحان بہت ہی مفید ثابت ہوتا ہے اس کے انعقاد کے بعد طلبہ کے حاصل کردہ نمبروں کی مدد سے ہم ان کی صلاحیتوں کے بارے میں بڑی عمدگی سے اندازہ

لگا سکتے ہیں۔

دوسری قسم کی حالت کو ایک ثانوی سکول کی مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے تعلیمی سال کے شروع میں اس سکول میں مختلف پرائمری سکول کے فارغ التحصیل طلبہ داخلہ کے لئے آتے ہیں اس سکول کے ہیڈ ماسٹر کے پیش نظر یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ ان طلبہ کو کن کن سیکشنوں میں تقسیم کرے اس کے ساتھ ہی اساتذہ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہر طالب علم کی انفرادی صلاحیت کا اندازہ لگائیں تا کہ اسی کی بنیاد پر تدریسی فرائض انجام دے سکیں۔ سکول میں داخلہ کے لئے آنے والے طلبہ کو ان کے سابقہ استادوں نے جو نمبر دیئے ہیں' ان سے کوئی مطلب نکالنا مشکل ہے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی استاد نے سالانہ امتحان میں طلبہ کی کارگزاری کا خیال کر کے نمبر دیا ہو اس نے یہ لحاظ رکھا ہو کہ طالب علم برابر سکول میں حاضر رہا ہے' گھر کا کام باقاعدگی سے کرتا رہا ہے اور اس کا عام رویہ عمدہ رہا ہے غرض مختلف اساتذہ نمبر دینے کے معاملہ میں ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہوتے ہیں یہی حال گریڈ دینے کا ہے اگر کسی استاد نے کسی طالب علم کو A گریڈ دیا ہے تو یہ دوسرے استاد کے C گریڈ کے برابر ہو سکتا ہے۔

اس طرح کی حالتوں میں ایک ایسے پیمانہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی مدد سے طلبہ کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کیا جا سکے اور سابقہ استادوں کے نمبر کو مشترکہ معنی پہنائے جا سکیں معیاری امتحان اسی طرح کا پیمانہ ہوتا ہے' اس کی مدد سے مندرجہ بالا مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں طلبہ کو سیکشنوں میں تقسیم کرنے اور تدریسی سرگرمی کا منصوبہ بناتے وقت کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ معیاری امتحان کے نتیجہ اور سابقہ استاد کے دیئے ہوئے نمبر دونوں کو پیش نظر رکھا جائے۔

## معیاری اور استاد ساختہ امتحانات:

معیاری امتحان تعلیمی حصول کی پیمائش میں کسی نئی اور انوکھی شے کی نمائندگی نہیں کرتا' اس امتحان میں اسی قسم کے سوالات بنائے جاتے ہیں جس طرح کے سوالات

استاد ساختہ امتحان میں مرتب کیے جاتے ہیں معیار امتحان میں طلبہ کی قابلیت و اہلیت کے انہیں شعبوں کی جانچ کی جاتی ہے جن کی جانچ استاد ساختہ امتحان کی مدد سے کی جاتی ہے اپنے نفس مضمون اور مقاصد کے اشتراک کے باوجود دونوں قسم کے امتحانوں میں کافی فرق ہے' چند بڑے بڑے فرق مختصراً درج ذیل ہیں:

## معیاری امتحان:

یہ امتحان پورے ملک کے بہت سارے سکولوں کے مشترکہ نصاب اور مقاصد پر مبنی ہوتا ہے۔

## استاد ساختہ امتحان:

یہ امتحان استاد کی اپنی مخصوص جماعت' یا سکول کے نصاب اور مقاصد پر مبنی ہوتا ہے۔

یہ امتحان لیاقت و مہارت کے وسیع دائرہ پر مشتمل ہوتا ہے ہر لیاقت یا مہارت کی جانچ چند سوالات کی مدد سے کی جاتی ہے۔

یہ امتحان کسی مخصوص عنوان یا مہارت پر مشتمل ہوتا ہے' اس میں سوالات کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے۔

اس امتحان کو ماہرین نظر ثانی کنندگان اور امتحان کے سوالات مرتب کرنے والے پیشہ ور حضرات مرتب کرتے ہیں۔

اس امتحان کو عموماً کوئی ایک استاد مرتب کرتا ہے جسے باہر کی مدد یا تو برائے نام حاصل ہوتی ہے یا بالکل حاصل نہیں ہوتی۔

اس امتحان میں جو سوالات استعمال کیے جاتے ہیں' ان کو پہلے ہی استعمال کر کے ان کی افادیت کا اندازہ لگایا جا چکا ہوتا ہے' ان کا تجزیہ کیا جا چکا ہوتا ہے اور امتحان کا حصہ بنانے سے پہلے ان پر نظر ثانی کی جا چکی ہوتی ہے۔

اس امتحان میں جو سوالات استعمال کئے جاتے ہیں امتحان کا حصہ بنانے سے پہلے انہیں نہ تو استعمال کیا جا چکا ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا تجزیہ کر کے ان پر نظر ثانی کی جا چکی ہوتی ہے۔

یہ امتحان اعلیٰ درجہ کی معتبری رکھتا ہے۔

یہ امتحان برائے نام یا کم درجہ کی معتبری رکھتا ہے۔

اس امتحان میں مختلف گروہوں کے لئے عیار بہم پہنچائے جاتے ہیں اور اس سے وسیع پیمانہ پر پورے ملک کے طلبہ کی کارگزاری کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

اس امتحان سے عموماً کسی ایک جماعت یا ایک سکول کے طلبہ کی کارگزاری کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اسے وسیع پیمانہ پر پورے ملک کے طلبہ کی کارگزاری کا اندازہ لگانے کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

## معیاری اور استاد ساختہ امتحانات کے استعمال کے مواقع:

معیاری اور استاد ساختہ امتحانات کے درمیان اوپر بیان کردہ فرق اور معیاری امتحان کی خصوصی قدر و قیمت کی روشنی میں یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ دونوں قسم کے امتحانات کو کن کن مواقع پر الگ الگ اور کن کن مواقع پر ایک ساتھ استعمال کرنا چاہئے اس سلسلہ میں چند ایک تجاویز درج ذیل ہیں۔

جب امتحان مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو بہتر ہے کہ معیاری امتحان سے کام لیا جائے۔

① کسی فرد یا گروہ کے حصول کا اس کی قابلیت سے مقابلہ کیا جا رہا ہو۔

② کسی فرد یا گروہ کی مختلف مہارتوں یا مضامین میں حصول کی سطح کا مقابلہ کیا جا رہا ہو۔

③ جب مختلف جماعتوں یا سکولوں کے طلبہ کے مابین حصول کا مقابلہ کیا جا رہا ہو۔

④ جب کسی خاص عرصہ کے دوران کسی طالب علم کی نشو و نما کا مطالعہ کیا جا رہا ہو۔

جب امتحان کے نتیجہ کو مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا ہو تو استاد ساختہ امتحان کو استعمال میں لانا چاہئے۔

① جب اس بات کا تعین کرنا ہو کہ طلبہ نے تدریس کی کسی خاص اکائی میں کس قدر عمدگی کے ساتھ مہارت حاصل کی ہے۔

② جب اس بات کا اندازہ کرنا ہوگا کہ طلبہ نے تدریس کے مقامی مقاصد کس حد تک حاصل کر لئے ہیں۔

③ جب جماعت کے طلبہ کو نمبر دینے اور ان کا گریڈ متعین کرنے کے لئے بنیاد فراہم کی جارہی ہو۔

اگر امتحان کے نتیجہ کو مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا ہو تو معیاری اور استاد ساختہ دونوں قسم کے امتحانات استعمال کئے جائیں۔

① جب اس بات کی تشخیص کی جارہی ہو کہ کسی طالب علم میں انفرادی طور پر آموزش کی صلاحیت نہیں ہے۔

② جب طلبہ کو جماعت کے مختلف سیکشنوں میں یا تدریس کے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جارہا ہو۔

③ جب طلبہ کو تعلیم جاری رکھنے یا کسی پیشہ کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں مشورہ دیا جا رہا ہو۔

④ جب طلبہ کو خصوصی تعلیمی پروگرام کے لئے منتخب کیا جارہا ہو۔

مندرجہ بالا بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ معیاری اور استاد ساختہ دونوں قسم کے امتحانات تعلیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں' دونوں کے دائرۂ کار ایک دوسرے سے مختلف ہیں' یہ دونوں ہی امتحان طلبہ کی تشخیص قدر کے پیمانے ہیں' دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں' اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں۔

## ۱۱

# طلباء کی نفسیاتی شخصیت بنانے کے

# چند عمدہ اصول

## باب: ⑪

### الزام تراشی سے گریز کیجئے:

دیانتداری، فروتنی، فرض شناسی، میانہ روی، جرأت مندی، عدل، صبر، محنت و مشقت، سادگی، شرم وحیاء جیسے اوصاف کی معاشرے میں قدر و قیمت تھی، ان اوصاف کے بغیر کامیاب زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا، اب ہم نے کامیابی اور ترقی کے لئے بہت سارے ایسے دوسرے راستے تلاش کر لئے ہیں جو زیادہ سہل اور نتیجہ خیز ہیں، مگر ہوا یہ ہے کہ ''کامیابی'' کی منزلیں طے کرنے کے باوجود ہم ناکام و نامراد ہیں، اس لئے کہ حقیقی خوشی اور اطمینان کے لئے ضروری ہے کہ بنیادی انسانی اوصاف ہمارے کردار کا جزو لازم ہوں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جدید علوم سے کنارہ کشی اختیار کر لیں، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے نتیجے میں جو سہولتیں اور آسائشیں میسر آئی ہیں ان سے منہ موڑ لیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہیں ثانوی حیثیت دی جائے، بنیادی انسانی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے طور طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس کی مثال کھیتی جیسی ہے، آپ جتنے چاہیں کھیتی باڑی کے جدید ذرائع استعمال میں لائیں مگر یہ حقیقت کہ ''جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے'' ہمیشہ اپنی جگہ برقرار رہے گی، یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ جو بوئیں اور گندم کاٹیں۔ اگر آپ کا کردار دیانت اور صداقت پر مبنی نہیں ہے تو قلبی اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ آدمی کو اندر سے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی وقت بھی بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ چنانچہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ ایک اچھا انسان بننے کے کیا تقاضے ہیں؟ بلکہ سانحہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک یہ اوصاف

صرف دوسروں میں دیکھنا چاہتا ہے' اپنے بارے میں ہم نے فرض کرلیا ہے کہ ہمیں فوری طور پر کم از کم اس کی احتیاج نہیں ہے۔ اسے آپ ''خود فراموشی'' سے تعبیر کریں یا نفسیاتی مسئلہ کہیں مگر یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے گھر میں سکون ہو' وہ اولاد کی اچھی سے اچھی تربیت کرے' اس کی بات میں وزن ہو' لوگ اس کی عزت کریں۔ لوگ اس چیز کے حصول کے لئے کوشش بھی کرتے ہیں' مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اس ماحول میں کچھ نہیں کیا جا سکتا' پورا معاشرہ بگڑ چکا ہے' وغیرہ وغیرہ' حالانکہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے بھی فرد سے آغاز ہوگا

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

فرق صرف یہ ہے کہ وہ مثالی فرد خود مجھے ہونا چاہئے' یہ میری ضرورت ہے کہ خوشگوار زندگی بسر کروں' میرے بچے اچھے انسان بنیں اور لوگوں میں مجھے عزت اور وقار حاصل ہو۔ جبکہ ہو یہ رہا ہے کہ میری ساری توقعات اور امیدیں دوسروں سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں کہ لوگ اچھے ہوں گے تو بات بنے گی اور نہیں تو بچے جوان ہو کر بڑا انسان بنیں گے تو مسئلہ حل ہو جائے گا ع

مگر ایں خیال است و محال است و جنوں

## اپنے خیالات میں تبدیلی لائیے!

خیالات کی مثال ایسے نقشوں کی ہے جو کسی جگہ یا مقام کی نشاندہی کرتے ہیں تاہم نقشے خود کوئی جگہ یا محل وقوع نہیں' نقشہ جتنا صحیح ہوگا اتنا آپ کو اس جگہ پر پہنچنا آسان ہوگا لیکن فرض کریں آپ کے پاس جو نقشہ ہے وہ سرے سے اس جگہ کا ہے ہی نہیں جہاں آپ پہنچنا چاہتے ہیں تو آپ کا کیا حال ہوگا' آپ جتنا تیز دوڑیں گے اتنا منزل سے دور ہوتے جائیں گے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کو یہی منظور تھا کیونکہ آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا آپ نے تو سر توڑ کوشش کی تھی لیکن منزل تک پہنچنا

بہر حال آپ کو نصیب نہیں ہو گا الا یہ کہ آپ کو احساس ہو جائے اور آپ وہ نقشہ بدل کر درست نقشہ لیں مگر یہ آسان کام نہیں۔ نقشہ بدلنا اپنے آپ کو بدلنا ہے' گویا اپنے آپ کو بدلنے کے لئے خیالات بدلنے پڑتے ہیں' جس کے لئے کوئی شخص بھی آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔

ہر شخص کے دماغ میں بہت سارے نقشے ہوتے ہیں' یہ نقشے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو چیزوں کی وہ شکل دکھاتے ہیں جو ہوتی ہے اور دوسرے وہ جو ہونی چاہئے یعنی ایک تو وہ نقشے ہوتے ہیں جو چیزیں جیسی ہیں ویسی دکھاتے ہیں جنہیں ہم ''حقائق'' سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو چیزیں جس طرح ہونی چاہئیں ویسی دکھاتے ہیں انہیں ہم ''اقدار'' کہتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ تعلقات کا تمام تر انحصار ہمارے ذہن میں موجود ان نقشوں پر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود شاید ہی کبھی کسی شخص کو زندگی میں ان نقشوں کی درستگی پر شک گزرا ہو گا بلکہ اکثر تو ہم ان کی موجودگی سے بھی واقف نہیں ہوتے' ہمارے ذہنوں میں ایک ہی بات بیٹھی ہوئی ہے کہ جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں وہی حقیقت ہے اور جو چاہ رہے ہیں وہی سچ ہے' انہی مفروضوں کی بنا پر ہم زندگی گزار دیتے ہیں' ان مفروضوں کی تشکیل میں ایک شخص کے ماحول' خاندان' مذہب' سکول' دفتر' پیشہ اور دوست احباب وغیرہ کا خاصہ کردار ہوتا ہے جس سے غیر محسوس طور پر آدمی کا ذہن اور شخصیت ایک خاص رنگ میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ ایک معقول شخص جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور دیکھتا اور محسوس وہی کرتا ہے جو اس کے خیالات ہوتے ہیں۔ یعنی ہمیں دنیا ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے ہم ہیں' نہ کہ جیسی دنیا ہے جب ہم اپنے مشاہدات اور تجربات بیان کر رہے ہوتے ہیں تو دراصل ہم اپنے آپ کو اور اپنے تخیلات اور تصورات کو بیان کر رہے ہوتے ہیں اس لئے جب کوئی شخص ہم سے اختلاف کرتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ ہماری ذات سے اختلاف ہوتا ہے لہٰذا ہم اس شخص کو صحیح نہیں سمجھتے' حالانکہ ہو سکتا ہے

کہ وہ شخص بھی اپنی جگہ ٹھیک ہو لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حقیقت کوئی ہے ہی نہیں، حقیقت ہوتی ہے مگر حقیقت چونکہ خود نہیں بولتی اس لئے ہم اسے جو معنی پہنا دیتے ہیں وہ حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں اپنے بنیادی خیالات، ذہنی نقشوں یا تصورات اور اپنے تجربوں کے اثرات کے بارے میں جتنی زیادہ آگاہی ہوتی ہے اتنا زیادہ ہم اپنے خیالات کی ذمہ داری لینے، انہیں جانچنے، حقیقت کے حوالے سے انہیں پرکھنے، دوسروں کی بات سننے اور ان کے خیالات تک پہنچنے کی کوشش کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ جوں جوں ہمارے تصورات اور نقطۂ نظر میں تبدیلی اور وسعت آتی ہے ہم حقائق کے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

غور فرمائیں! اگر کوئی بھی شخص اپنے خیال سے باہر آنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی تبدیلی، کوئی دریافت، کوئی ایجاد ہوئی ہوتی۔ ایک خیال کی تبدیلی سے سارا منظر ہی بدل جاتا ہے۔ ایک شخص کو آپ اپنا دشمن سمجھ رہے ہوتے ہیں تو اس سے بچ کر رہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسی شخص کے بارے میں آپ کا خیال یہ ہو جائے کہ وہ تو اندر سے آپ کا بہت بڑا خیر خواہ ہے تو آپ فوراً اسے گلے لگانے کے لئے تیار ہو جائیں گے، اتنی بڑی تبدیلی خیال میں تبدیلی کے باعث آئی گویا لوگوں کے آپس کے تعلقات کا خیالات کے ساتھ انتہائی گہرائی تعلق ہے۔

بعض اصول ایسے ہیں جنہیں ہم فطری قوانین یا آفاقی سچائیوں کا نام دیتے ہیں۔ یہ اصول ہمیشہ ایک جیسے رہتے ہیں اور کسی بھی مہذب معاشرے کی جان ہوتے ہیں۔ ہمارے خیالات ان اصولوں کے جتنے قریب ہوں گے اتنا ہی ہمارا رویہ اور کردار لوگوں کے لئے قابل قبول اور قابل اعتماد ہوگا، لیکن خیالات اور کردار اور رویہ کی یہ تبدیلی ایک دم نہیں بلکہ تدریجاً وقوع پذیر ہوتی ہے جس طرح مادی چیزوں کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ ان میں تبدیلی اور ترقی کا عمل مرحلہ وار اور تدریج کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک بچہ پہلے بیٹھنا، پھر چلنا اور اس کے بعد دوڑنا سیکھتا ہے ایک دم نہیں

دوڑنے لگتا' بالکل اسی طرح کوئی شخص پیدا ہوتے ہی معزز اور عظیم انسان نہیں بن جاتا بلکہ قدم بقدم چل کر یہ مقام حاصل کرتا ہے اگر اس کے برعکس کوئی شخص دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو بن کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے تو وہ بہروپیا ہے یا پھر آپ کو دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم اس میں فرق یقیناً ہے وہ یہ کہ اخلاق اور کردار کی سطح پر بڑے سے بڑا دعویٰ بھی کچھ عرصہ کے لئے چل جاتا ہے یہاں تک کہ آپ اپنے آپ کو بھی دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جائیں گے حالانکہ اپنے بارے میں ہر شخص کو خوب معلوم ہوتا ہے مگر عام معاملات میں ایسا ممکن نہیں ہوتا مثلاً اگر آپ کو گاڑی چلانا یا کرکٹ کھیلنا نہیں آتا تو آپ شاید ہی اس کا دعویٰ کریں لیکن تقویٰ اور پرہیزگاری کا روپ دھار کر کچھ لوگ آسانی سے سادہ لوح انسانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ کردار اور اخلاق کی تعمیر و ترقی کا طویل اور صبر آزما فطری راستہ چھوڑ کر آسان راستہ اختیار کرنے کی ایک اہم وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان فطرتاً جلد باز واقع ہوا ہے لہٰذا ہم اپنی کامیابی کے لئے مصنوعی حربے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً گھر میں بیوی' بچوں پر ہم اس کے لئے رعب گانٹھنے لگتے ہیں کہ وہ جسمانی اور معاشی طور پر ہمارے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں۔ اسی طرح گھر کے باہر علم' منصب' اختیارات' یا شکل وصورت یا سماجی رتبہ کے لحاظ سے کم تر لوگوں پر ہم اپنا اقتدار جمانے میں کامیاب رہتے ہیں لیکن جونہی ہم کسی وجہ سے ان چیزوں سے محروم ہونے لگتے ہیں تو یہ عارضی اقتدار معدوم ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سچائی اور انصاف پر مبنی رشتے انسانوں کی زندگی کے بعد بھی قائم رہتے ہیں' سچائی ہمارے اندر موجود ہے' ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے دریافت کریں اور اسے اپنے قول وفعل کا حصہ بنائیں' انجام کے لحاظ سے یہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔

## توازن قائم کریں:

ہمارا کردار اصلاً عادات کا مرکب ہے۔ مسلمہ اصول ہے ایک سوچ سے ایک

عمل' ایک عمل سے ایک عادت' ایک عادت سے ایک کردار اور کردار سے انجام طے پاتا ہے۔ خلائی جہازوں کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کشش ثقل سے باہر نکلنے کے لئے ابتداً انہیں بہت زیادہ توانائی صرف کرنا پڑتی ہے لیکن پھر رفتہ رفتہ توانائی کی ضرورت کم ہوتی چلی جاتی ہے' یہی معاملہ عادات کا ہے' خصوصاً بری عادات سے پیچھا چھڑانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں' لیکن ناممکن بھی نہیں۔

عادت تین چیزوں سے بنتی ہے۔

① جاننا' یعنی کیا کریں اور کیوں کریں؟

② طریقہ' کیسے کریں اور

③ خواہش' کرنے کی خواہش۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کلی طور پر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ جسمانی' ذہنی' جذباتی اور معاشی طور پر خودمختار ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب انسان پوری طرح بلوغت کو پہنچ جاتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ انسانوں سمیت کائنات کا ایک نظام ہے جس کے تحت ہر ذی روح اور غیر ذی روح باہم مربوط ہیں۔ چنانچہ کوئی انسان کائنات میں بالکل الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ عام طور پر آزادی یا خودمختاری اعلیٰ ترین قدر خیال کی جاتی ہے لیکن یہ خیال دراصل انحصار دوسروں کے بے جا تسلط اور استحصال کا ردعمل ہے جس نے آزادی کے نعرہ کو عوام میں مقبول کیا ہے حالانکہ اعلیٰ ترین انسانی قدر آزادی نہیں' میل جول' ٹیم ورک اور اشتراک عملی ہے۔ ضرورت سے زیادہ آزادی کے نتیجہ میں تو انسانی معاشرہ الٹا شکست و ریخت کا شکار رہا ہے لوگ گھربار' بیوی بچوں' معاشرتی ذمہ داریوں' اخلاق و کردار ہر شے سے ''آزاد'' ہو گئے ہیں' البتہ یہ ضرور ہے کہ باہم انحصاری کی سطح تک رسائی حاصل ہونے کے لئے انفرادی سطح پر آزاد ہونا ضروری ہے' دوسروں پر انحصار کرنے والا

شخص باہم انحصاری کی سطح پر کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا' یعنی بالکل فطری تدریج کے ساتھ معاملہ آگے بڑھتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ آزادی سے مراد جسمانی، علمی، ذہنی، اخلاقی وغیرہ ہر قسم کی آزادی ہے اگر آپ کسی دوسرے کے ذہن سے سوچتے ہیں تو گویا آپ فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم ہین تو آپ آزاد نہیں ہیں۔ گویا آپ کی اپنی شخصیت ہی اگر ادھوری ہے تو آپ دوسروں پر اثر انداز نہیں ہو سکتے لہٰذا اپنی ذات سے بسم اللہ کریں اور پھر آگے بڑھیں' مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اپنی ذات میں ہی گم ہو جائیں بلکہ ایک فطری تدریج کے ساتھ آگے بڑھیں اور اپنی ذات پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے گھر کے اندر اور باہر اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کریں۔ ایک باہم منحصر دنیا میں رہتے ہوئے آپ روزمرہ کے امور کو زیادہ عرصہ التوا میں نہیں ڈال سکتے۔

## اعتماد کا ذخیرہ

بینک اکاؤنٹ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہم تھوڑا تھوڑا کر کے اس میں پیسہ ڈالتے رہتے ہیں اور اس طرح کچھ رقم جمع کر لیتے ہیں پھر ضرورت کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں' انسانی رشتوں کی مثال ایک بینک اکاؤنٹ کی ہے۔ ہم اپنی خوش خلقی' مہربانی' دیانت اور عہد کی پاسداری کے ذریعے لوگوں کے اعتماد کو ذخیرہ کر لیتے ہیں اور اس کے بدلے ضرورت پڑنے پر لوگوں کا تعاون حاصل کرتے ہیں۔ اس میں اگر ہم سے کہیں کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو وقتی طور پر اعتماد کی سطح نیچی ہو جاتی ہے' لیکن جب تک نیت ٹھیک رہتی ہے لوگ محض غلطیوں کے باعث کسی شخص کو بالکل رد نہیں کر دیتے۔ لوگ ایک شخص کے خلوص کو نظر انداز نہیں کر سکتے تاہم کسی شخص کا اخلاقی اکاؤنٹ جتنا بڑا ہو گا اتنا اس کے لئے لوگوں تک اپنی بات پہنچانا آسان ہو گا اور اس کی بات برمحل اور اثر انگیز ہو گی۔

اس کے برعکس اگر کسی شخص میں تکبر' بے مروتی' دوسروں کو نیچا دکھانے اور نظر

انداز کرنے' غیر ضروری ردعمل ظاہر کرنے' من مانی کرنے' دوسروں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے اور خوف وہراس پیدا کرنے جیسی عادات ہیں تو سمجھئے کہ وہ اخلاقی طور پر دیوالیہ پن کا شکار ہے اور اُسے دوسروں سے کسی بھلائی کی امید نہیں رکھنی چاہئے' گویا اس کا گزر ایسے راستے سے ہے جس پر جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہیں' اُسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا' ہر وقت چوکنا رہنا ہوگا۔

اب دیکھیں وہ کون سی باتیں ہیں جنہیں اختیار کرنے سے آپ اپنا اعتماد قائم کر سکتے ہیں یا اس میں اضافہ کر سکتے ہیں؟

## ① فرد شناسی:

کسی دوسرے شخص کے بارے میں جانکاری اور آگاہی حاصل کرنے کی تمنا کا ہونا سب سے اہم اور بنیادی بات ہے۔ اس کے بعد ہی آپ کو اس شخص کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ان کے مطابق عمل کر کے آپ اس شخص کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کے لئے جو چیزیں اہم ہیں' ضروری نہیں دوسروں کے لئے بھی اہم ہوں' لہٰذا آپ کو ان چیزوں کو اہمیت دینا ہوگی جو اس شخص کے نزدیک اہم ہیں جس کا آپ اعتماد حاصل کرنا چاہتے ہیں' دوسروں کو اپنے اوپر کبھی قیاس نہ کریں۔ اس حدیث کا کہ ''جو شے آپ کو اپنے لئے پسند ہے وہی دوسروں کے لئے پسند کریں'' یہ معنی نہ لیں کہ اگر آپ سگریٹ پیتے ہیں تو دوسروں کو سگریٹ پیش کریں بلکہ یہ کہ جس طرح آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو سمجھیں اس طرح آپ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے مطابق ان سے برتاؤ کریں۔

## ② چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں:

باہمی تعلقات میں چھوٹی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات آپ دوسرے بچوں کے سامنے کسی بچے کو پیار کرتے ہیں یا اس کی تعریف کرتے ہیں تو آپ کا یہ بے

ضرر ساں عمل بھی دوسرے بچوں کے لئے دل شکنی کا باعث ہوتا ہے۔

## ③ وعدہ پورا کریں:

وعدہ پورا کرنے سے ساکھ اور اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ وعدہ خلافی سے کمی ہوتی ہے۔ درحقیقت انسان کا اس سے بڑا دیوالیہ پن کوئی نہیں کہ وہ وعدہ کرے اور اسے پورا نہ کرے خواہ اس کے پاس ڈھیروں روپیہ پیسہ ہو۔

## ④ توقعات مبہم نہ رکھیں:

بعض اوقات کسی دوسرے شخص کے بارے میں ہم اپنے طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ یہ نہیں کرسکتا اور میں جو کہوں گا تو بلا تامل میری بات مان لے گا' یا اسے خود ہی یہ بات دھیان میں رکھنی چاہئے وغیرہ۔ ایسی مبہم توقعات نہ رکھیں' آپ جو چاہتے ہیں واضح طور پر دوسروں کو بتائیں اس سے خوف نہ کھائیں کہ انکار کی صورت میں آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔

## ⑤ ذاتی ساکھ اور اعتماد:

اگر آپ کے قول وفعل میں تضاد ہے تو آپ کی ساری نیکیاں دریا برد ہو جائیں گی۔ دیانتداری اور شے ہے دیانتداری یہ ہے کہ ہم وہی کچھ کہیں جو حقیقت ہے' جبکہ ساکھ کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت وہی ہو جو ہم کہیں' گویا وعدہ وفائی سے ساکھ قائم ہوتی ہے' خصوصاً ان کے ساتھ وعدہ وفائی جو سامنے موجود نہیں۔

## ⑥ اپنی کوتاہی پر دوسرے فریق سے معافی طلب کریں:

خلوص کے ساتھ معافی مانگنا آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ ایسا شخص یہ کام نہیں کرسکتا جو اندر سے عدم تحفظ کا شکار ہو' وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح لوگ اسے کمزور خیال کریں گے' حالانکہ ایک دانا کا قول ہے کہ ظالم وہ ہوتے ہیں جو کمزور ہوتے ہیں' شرافت کی توقع صرف ایک مضبوط انسان سے ہوسکتی ہے۔

## زندگی کا نصب العین:

اپنی زندگی کو با مقصد بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی ترجیحات' یہ ذہن میں رکھتے ہوئے طے کریں کہ آپ کو ایک روز اس دنیا سے رخصت ہونا ہے لہٰذا آپ یہ نہ سوچیں کہ آج آپ کو لوگ کیا کہیں گے بلکہ یہ دیکھیں کہ اس روز لوگ آپ کے بارے میں کیا کہیں گے جب آپ یہ دنیا چھوڑ کر جا رہے ہوں گے؟ پوری زندگی کو سامنے رکھ کر اپنا ایک نصب العین بنائیں اور پھر اس کے تحت اپنی ترجیحات اس طرح طے کریں کہ آپ کا ہر عمل آپ کو اس نصب العین کے قریب تر لانے کا باعث ہو۔

جن لوگوں نے زندگی کا مقصد صرف زیادہ سے زیادہ دولت کمانا سمجھ رکھا ہے ایک وقت آتا ہے کہ وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ جن چیزوں کی حقیقی قدر تھی اس کی طرف نگاہ ہی نہ گئی۔ اگر آدمی کو یہ مستحضر رہے کہ اسے ہمیشہ یہاں نہیں رہنا تو وہ کبھی دیوانہ وار دولت' شہرت اور جھوٹی عزت کے پیچھے نہیں بھاگے گا۔ مرنے والے کے بارے میں کسی نے پوچھا کہ پیچھے کیا چھوڑ گیا' جواب تھا ''سب کچھ''!

ہر شے دو بار تخلیق ہوتی ہے' پہلے ذہن میں اس شے کا خاکہ بنتا ہے اس کے بعد وہ شے وجود میں آتی ہے۔ اگر پہلی تخلیق ادھوری ہے تو اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والی شے بھی ادھوری رہے گی بڑھئی کا یہ اصول کہ ناپو دو بار' کاٹو ایک بار' ہمارے لئے ایک بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ یاد رکھئے! اکثر ناکامیاں پہلی تخلیق میں ہوتی ہیں۔ نیز آپ جو کچھ تخلیق کرنا چاہتے ہیں یہ نہ ہو کہ وہ ماحول' حالات یا دوسرے لوگوں کی طرف سے آپ پر ٹھونسی گئی ہو بلکہ خالص آپ کی اپنی تخلیق ہونی چاہئے ورنہ آپ محض دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیں گے' یہ حادثہ اکثر لوگوں کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔

ہماری زندگی کا مرکزی نقطہ ہی ہمارے تحفظ' راہنمائی' ہماری دانائی اور طاقت کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ تحفظ سے یہاں مراد آپ کی قدر و قیمت' آپ کا تشخص' آپ کی

جذباتی وابستگی، عزت نفس اور آپ کی اصل قوت ہے۔ راہنمائی سے مراد زندگی کا رخ۔ دانائی سے مراد زندگی کے بارے میں آپ کا زاویۂ نگاہ، اعتدال کی اہمیت اور مختلف اصولوں کے اطلاق کی صلاحیت ہے۔ اسی طرح طاقت سے مراد کسی کام کو انجام دینے کے لئے قوت کار ہے۔ ان چاروں عناصر کا آپس میں گہرا تعلق ہے، تحفظ اور راہنمائی میسر ہو تو دانائی آتی ہے اور دانائی سے قوت کار میں اضافہ ہوتا ہے، ان چاروں عناصر کی کمی بیشی انسان کی کمزوری یا طاقت کو ظاہر کرتی ہے۔

مذہب:

مذہب پر صحیح معنوں میں عمل کرنے سے انسانی زندگی بامعنی اور خوشگوار بن سکتی ہے، لیکن جو لوگ صرف رسومات کی حد تک مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں، وہ عملی زندگی میں شاید ہی کوئی کارنامہ انجام دے پاتے ہیں۔ چونکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو مذہب کی اصل تعلیمات سے نابلد ہوتے ہیں۔ اس لئے بجائے اس کے کہ مذہب سے وابستگی کے نتیجے میں انسان کی زندگی پر کوئی مثبت اثرات مرتب ہوں، مذہبی تعلیمات پر صحیح معنوں میں عمل نہ کرنے سے ایک قسم کی منافقت جنم لینے لگتی ہے اور آدمی صرف فروعی مسائل میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

اپنی ذات:

زندگی کا محصور و مرکز اگر انسان کی اپنی ذات بن جائے تو اس کا مظہر عام طور پر ''خود غرضی'' ہوتا ہے جو کئی اہم انسانی اقدار کی نفی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی مثال فلسطین میں واقع بحرۂ مردار کی ہے جو صرف لینا جانتا ہے، دینا نہیں، لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنی ذات خدمت خلق، لوگوں کی فلاح و بہبود اور نیکی اور بھلائی کے پھیلانے کے لئے وقف کر دے تو اس میں خیر ہی خیر ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ آپ دوسروں کی زندگی میں آسانی سے اس طرح کی کوئی

مثال تلاش کر سکتے ہیں لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ آپ کا اپنا مقصد حیات کیا ہے؟ اس کا جواب شاید اتنا آسان نہ ہو' لہٰذا کوشش کر کے اس کا جواب تلاش کیجئے۔ اکثر لوگوں کی زندگی کے ایک سے زائد مراکز ہوتے ہیں چنانچہ کبھی وہ ایک مرکز اور کبھی دوسرے مرکز کی طرف لڑھکتے رہتے ہیں لہٰذا زندگی کا کوئی ایک واضح اور معین مرکز ہونا ضروری ہے۔ ایسا کون سا مرکز ہوسکتا ہے جسے بہترین قرار دیا جا سکے؟ اگر ہم اپنی زندگی صحیح اصولوں پر استوار کرسکیں تو ہمارے خیال میں زندگی کا مقصد پورا کیا جا سکتا ہے۔

صحیح اصول تبدیل نہیں ہوتے اس لئے ان پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔ اصول' اصول ہوتے ہیں ان پر کوئی شے اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ اصول کسی کا لحاظ نہیں کرتے نہ کسی سے عداوت رکھتے ہیں' وہ کسی کا ساتھ نہیں چھوڑتے' لوگ انہیں چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ لوگوں کو ان کی ضرورت ہوتی ہے انہیں لوگوں کی ضرورت نہیں ہوتی' اصول آپ کو کبھی سبز باغ نہیں دکھاتے' اصول حالات و واقعات کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتے' اصول کبھی مرتے نہیں' نہ آپ انہیں نیست و نابود کر سکتے ہیں' اصولوں کے اندر گہرائی' سچائی اور گیرائی ہوتی ہے' اصول باہم مربوط ہوتے ہیں فتح بالآخر ہمیشہ اصولوں کی ہوتی ہے' کوتاہی ہماری ہے' ہم صحیح اصولوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری صلاحیتیں محدود ہیں لیکن مسلسل کوشش کے ذریعے ہم اپنی صلاحیتیں بڑھا سکتے ہیں۔

## اپنی اصل توجہ اہم کاموں پر مرکوز رکھیں:

اللہ تعالیٰ نے کم و بیش ہر انسان کو دو ایسے اوصاف ودیعت کئے ہیں جنہیں کام میں لا کر انسان اپنی زندگی کو با مقصد بنا سکتا ہے۔ وہ دو اوصاف یہ ہیں:

مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کا تصور کر لینا یعنی پیش بینی اور نیک و بد کی تمیز۔

واقف نہیں ہیں تو آپ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے لہٰذا پسماندہ رہنا آپ کا مقدر ہے لیکن آپ کے لئے اطمینان کی بات یہ ہے کہ اگر آپ نے ایک با اصول زندگی گزارنے کا تہیہ کرلیا ہے تو مروجہ طریقے آپ کے لئے زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اب تک جتنے بھی مینجمنٹ ٹولز ایجاد ہوئے ہیں وہ سب ''سامنے'' کے مسائل حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں ان کے ذریعے دوررس نتائج کے حامل مسائل سے عہدہ برآء ہونے میں زیادہ مدد نہیں ملتی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک با اصول شخص کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی بیکار شے ہے بلکہ فرق صرف نقطۂ نظر کی تبدیلی کا ہے جو کام عام لوگوں کے نزدیک زیادہ اہم ہیں ان کی بجائے آپ کے نزدیک دوسرے کچھ کام زیادہ اہم ہیں۔ ورنہ کام کا جہاں تک تعلق ہے کام کام ہی ہوتا ہے اور بہرحال کرنے سے ہوتا ہے چنانچہ آپ کو کم از کم چھ اعتبارات سے معیار پر پورا اترنا ہوگا۔

## ① پیوستگی:

یعنی آپ کے تصور اور مشن اور آپ کے کردار و اہداف' آپ کی ترجیحات' آپ کے منصوبوں اور آپ کی خواہشات و معمولات کے درمیان ہم آہنگی' یک جہتی اور ربط وضبط ہو۔

## ② توازن:

آپ جو طریقہ اختیار کریں وہ ایسا ہو کہ آپ کی زندگی میں توازن پیدا ہو' ایسا نہ ہو کہ آپ کی صحت' خاندان' پیشہ وارانہ تیاری یا ذاتی اصلاح جیسے اہم امور نظروں سے بالکل اوجھل ہو جائیں۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی ایک رخ پر کامیابی حاصل کر لینے سے زندگی کے دوسرے شعبوں میں ناکامی کی تلافی ہو جاتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے مثال کے طور پر آپ کی پیشہ وارانہ کامیابی سے آپ کی ازدواجی زندگی کی ناکامی'

صحت کی بربادی یا ذاتی کردار کی کمزوری کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے؟

③ پیش رفت:

آپ کو ایک ایسا آلۂ کار درکار ہے جو آپ کی حوصلہ افزائی اور آپ کے اندر تحریک پیدا کرنے کا موجب ہو اور بالفعل آپ کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنا وقت لگانے میں مدد دے تاکہ آپ صحیح معنوں میں آگے بڑھتے ہوئے نظر آئیں۔ عام طور پر ہر روز کے لئے کام کا ایک پروگرام طے کیا جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک ایک اصولی زندگی گزارنے کے لئے ہفتہ وار شیڈول زیادہ مناسب رہتا ہے۔

④ عوامی پہلو:

کسی کام کو انجام دینے کے لئے بنیادی اہمیت آپ کی ہے اور آپ کے طریقۂ کار کی' لیکن تعلقات عامہ ایک ایسا شعبہ ہے جو انسانی زندگی کا جزو لازم ہے۔ عام زندگی میں کارکردگی کا انحصار ٹائم شیڈول پر ہوتا ہے لیکن جس شخص کے پیش نظر ایک با اصول زندگی ہے اس کی کارکردگی اس پہلو سے دیکھی جائے گی کہ لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے؟

⑤ لچک:

آپ نے جو لائحۂ عمل اختیار کیا ہے اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آپ کو اپنے مقصد کے حصول میں مدد ملے نہ یہ کہ آپ اپنے لائحۂ عمل کے غلام بن کر رہ جائیں۔

⑥ کم وزن:

آپ کا آلۂ کار ایسا بھاری بھرکم نہ ہو کہ ایک ہی جگہ رکھا رہے بلکہ ہلکا پھلکا ہوتا کہ ہر جگہ آپ کے پاس موجود ہو۔ آپ کہیں سفر میں ہیں اور آپ کسی مسئلے کا جائزہ لینا چاہتے ہیں یا کوئی نئی بات اپنے پروگرام میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو اہم اور بنیادی نکات آپ کو ہر وقت دستیاب رہنے چاہئیں۔

یاد رہے کہ یہ نکات تحریری شکل میں ہونے چاہئیں اور انہیں روبہ عمل لانے کے لئے آپ ہفتہ وار پروگرام ترتیب دیتے ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ پروگرام کے مطابق چلنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک ہی ہفتے کے اندر ایسے کئی مرحلے آئیں گے جب آدمی سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اِدھر ہو جائے یا اُدھر' ایک ہنگامہ برپا ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کئی ایسے مسائل سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں جو ہماری ترجیحات میں شامل نہیں ہوتے لیکن ظاہر ہے ہمارا علم بہت محدود ہے پہلے سے ہر بات کے بارے میں یہ نہیں جان سکتے کہ اس کی اصل اہمیت کیا ہے؟ آپ اپنا پروگرام کتنا ہی سوچ سمجھ کر بنائیں ایسے مواقع آتے ہیں کہ آپ کو اپنے پروگرام سے ہٹ کر کام کرنا پڑتا ہے لیکن ایسا کرنے میں آپ کہاں تک حق بجانب ہیں یہ آپ کا ضمیر ہی بتا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا مقصد کتنا صحیح اور واضح ہے اور اس کے لئے آپ کے اندر کتنی لگن اور تڑپ ہے۔ تاہم ایک بات یاد دلا دیں کہ انسانوں کے ساتھ معاملات کے ضمن میں کارکردگی نہیں دیکھی جاتی' کارکردگی کا تعلق چیزوں سے ہوتا ہے' انسانوں کے بارے میں اَثر پذیری کام آتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے اپنی مصروفیات میں سے ۱۰ منٹ اپنے بیٹے یا کسی ملازم کے لئے مقرر کئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اتنے وقت میں اس کا مسئلہ حل کر دیں تو یہ طرزِ عمل حقیقت پسندانہ نہیں۔ ہاں آپ نے کسی جگہ پہنچنا ہے' کہیں سے کوئی چیز منگوانی ہے' کوئی چیز مرمت کرانی ہے' ایسے کام باقاعدہ شیڈول کے تحت انجام دیئے جاتے ہیں' لیکن اصولاً ایک انسان کی اہمیت دوسرے سارے کاموں سے زیادہ ہونی چاہئے۔

اس سے قبل مینجمنٹ کی بات آئی تھی ایک اچھا مینجر وہ ہوتا ہے جو دوسروں سے کام لینا جانتا ہو' اس کے بھی اپنے کچھ تقاضے ہیں' مثلاً:

① مطلوبہ نتائج: کام لینے والے اور کام کرنے والے' دونوں کو صاف اور واضح طور پر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حاصل کیا کرنا ہے؟ آپ کے ذہن میں جو مقصد ہے

وہ اس شخص پر واضح ہونا چاہئے جس کے سپرد آپ یہ کام کرنا چاہتے ہیں' ساتھ ہی یہ بات بھی کہ کب تک آپ چاہتے ہیں کہ یہ کام مکمل ہو جائے؟

② رہنما اصول: وہ حدود و قیود پوری طرح واضح ہونی چاہئیں جن کے اندر رہ کر اس شخص کو کام کرنا ہے' یہ جتنی کم ہوں اچھا ہے لیکن کسی شخص کو بالکل کھلا چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں ہوتا' لہٰذا جو بہت ہی ناگزیر باتیں ہیں وہ صاف صاف سامنے آنی چاہئیں۔ اگر آپ کو اندازہ ہے کہ یہ شخص کہاں کہاں غلطی کر سکتا ہے تو اسے آگاہ کرنے میں حرج نہیں البتہ یہ بات اس شخص پر چھوڑ دینی چاہئے کہ وہ کیسے یہ کام سرانجام دیتا ہے۔

③ وسائل: مطلوبہ نتائج تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اسے کیا کیا سہولتیں اور وسائل میسر ہوں گے ان کی نشاندہی ہونا ضروری ہے۔

④ احتساب: وہ معیار پہلے سے مقرر کر دیں جس پر آپ اس شخص کی کارکردگی کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔

⑤ اثرات: کارکردگی کی جانچ پڑتال کے نتیجے میں جو بھی اچھے یا برے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں وہ پہلے سے طے ہونے چاہئیں مثلاً کسی انعام یا حوصلہ افزائی کے علاوہ وہ ایسے قدرتی اثرات جو آپ کے مجموعی مشن پر پڑ سکتے ہیں۔

# اجتماعیت

اداروں اور تنظیموں کے حوالے سے اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ اجتماعی کاموں میں لوگ باہم تعاون اور دلچسپی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے اپنی ذات کو آگے رکھتے ہیں' خواہ اس میں خاندان کا معاملہ ہو یا کسی تجارتی' کاروباری یا دینی و مذہبی ادارے کا' حالانکہ ٹیم ورک کی اہمیت ہر شخص جانتا ہے اور یہ بھی کہ خود پسندی اجتماعیت کے لئے رکاوٹ کا باعث ہوتی ہے' اس کے باوجود ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی ایک بڑی وجہ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔ اگرچہ انفرادی سطح پر یہ جذبہ غلط نہیں لیکن جب آپ اس جذبے کو ترقی کے لئے آلۂ کار بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ آپ اپنے گھر کی مثال لے لیں' جب آپ اپنے بیوی بچوں کا دوسرے گھروں سے یا خود اپنے گھر میں اپنے بچوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ میرا فلاں بچہ ماشاء اللہ بہت تیز ہے اور فلاں پیچھے ہے وغیرہ' تو آپ ایک طرح سے ان کے منفی جذبات کو ہوا دے رہے ہوتے ہیں۔ ایک طرف آپ مسابقت کی ترغیب دیتے ہیں' گو آپ کا مقصد بہتری پیدا کرنا ہوتا ہے' دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ آپس میں تعاون ہو' مسابقت کا کیا مطلب ہے؟ ایک کی جیت' دوسرے کی ہار' تو ان کے درمیان تعاون کیسے ہوگا؟

اجتماعیت میں افراد کی بجائے کام کے بارے میں بات کریں' ہمیں یہ کام کرنا ہے' اگر اس میں آگے بڑھ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے تمام کل پرزے ٹھیک کام کر رہے ہیں ورنہ یہ مشین ٹھیک نہیں۔ تعاون کے لئے باہم انحصاری کی فضا چاہئے۔ آپ کا جو بھی مقام و مرتبہ اور منصب ہے آپ اس کا خیال دل سے نکال دیں' ''نگران'' کی بجائے اپنے آپ کو ٹیم کا ایک رکن تصور کریں' آپ کو خود بخود قیادت حاصل ہو

جائے گی۔ دنیا میں کامیابیاں محدود نہیں ہیں' ہر شخص کامیابی حاصل کرسکتا ہے' بشرطیکہ وہ اپنی پوری صلاحیت اور استعداد بروئے کار لائے۔ اگر آپ کے گھر یا ادارے کا ہر فرد اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے تو آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے کہ آپ کی ٹیم میں کون آگے ہے اور کون پیچھے' آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ کی ٹیم کا ہر فرد اپنے آپ کو اہم سمجھنے لگے۔

کامیابی کے لئے ہمارا تصور یہ ہے کہ اس کا انحصار انسان کے مقام و مرتبہ' طاقت' منصب' حیثیت اور شخصیت پر ہوتا ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو دیکھے جاسکتے ہیں لہٰذا کسی شخص کے بارے میں فوری طور پر ہماری جو رائے بنتی ہے وہ انہی اوصاف کی بنا پر ہوتی ہے حالانکہ انسان کا ایک باطن بھی ہوتا ہے مگر شاید ہی ہم کسی انسان کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے جس شے کو ہم حقیر سمجھ رہے ہیں کسی انسان نے اس میں اپنی ساری صلاحیت لگادی ہو' جیسے کسی شخص کے پاس کل دس روپے تھے اس نے دس کے دس آپ کو پیش کردیئے' انسانوں کو ان کی کارکردگی کے بجائے ان کی استعداد کے لحاظ سے پرکھا جاتا ہے۔ یہاں مسابقت اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی نفی مقصود نہیں بلکہ یہ بتانا پیش نظر ہے کہ زندگی صرف ایک دوڑ ہی نہیں ہے' اکیلا کوئی شخص کہاں تک دوڑے گا اور دوڑ کر کہاں جائے گا' جب تک ایک دوسرے کو ساتھ لے کر نہیں چلیں گے زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مختلف حالات میں ہمارا طرزِ عمل مختلف ہوگا' مثلاً کوئی بہت اہم کام ہے جسے آپ ہی بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں تو ظاہر ہے آپ اسے دوسرے کسی کے سپرد کرنا مناسب نہیں سمجھیں گے لیکن جہاں بھی ممکن ہو دوسروں کو آگے آنے میں مدد دیں۔ ایک ایسی کامیابی سے ہار بہتر ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کیلئے کسی اعلیٰ قدر کو قربان کرنا پڑتا ہو۔ بعض حالات میں کامیابی کا حصول دوسرے تمام معاملات سے اہم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ انسانی رشتے ناطے بھی اس کے لئے قربان کئے جاسکتے ہیں۔

# سَمِعْنَا

اس وقت آپ یہ تحریر اس لئے پڑھ رہے ہیں تاکہ آپ جان سکیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ گویا پڑھنا اور لکھنا تبادلۂ خیالات کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح کا ایک ذریعہ کہنا اور سننا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ ان میں سے تین چیزوں کے سیکھنے پر تو ہم میں سے ہر ایک نے کچھ نہ کچھ وقت اور محنت صرف کی ہوگی' یعنی پڑھنا' لکھنا اور بات کرنے کا سلیقہ اور ڈھنگ' لیکن چوتھی چیز' یعنی سننے کے لئے بھی کبھی شعوری طور پر محنت اور کوشش کی ہے؟ شاید کبھی نہیں' حالانکہ آپ اس وقت تک اپنی بات مجھ تک نہیں پہنچا سکتے جب تک آپ مجھے جانتے نہ ہوں اور اگر آپ میری بات نہیں سنتے تو مجھے جان کیسے سکتے ہیں؟ ممکن ہے آپ جو کچھ کہہ رہے ہوں وہ واقعتاً بہت اہم اور مفید ہو' لیکن آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ مجھے اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ فرض کیا مجھے اس چیز کی ضرورت ہی نہیں جو آپ پیش کر رہے ہیں تو آپ کی کوشش اور محنت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا بلکہ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ کیوں کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا؟

کسی دوسرے شخص کو سمجھنے کے لئے اپنا زاویۂ نگاہ بدلنا پڑتا ہے' اس لئے کہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ پہلے اسے سمجھا جائے۔ اکثر ہم جو کچھ سنتے ہیں اس کا مقصد بات کرنے والے شخص کے اندر جھانکنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی بات کا جواب دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بات نہیں سمجھتے' اپنے بارے میں کوئی نہیں کہتا کہ میں نہیں سمجھا۔

ہمارا سننا عموماً چار طرح کا ہوتا ہے۔

(۱) سنا اَن سنا

(۲) دکھاوے کے لئے سننا

(۳) درمیان میں سے پسند کی کوئی بات سن لینا

(۴) صرف الفاظ کی حد تک سننا

پانچویں قسم، یعنی بامعنی سننا شاذ ہی ہوتا ہے۔ بامعنی سننے کے لئے کسی خاص مہارت یا فنکاری کی ضرورت نہیں اور نہ ہی بلاوجہ ہاں میں ہاں ملانا ضروری ہے، بلکہ فطری انداز اختیار کریں، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کا ارادہ ہے تو یہ کوئی ناممکن کام نہیں، البتہ کسی کو سمجھنے کے لئے دل کے کانوں سے سننا پڑتا ہے۔ ابلاغیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ الفاظ کے ذریعے صرف دس فیصد ابلاغ ہوتا ہے، مزید ۳۰ فیصد آواز کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے اور ۶۰ فیصد جسم کی حرکات وسکنات کے ذریعے ہوتا ہے۔ اسی طرح کانوں سے زیادہ آدمی آنکھوں اور دل سے سنتا ہے، دل سے کسی کی بات سنیں گے تو آپ اس شخص کے دل میں گھر کرلیں گے۔

ایک شخص مطمئن زندگی گزار رہا ہے، اسے آپ کی ضرورت ہی نہیں، آپ اس کا دل جیتنے کے لئے جتنا چاہے جتن کرلیں، کوئی اثر نہیں ہوگا، اثر وہاں ہوگا جہاں کوئی طلب، کوئی پیاس ہوگی۔ جسمانی بقاء کے علاوہ لوگوں کو نفسیاتی بقاء کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اسے سمجھا جائے اور اسے اہمیت دی جائے۔ اگر آپ کسی کی یہ ضرورت پوری کرتے ہیں تو وہ شخص آپ کے دائرۂ اثر میں آجاتا ہے۔

اب آپ دیکھیں کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں اور اس کے مطابق اس سے سلوک کریں، لہٰذا جو بھی شخص اپنے آپ کو بھلا کر کسی دوسرے کا درد اپنے سر لینے کی کوشش کرتا ہے تو یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی آسان کام ہے، یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین ہوتا ہے، لیکن یہ بہرحال ایک اصول ہے جس کے بغیر کوئی بھی آدمی ٹھوس پیش رفت نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں کے ساتھ آپ کو رہنا

ہے اور مل کر رہنا ہے اگر ان کے ساتھ آپ کی مفاہمت نہیں ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر آپ کا مرض معلوم کئے بغیر آپ کو نسخہ تھما دے' اولاً تو آپ کو اس نسخے پر اعتماد ہی نہیں ہوگا' دوسرے اسے استعمال کرنے کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

جب ہم کسی دوسرے کی بات اپنے نقطہ نظر سے اور اپنے مشاہدات واحساسات کے حوالے سے سنتے ہیں تو ہمارا ردِ عمل کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔

① یا تو ہم اس سے اتفاق کر لیتے ہیں یا اختلاف۔
② اپنی ذہنی سطح کے مطابق مزید کچھ سوالات کے جواب طلب کرتے ہیں۔
③ اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ مشورہ دے دیتے ہیں۔
④ ہم اپنے محرکات اور رویے کی بناء پر مخاطب کے محرکات اور رویے کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں' یہ وہ ردِ عمل ہے جو قدرتی طور پر سامنے آتا ہے اس میں ہماری کسی شعوری کاوش کا دخل نہیں ہوتا' لہٰذا اس سے کسی دوسرے انسان کو صحیح طور پر سمجھنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ آپ کا بچہ دوستوں کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتا رہے گا لیکن آپ کے ساتھ ہوں' ہاں میں جواب دے کر جان چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کا بچہ آپ کے ساتھ اجنبیت محسوس کرتا ہے کیونکہ آپ فوراً اسے اپنے ان تجربات سے مستفید کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے لئے غیر ضروری ہیں۔

بامعنی بات سننے کے لئے چار ابتدائی مرحلے طے کرنے لازم ہیں:

① آپ جو سنیں اسے دہرا دیں مثلاً ایک آدمی کہتا ہے کہ "میں تنگ آ چکا ہوں" تو آپ بھی دہرا دیں کہ "اوہ آپ تنگ آ چکے ہیں؟" اگرچہ ایسا کرنا مضحکہ خیز نظر آتا ہے لیکن اس سے بہر حال بہتر ہے کہ آپ یہ پوچھیں کہ کیا ہوا' کیسے ہوا وغیرہ؟
② آپ اسی بات کو ایک دوسرے پیرائے میں دہرا دیں مثلاً "اس کا مطلب ہے

حالات خراب ہیں'' اس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے کہ آپ واقعی ''سن'' رہے ہیں۔

③ آپ کی بات سے یہ ظاہر ہو گویا آپ حالات کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں' مثلاً یہ کہ یہ ''یہ تشویش کی بات ہے''۔

④ آپ نے نہ کسی اتفاق یا اختلاف کا اظہار کیا ہے' نہ کوئی سوال' نہ مشورہ تو اب یہ اس آدمی پر منحصر کہ وہ آپ تک اپنی بات پہنچائے۔ کیونکہ اسے کافی حد تک احساس ہو چکا ہوگا کہ آپ صورتِ حال جاننے میں سنجیدہ ہیں۔ اگر آپ دل سے کسی کی بھلائی چاہتے ہیں اور آپ اس قابل ہیں کہ صحیح رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں تو آپ کے لئے اب راستہ کھلا ہوگا۔ آپ اس شخص سے گفتگو کریں اور اس کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں' کریں۔

اس میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ کسی آدمی کو سننے اور سمجھنے میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے' بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ آپ کسی مقصد کے لئے اپنا وقت صرف کریں۔

# آ ئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پر اڑنا!

اب بندہ آگے جن باتوں کا تعین کرنے جا رہا ہے اُن کے تتمہ کے طور پر فقط اتنا کہوگا کہ:

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم اسی زمین کے ہوکر رہ گئے ہیں' اس سے اوپر نہیں اٹھتے' چونکہ ہمارا کوئی اعلیٰ نصب العین اور بلند تخیل نہیں ہوتا اس لئے ہم چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر شوہر اور بیوی کو یہ احساس ہو کہ انہیں مل جل کر کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے کام کرنا ہے تو دونوں مل کر کوئی نہ کوئی درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے' مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ انہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہو' شوہر کو بیوی کے جذبات کا احساس ہو اور بیوی کو شوہر اور بچوں کی خوشی عزیز ہو۔ ہم جو توانائی اور وقت اپنی بات منوانے پر صرف کرتے ہیں وہی کسی ٹھوس کام میں لگائیں تو زندگی میں نمایاں تبدیلی لا سکتے ہیں' مگر اس کے لئے ہمیں اپنا زاویۂ نگاہ بدلنا ہوگا جو ایک مشکل کام ہے۔

# تن خاکی میں جان پیدا کر

کہتے ہیں' جان ہے تو جہان ہے۔ ماہرین کے نزدیک جان سے مراد جسمانی' روحانی' ذہنی اور جذباتی صحت ہے۔ گویا انسان ان چاروں پہلوؤں سے صحت مند ہے تب کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''جاندار'' ہے' لہٰذا ایک انسان کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی جان کی ان چاروں پہلوؤں سے حفاظت کرے اور اسے پروان چڑھائے۔

## جسمانی پہلو:

جسمانی صحت سے ہم سب واقف ہیں۔ اسے برقرار رکھنے اور پروان چڑھانے کے لئے متوازن غذا' مناسب آرام اور باقاعدہ مشق لازم ہے۔ مشق میں ذہن سمیت تمام جسمانی اعضاء کی تربیت شامل ہے' کیونکہ کسی ایک عضو کے کمزور پڑنے سے پورا جسم متاثر ہوتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت مشقیں کرنا غیر ضروری سمجھتی ہے' حالانکہ یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا متوازن غذا اور مناسب آرام۔ آپ کسی کو لکڑیاں کاٹتے ہوئے دیکھتے ہیں' بے چارہ بڑی دیر سے جان مار رہا ہے مگر کام ختم نہیں ہو رہا' آپ اسے کہتے ہیں' بھئی تھوڑا رک کر کلہاڑا تیز کر لو' یہ کام جلد ختم ہو جائے گا مگر جواب ملتا ہے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس سیر یا ورزش کے لئے وقت نہیں ہے ان لوگوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ جسمانی قوت اور توانائی حاصل کرنے کے لئے دل کا توانا اور صحت مند ہونا ضروری ہے' مگر دل کی ورزش ٹانگوں کی ورزش کے ذریعے ہوتی ہے مثلاً تیز چلنا' دوڑنا' تیراکی وغیرہ۔ جسمانی صحت کے لئے دل کی کم سے کم دھڑکن ۱۰۰ فی منٹ تک لے جا کر اسے

آدھے گھنٹے تک برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اگر آپ ورزش کے عادی نہیں ہیں تو آپ کا جسم اور جان آسانی سے اسے قبول نہیں کرے گا' لیکن جان لیجئے کہ ورزش کے بغیر چارۂ کار نہیں' لہٰذا ہر حال میں اس کی عادت ڈالیئے۔

روحانی پہلو:

روحانی صحت کا تعلق انسان کے باطن' دل اور اس کی اقدار کے ساتھ ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جو انسان کو نیک و بد کی تمیز سکھاتا ہے اور ابدی سچائی کے ساتھ اس کا تعلق قائم کرتا ہے۔

کتاب الٰہی کے مطالعہ اور اس میں غور و فکر کرنے سے روحانی پہلو کو حقیقی جلا ملتی ہے۔ ایک مذہبی رہنما کا کہنا تھا کہ زندگی کی اب سے بڑی لڑائیاں ہر روز روح کے خاموش خانہ کے اندر لڑی جاتی ہیں۔ اگر آپ وہاں جیت جاتے ہیں' اگر دل کے اندر جاری کشمکش پر آپ قابو پا لیتے ہیں تو گویا آپ امن میں آ گئے' اپنی ذات کے تحفظ اور مفادات کی جنگ لڑنے کی بجائے اب آپ بے خوف و خطر با مقصد زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

ذہنی پہلو:

ہماری بیشتر ذہنی ترقی اور مطالعہ سے دلچسپی روایتی تعلیم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ جونہی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے ہمارا ذہن عموماً سکڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہماری توجہ ہمارے کام کے شعبہ پر مرتکز ہو جاتی ہے' لکھنا پڑھنا ہمارے معمولات سے خارج ہو جاتا ہے۔ ذہن کی نشو ونما کے لئے تعلیم جاری رکھنا ازبس ضروری ہے' اس کے لئے کبھی کبھار اگر کمرۂ جماعت میں بھی بیٹھنا پڑے تو کوئی حرج نہیں' اچھی کتابوں کے مطالعے سے بہتر ذہنی تندرستی کا کوئی ذریعہ نہیں' جو شخص مطالعہ کا عادی نہیں اس میں اور ایک ان پڑھ شخص میں کوئی فرق نہیں۔

**جذباتی پہلو:**

جسمانی، روحانی اور ذہنی پہلو انسان کی انفرادی زندگی سے متعلق ہیں جبکہ جذباتی پہلو کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ چنانچہ سماجی اور جذباتی پہلوؤں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس پہلو سے ترقی کے لئے اس طور پر الگ سے کوئی وقت اور محنت معین کرنا ضروری نہیں جیسا کہ دیگر تین پہلوؤں کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے' بلکہ معمول کے انسانی روابط کے ذریعے اصلاح کا عمل جاری رکھا جا سکتا ہے' لیکن مشق کی بہرحال اس پہلو سے بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی دوسرے پہلوؤں سے' کیونکہ دوسرے لوگوں پر اثر انداز ہونے اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد چاہئے۔ آپ کے بہت قریبی اور اہم ساتھی' آپ کے ماتحت' دوست' پڑوسی' حتیٰ کہ بیوی بچے' ضروری نہیں کہ پوری طرح آپ کے ہم خیال ہوں لہٰذا ہر معاملے میں آپ کو ایک ایسے حل کی ضرورت ہوتی ہے' جو آپ اور آپ کے ساتھی کے لئے یکساں طور پر پسندیدہ اور قابل قبول ہو۔ اس کے لئے جو طریق کار ہونا چاہئے اس پر قبل ازیں گفتگو کی جا چکی ہے۔ جب آپ اپنے ساتھی سے یہ کہتے ہیں کہ ایک ہی معاملے میں ہم اپنے اپنے ذہن کے مطابق الگ الگ طریقے سے کام کر رہے ہیں لہٰذا کیوں نہ ہم ایک ایسا طریق کار اختیار کریں جو بہتر اور زیادہ مؤثر ہو تو شاید ہی کوئی شخص اس سے انکار کرے گا۔ اس کے بعد جیسا کہ اس بارے میں بیان ہو چکا ہے' آپ اپنے دل کے کانوں سے ساتھی کی بات کا جائزہ لیں اور ایک متفقہ لائحہ عمل طے کریں۔ ہم اکثر پہلے سے فرض کر لیتے ہیں کہ لوگ عام طور پر اچھے نہیں ہوتے۔ اس پر ایک دلچسپ واقعہ پیش خدمت ہے۔ ایک سکول میں کمپیوٹر کی فہرست پر ''ذہین'' کا لیبل لگ کر آ گیا اور اس کے مطابق اساتذہ نے انہیں اگلی کلاس میں پڑھانا شروع کر دیا' کوئی پانچ چھ ماہ بعد انتظامیہ کو اس غلطی کا احساس ہوا تو اس نے کسی کو غلطی کا بتائے بغیر بچوں کا دوبارہ ٹیسٹ لینے کا فیصلہ کیا اور جو نتیجہ سامنے آیا وہ حیران کن تھا' جو

بچے اصل میں ذہین تھے ان کی ذہانت میں نمایاں طور پر کمی واقع ہو گئی تھی کیونکہ اس دوران ان کے ساتھ کند ذہن بچوں جیسا سلوک روا رکھا گیا تھا اور جو غلطی سے ذہین شمار کر لئے گئے تھے وہ اساتذہ کی ذاتی توجہ اور دلچسپی سے آگے آ گئے تھے' جب اساتذہ سے دریافت کیا گیا کہ شروع میں انہیں کوئی خاص مسئلہ تو پیش نہیں آیا تھا' ان کا جواب تھا کہ مسئلہ پیش آیا تھا لیکن ہم نے اپنا طریق کار تبدیل کر لیا تھا۔

۱۲

# اساتذہ اور طلبہ کے حقوق و فرائض

## باب: ⑫

### استاد کی بڑائی، علم سکھانے ہی سے ہویدا ہے:

حضرت سفیان ثوریؒ ایک مرتبہ عسقلان تشریف لے گئے تین دن وہاں مقیم رہے کوئی شخص ان سے کوئی مسئلہ دریافت کرنے نہ آیا' یہ حال دیکھ کر انہوں نے فرمایا کہ میرے لئے سواری کا انتظام کر دو تاکہ میں یہاں سے جلد از جلد چلا جاؤں' یہ ایسا مقام ہے جہاں علم کی موت ہے۔

### علم کا احترام:

سب سے پہلی بات جو ان اساتذہؒ کے کردار میں نمایاں نظر آتی ہے وہ علم کا احترام ہے' جو علم انہوں نے حاصل کیا تھا جس کی تعلیم وہ طلبہ کو دیتے تھے' وہ ان کے نزدیک نہایت معزز اور محترم تھا۔ وہ علم کا اور کتابوں کا ہر حال میں احترام کرتے تھے' نہ ان کو بے توجہی سے زمین پر پھینکتے تھے' نہ ان کو پیر لگاتے تھے۔

درس و تدریس کا آغاز سرچشمہ علم و عرفان خداوند تعالیٰ کے حضور دعا مانگنے سے ہوتا تھا تاکہ اشاعت علم کی جدوجہد میں استاد اور شاگرد دونوں مقصد تعلیم و تدریس کا اعادہ کرلیں۔ وہ ہے خوشنودی رب تعالیٰ اس دعا سے دوران تدریس انتہائی سنجیدگی کی فضا طاری رہتی تھی' پھر استاد رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھتا تھا' طلبہ دوزانو ہو کر مؤدب بیٹھ کر استاد کے سامنے احترام سے سبق لیتے تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مسجد نبوی میں حدیث شریف کا درس دیتے تھے۔ ان کی مجلس خوشبو سے معطر ہوتی تھی' وہ کرسی پر بیٹھ کر درس دیتے تھے' نہ کھنکارتے' نہ تھوکتے' نہ جنبش کرتے' نہ حرکت کرتے وہ فرماتے تھے کہ میں صاحب حدیث ﷺ کا احترام

ملحوظ رکھتا ہوں۔

صاحب ابن عباد بن بویہہ کا طاقتور امیر تھا اور عالم فاضل تھا اس نے ایک جداگانہ مکان تعمیر کرایا تھا' جس کو وہ دارالتوبہ کہتا تھا' درس حدیث دینے سے قبل وہ غسل کرتا تھا نئے کپڑے پہنتا تھا' خوشبو لگاتا تھا' اپنے گناہوں سے توبہ کرتا تھا' پھر اس مکان میں آ کر بیٹھتا تھا اور طلبہ کو حدیث کا درس دیتا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ نئی کتاب کا آغاز بدھ کے دن سے کرتے تھے۔

## تدریس کی تمنا:

درس وتدریس کا کام مسلمان معاشرے میں نہایت عزت واحترام کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ بڑی مساجد میں تدریس کے لئے علمائے کرام دعائیں مانگتے تھے۔

خطیب بغدادی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جب حج پر گئے' تو وہاں انہوں نے آب زمزم کے تین گھونٹ پیئے ہر گھونٹ پر ایک دعا مانگی پہلی دعا یہ تھی کہ وہ بغداد کی تاریخ لکھیں اس کے بعد چودہ جلدوں میں انہوں نے تاریخ بغداد لکھی ہے جو بہت مشہور ہے۔ دوسری دعا یہ مانگی کہ جامعہ منصور بغداد میں وہ حلقہ درس قائم کریں اور تیسری دعا یہ مانگی کہ مشہور عابد وزاہد بشر حافی کے قریب وہ دفن ہوں۔

## استاد کے لئے عمر کی شرط:

ابتدائے اسلام میں استاد بننے کے لئے عمر کی کوئی خاص شرط نہیں تھی' بلکہ کسی عہدہ اور منصب کے لئے بھی عمر کی شرط نہیں تھی' اہلیت اور لیاقت ہی سب سے بڑی شرط تھی۔ حضرت عمرؓ نے یحییٰ بن اکثم کوفی کو جب مدرس مقرر کیا تو اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ کسی نے اعتراض کے انداز میں ان سے عمر دریافت کی' انہوں نے جواب میں کہا' میری عمر عتاب بن اسید سے زیادہ ہے جب فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کو مکہ کا والی مقرر کیا تھا۔ میری عمر معاذ بن جبلؓ سے زیادہ ہے' جب

رسول اللہ ﷺ نے ان کو یمن کا والی اور قاضی مقرر کیا تھا۔ میری عمر کعب بن سورہؓ سے زیادہ ہے جن کو حضرت عمرؓ نے بصرہ کا قاضی بنا کر روانہ کیا تھا۔

بعد کے زمانہ میں جب نظام تعلیم و تدریس نے ایک باقاعدہ مرتب شکل اختیار کر لی، تو ایک مدرس کے لئے چالیس سال کی عمر لازمی قرار دی گئی۔ سخاوی نے لکھا ہے کہ بدر بن قطان نے ۸۷۰ھ میں زین العابدین بن شرفی مناوی سے مدرسہ خروبیہ قاہرہ کی مدرسی چھین لی تھی، اس لئے کہ اس وقت ان کی عمر چالیس سال نہیں ہوئی تھی۔ جب شمس الدین عمار مالکی نے مدرسہ سلمیہ واقع محلہ سوربین قاہرہ میں درس فقہ دینا شروع کیا تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ مدرسہ کے وقف نامہ کی شرط کے مطابق مدرس کے لئے چالیس سال عمر ہونا لازمی ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت تک فرو نہیں ہوا، جب تک شمس الدین نے اپنی عمر کا وثیقہ نہ پیش کر دیا، وثیقہ کے مطابق ان کی عمر ۴۵ سال کی تھی۔

## تدریس کی تقریب:

جب کوئی عالم تدریس کا آغاز کرتا تھا تو پہلے ایک دن تقریب منعقد ہوتی تھی، شہر کے تمام بزرگ اساتذہ وہاں جمع ہوتے تھے اور درس کو سنتے تھے، نئے استاد سے اس کے استادوں کی فہرست طلب کی جاتی تھی جن جن سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی، ایک دو سوالات بھی دریافت کئے جاتے تھے، جب پوری طرح اطمینان ہو جاتا تھا تب اس کو تدریس کی عام اجازت مل جاتی تھی۔ یہ ایک طرح کا امتحان بھی تھا اور محفل تکریم بھی تھی۔ یہ رسم تو شاید آج بھی پاکستان میں پائی جاتی ہے، مگر اصل روح مفقود ہو چکی ہے۔

## مدرس بننے میں انکسار:

بڑے اہم مدرس مقرر ہو جانے پر بعض اساتذہ عجز و انکسار کا مظاہرہ کرتے

تھے۔فخر الاسلام محمد بن احمد شاشی کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ مدرسہ نظامیہ بغدادیہ میں مدرس مقرر ہوگئے اور جس دن مسند تدریس پر وہ رونق افروز ہوئے تو ان پر بے اختیار رقت طاری ہوگئی وہ سابق استادوں کے علم وفضل اور اپنی کم علمی کو یاد کرتے تھے اور یہ شعر پڑھتے تھے

خلت الدیار فسدت غیر مسود
ومن الشقاء تفردی بالسودد

ملک بزرگوں سے خالی ہوگیا تب میں سردار بن گیا میرا سردار بننا دراصل ملک کی بدبختی ہے۔

# بزرگوں کے نصیحت آموز واقعات

## باہمی تعلقات

استاد کی طالب علموں پر شفقت اور خلوص اس تعلق کو اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ شاید ماں باپ کے ساتھ بچوں کو اتنا تعلق نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اسلاف میں اس کی شاندار مثالیں موجود ہیں کہ طلبہ کو بے لوث اور تعصبات سے پاک تعلیم دیتے رہے' اور روزگار کا سلسلہ کسی دوسرے شعبہ سے وابستہ رکھا۔ اس ضمن میں اسلاف کے خلوص کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

☆ ایک دن شیخ محمد ابراہیم قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ نے ایک خط لکھا اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی خادم خاص نظر پڑے تو اس سے ڈاک میں ڈلوایا جائے کسی مستفید شاگرد نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا: ''لایئے یہ خط میں ڈال آؤں'' اور بے حد اصرار کیا' حضرت نے فرمایا: ''میں تم سے یہ کام نہیں لینا چاہتا کیونکہ تمہارا تعلق میرے ساتھ تعلیم کا ہے' میرا حق استادی سمجھ کر یہ خط ڈاک میں ڈالو گے' میرے نزدیک یہ بھی ایک گونہ رشوت ہے' اس کے بعد لوجہ اللہ تعلیم کا خلوص باقی نہ رہے گا لہٰذا میں تم سے یہ معمولی کام لے کر اپنا ثواب کیوں ضائع کروں''۔

(تذکرہ رحمانیہ)

☆ قاری عبدالرحمٰن صاحب کے پاس ایک شیعہ کسی خاص فن کی کتاب پڑھا کرتے تھے' مضمون سے ان کو چونکہ زیادہ دلچسپی تھی اس لئے چاہا کہ وقت ذرا زیادہ ہو جائے لیکن حضرت قاری صاحب عدم گنجائش کی وجہ سے راضی نہ ہوئے' ان شیعہ

صاحب کو خیال ہوا کہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے غالباً یہ بے اعتنائی برتی گئی' یہی خیال کر کے انہوں نے عرض کیا کہ ''اگر میں شیعیت ترک کر دوں اور سنّی ہو جاؤں تو پھر تو آپ پوری توجہ کے ساتھ وقت دیں گے'' حضرت نے ان کی زبان سے یہ سن کر فرمایا: ''تم مذہب تبدیل کر دو یا نہ کرو میری توجہ علم کے لئے ویسی ہی رہے گی اس میں بال برابر فرق نہیں آ سکتا''۔

☆ مولانا فضل حق خیرآبادی جو مولانا فضل امام کے صاحبزادے ہیں' جوان تھے اور اپنے والد کے ساتھ خود بھی دلی میں درس دیتے تھے' جہاں مولانا فضل امام ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدر الصدور تھے' ایک طالب علم مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا' انہوں نے مولوی فضل حق صاحب کے پاس اس کو بھیج دیا کہ مجھے فرصت نہیں تم ہی پڑھا دیا کرو۔ یہ طالب علم بیچارا کچھ غبی تھا' مولوی فضل حق صاحب کی جوانی کا زمانہ' چند اسباق کے بعد ان کا جی اکتا گیا' ایک دن پڑھاتے ہوئے کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا' طالب علم مولانا فضل امام کے پاس پہنچا اور حال بیان کیا' یہی سننے کی بات ہے' مولانا فضل امام آپے سے باہر ہو گئے' مولوی فضل حق کو اسی وقت طلب کیا' طلبی کا فقرہ تھا ''بلاؤ اس خبیث کو'' جوان عالم بیٹا ہے' لیکن ایک طالب علم کی تحقیر کی ہے۔ مولوی فضل حق سامنے آتے ہیں' لکھا ہے کہ بے تحاشا ایک تھپڑ مولوی فضل امام نے رسید کیا' پگڑی دور جا پڑی' اور فرماتے جاتے تھے تو طلبہ کی قدر کیا جانے؟ بسم اللہ کے گنبد میں پلا ہے' خبردار! میرے طالب علموں کو اگر کچھ کہا۔ (تذکرہ غوثیہ)

☆ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار تھے' ایک زمانہ تک ان کا قیام الٰہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں رہا بعض واقعات پیش آئے کہ الٰہ آباد سے منتقل ہو کر آپ اپنے وطن صوبۂ بہار چلے آئے اور گیا کو مستقر قرار دیا' طلبہ کا بھی ایک بڑا مجمع آپ کے ساتھ مدرسہ سبحانیہ چھوڑ کر گیا پہنچ گیا' بے سروسامانی کے

حال میں آئے تھے' کوئی انتظام معقول شروع میں نہ ہو سکا' یہاں سب سے اہم مسئلہ طعام کا تھا جس کا حل یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور اسی سے قوت لایموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا' اس کو سُرخ مرچ کے بُھرتے کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی اور اُس میں نمک ملا لیا جاتا تھا' مولانا ایک دسترخوان پر بلا تکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر دہی کھانا کھا لیتے تھے اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن بھی نہیں پڑتی تھی۔ (حیاتِ سجاد)

☆ مولانا برکات احمد ٹونکیؒ طبیب تھے اور اسی سے اپنا روزگار چلاتے تھے' ساٹھ ساتھ دس بیس طالب علموں کو کھانا دے کر پڑھاتے رہے' اس راہ میں وقت' مال' دل' دماغ کی جو قربانیاں حکیم صاحب کو دینا پڑیں ان سے وہ یا ان کے خدا ہی واقف ہیں' لیکن اس پرخلوص تعلیم کا اثر کیا تھا کہ کوئی طالب علم حضرت سے رخصت ہوا ہو اور بچوں کی طرح بلک بلک کر نہ رویا ہو۔

☆ وقت کی پابندی اور اس میں استقامت اس قدر تھی کہ مولانا برکات احمد بجز کسی شدید ارضی وسماوی آفت یا حادثہ کے کبھی غیر حاضری نہ کرتے' جون کے مہینوں میں بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوتے تھے' گرمی اور تپش راجپوتانہ کی تھی' مدرسہ دو میل ہے' گرمی ہو یا سردی دن میں دو دفعہ آ رہے ہیں جا رہے ہیں' صرف اسی قدر نہیں بلکہ اندھیرے منہ گھر سے نکل آتے اور مدرسہ پہنچ کر چراغ کی روشنی میں ایک ایک جز لکھ ڈالتے۔ گویا رات کافی باقی رہتی ہو گی' دو میل چلنا اور پھر ایک جزء کا چراغ ہی کی روشنی میں نقل کرنا معمولی قلیل وقت میں ممکن نہیں۔

☆ قاری عبدالرحمٰن کی سوانح عمری میں یہ واقعہ درج ہے کہ جن دنوں قاری صاحب شاہ اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھتے تھے' ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور قاری صاحب قیام گاہ کی دوری کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے جو طلبہ حاضر تھے

انہوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ اس بارش میں قاری صاحب کا اتنے طول طویل فاصلہ سے آنا ممکن نہیں اس لئے سبق شروع کرادیا جائے' شاہ صاحب نے فرمایا ''ابھی ٹھہرو وہ ضرور آئیں گے'' یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اس برستے ہوئے پانی میں دیکھا جاتا ہے کہ پائنچے چڑھائے اور کتاب ایک گھڑے میں بہ حفاظت بند کئے قاری صاحب آرہے ہیں' شاہ صاحب نے طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا لو دیکھو میں نے کیا کہا تھا' وہ قاری صاحب آ گئے' آؤ اب سبق پڑھو''۔

(تذکرہ رحمانیہ)

☆ طلبہ اور اساتذہ کے انبساطی تعلقات کے ضمن میں ملا عبدالنبی نے اپنے متعلق لکھا ہے احمد نظام شاہ بحری کا ایک باغ تھا جس کا نام فیض بخش تھا' باغ کے بیچ میں ایک عظیم ساگر بنایا گیا تھا اور اسی ساگر کے بیچوں بیچ میں عمارت پختہ دومنزلہ بادشاہ نے بنوائی تھی' چاروں طرف پانی اور بیچ میں اس قصر شاہی کا ہونا جو دلکشی پیدا کرسکتا ہے ظاہر ہے۔ ملا عبدالنبی اسی تالاب میں طلبہ کے ساتھ مچھلی کے شکار کے لئے آتے تھے' مولانا کو مدرسہ نظامیہ کے طلبہ سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ سال میں دوتین مرتبہ تمام طلبہ کو کسی باغ یا تفریح گاہ میں لے جاتے' دوتین روز قیام فرماتے وہاں ان سے تقریریں' مناظرے' بیت بازی کے مقابلے کراتے' طلبہ جب ان سے تھک جاتے تو تھوڑی دیر ان کو کھیلنے کی اجازت دیتے۔ نواب فضیلت جنگ اس زمانہ میں آصف شاہی حکومت کے وزیر مذہبی امور تھے لیکن عز وجاہ کے ان مدارج عالیہ پر پہنچ جانے کے باوجود بھی علم کی جو عظمت قلب مبارک میں تھی اس نے طلبہ سے زندگی بھر ان کو باندھے رکھا حتیٰ کہ ان ہی طالب علموں کے درمیان مدرسہ نظامیہ ہی کے صحن میں مدفون ہوئے۔

☆ حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: حضرت مدنی ؒ یوں تو سب ہی کے لئے ہمہ وقت سراپا شفقت و رحمت تھے

لیکن دورانِ درس یہ صفت اپنے منتہیٰ کو پہنچی ہوئی نظر آتی تھی، طلبہ کے لئے ان کے ہر جا وبے جا سوالات نیز بے تکے اعتراضات کے جوابات نہایت انبساط اور خندہ پیشانی کے ساتھ دیتے اور بیچ بیچ میں کبھی کبھی کسی خوش نصیب سے مزاح بھی فرما لیتے۔ خاص طور پر رات کے وقت سبق پڑھاتے ہوئے یہ وصف اتنا بڑھ جاتا کہ تھوڑے وقفہ کے بعد مجلس درس قہقہہ زار بن جاتی۔ خاص طور پر جب کسی طالب علم کے بارے حضرت کو مطلع کیا جاتا یا وہ خود دیکھ لیتے کہ فلاں طالب علم اونگھ یا سو رہا ہے، تو حضرت نہایت ظریفانہ انداز میں بآواز بلند اس طالب علم کا نام لے کر مخاطب فرماتے اور حکم دیتے کہ اٹھئے جائیے وضو کیجئے، اگر کوئی گہری نیند میں ہوتا تو اسے صدر النائمین جیسے القاب سے یاد کیا جاتا۔

☆ مولانا فضل الکریم شیخ الاسلام راوی ہیں کہ شدید گرمیوں کا زمانہ ہے، دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں اور حضرت شیخ مدنیؒ پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے باوجود دارالحدیث سے سبق پڑھا کر مکان پیدل واپس تشریف لے جا رہے ہیں، چھتری پیش کی جاتی ہے تو اس کو لینے سے انکار فرما دیتے ہیں، بارش کے زمانہ میں راستہ کیچڑ آلود ہوتا، آسمان سے ترشح ہو رہا ہے، لیکن حضرت دارالحدیث کی طرف جا رہے ہیں، کپڑے پر کیچڑ پڑ رہی ہے، اس کی جانب کوئی توجہ نہیں، ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں چھتری ہے، کس کی ہمت ہے کہ چھتری پکڑ سکے، سواری پیش کی جاتی ہے تو اس سے بھی انکار فرما دیتے ہیں، ناصر تانگہ والا تانگہ لے کر کھڑا ہے، طلبہ گزارش کر رہے ہیں کہ راستہ کیچڑ آلود ہے، تانگہ پر تشریف رکھئے، مگر سنئے حضرت کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں کیچڑ سے ہم پیدا ہوئے، اگر اسی میں جا ملیں تو کیا ڈر ہے؟ ایک دن ناصر تانگہ والے کی برکت لینے کی تمنا اور طلبہ کے اصرار کو دیکھتے ہوئے مان گئے، لیکن دوسرے دن کہیں جانا تھا، ناصر تانگہ والا حاضر ہوا، تو اس کے تانگہ پر اس وقت سوار ہوئے جبکہ یہ شرط تسلیم کرالی

کہ وہ درس گاہ تک لے جانے کے لئے آئندہ کبھی نہ آئے گا۔ آخر جب کمزوری بہت زیادہ بڑھ گئی تو ایک دن مکان سے درس گاہ تک (جس کا فاصلہ تین چار سو قدم کے درمیان ہے) تشریف لا رہے تھے' راستے میں شمالی گیٹ پر ضعف کی وجہ سے دربانِ دارالعلوم کی نشست گاہ پر بیٹھ گئے' اسی واقعہ کے بعد ایکسرے کی غرض سے سہارنپور تشریف لے گئے وہاں سے واپس تشریف لانے کے بعد طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! کچھ دنوں کے لئے سبق موقوف فرمادیں تو آپ نے جواب دیا کہ ''لڑکوں کو شرارت سوجھتی رہتی ہے' یہ نہ پڑھنے کا بہانہ ہے' مجھے تو سبق پڑھانے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی' البتہ آنے جانے میں ذرا تکلیف ہوتی ہے''۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ حضرت! سواری کا انتظام قبول فرمائیے' تو فرمایا: ''ہاں یہاں تک آنے جانے کے لئے ہوائی جہاز کا انتظام کرلو'' یہ وہ دن تھا جس روز سول سرجن نے انتہائی تاکید کی تھی کہ رات کو درس نہ دیا جائے' حضرت شیخ نے ڈاکٹر کا مشورہ تو قبول فرمایا' مگر وہ اس طرح کہ بجائے شب کے نمازِ عصر کے بعد سلسلۂ درس شروع فرمادیا۔ (شیخ الاسلام نمبر' ص ۱۴۴)

## تدریس کا نظام الاوقات:

یہ علماء اساتذہ بیک وقت کئی کئی علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ امام شافعی جامعہ عمرو بن العاص فسطاط قاہرہ میں عرصہ دراز تک مختلف مضامین کی تعلیم دیتے رہے' ان کا دستور یہ تھا فجر کی نماز کے بعد وہ درس قرآن مجید دیتے تھے' دن چڑھے حدیث کا درس دیتے تھے' ظہر کی نماز کے بعد مذاکرہ اور مباحثہ (فقہ) شروع ہوجاتا تھا' مغرب کے بعد نحو' عروض اور فن شعر کا درس شروع ہوجاتا تھا' ہر درس میں شرکت کرنے کے لئے جداگانہ حلقہ حاضر ہوتا تھا۔ الکسائی (۳ء) میں مسجد میں مختلف مضامین کی تدریس کے حلقے قائم کرتا تھا۔

ہندوستان میں صدر المدرسین شاہ محمد اسحاق' نواسہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کا نظام

الاوقات تذکرہ نگاروں نے اس طرح بیان کیا ہے شاہ صاحب فجر کی نماز کے فوراً بعد گھر کے اندر لڑکیوں کو تعلیم دیتے تھے' دوپہر کے بعد قیلولہ اور نماز کا وقت تھا' ظہر کے بعد پھر تدریس کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا جو عصر کی نماز بلکہ مغرب کی نماز تک جاری رہتا تھا' مغرب کے بعد درون خانہ تشریف لے جاتے تھے' کھانے کا وقت تھا' تھوڑی دیر بعد پھر باہر آ جاتے تھے عشاء تک درس جاری رہتا تھا عشاء کے بعد پھر وہ گھر میں جاتے تھے۔

مولوی رجمان علی مصنف تذکرۃ العلماء ہند لکھتے ہیں کہ جب مجھے مولانا فضل حق خیر آبادی سے لکھنؤ میں شرف زیارت حاصل ہوا تو اس وقت وہ حقہ پی رہے تھے' ساتھ ہی وہ شطرنج بھی کھیل رہے تھے اور پاس ہی ایک طالب علم بیٹھا ہوا جس کو فلسفہ کی ایک کتاب ''افق المبین'' کا درس بھی دے رہے تھے اور مطالب بڑی خوبی سے سمجھا رہے تھے تینوں کام بیک وقت انجام دے رہے تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی خواجہ الطاف حسین حالیؒ کے استاد کا معمول تھا کہ وہ نماز فجر کے ساتھ ہی درس شروع کر دیتے تھے اور مسلسل عصر تک اور بعض اوقات مغرب تک درس جاری رہتا تھا' کبھی دوپہر آرام کرنے کا موقع ملتا تھا اور کبھی نہیں' ہر فن (مضمون) پر کامل عبور تھا اس لئے ہر قسم کے طلبہ درس کے لئے آتے رہتے تھے' ساری زندگی ۲۵ روپے ماہوار مشاہرہ پر مدرسہ عربیہ گنبدان پانی پت میں گزار دی اور سیکڑوں روپیہ کی پیش کش ٹھکرا دی۔

## تدریس میں مستقل مزاجی:

یہ بزرگ اساتذہ بڑی مستقل مزاجی سے اور دل جمعی کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے تھے' تدریس کو تمام دوسرے کاموں سے افضل سمجھتے تھے۔ امام مالک نے تیس مرتبہ اپنی کتاب موطا کا طالب علموں کو درس دیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تیس سال تک وہ درس دیتے رہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے تیس سال تک جامعہ مسجد کوفہ

میں درس دیا' مرتے دم تک وہ درس دیتے رہے۔ امام غزالی (۵۵۔۴۵) نے مدرسہ نظامیہ بغدادیہ سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن نیشاپور میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کردیا' یہاں دن رات کی ان کی مشغولیت یہ تھی کہ یا تو طالب علموں کو درس دیتے تھے یا عبادت کرتے تھے۔ عبدالسلام لاہوری نے ۱۳۷ سال کی عمر میں انتقال کیا ہے انہوں نے ۶۰ سال مسلسل درس دیا۔ شیخ علی متقی برہان پوری (۹۶۳ھ) نے ۲۶ سال تک حرم کعبہ میں بیٹھ کر درس حدیث دیا ہے متاثرین میں شیخ محمود الحسن (۱۹۴۰ء) دیوبندی نے ۴۴ سال تک مدرسہ دیوبندی میں مسلسل درس دیا ہے۔

## تدریس اور سرکاری ملازمت:

اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے اور سرکاری ذمہ داریاں سنبھالنے کے باوجود علماء بدستور تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے' کسی حال میں اشاعت علم سے دست کش نہیں ہوتے تھے۔ اشاعت علم سے دست کش ہونے والوں کے متعلق جو وعیدیں احادیث میں مروی ہیں وہ ان لوگوں کو مضطرب رکھتی تھیں' اس لئے جس حال میں بھی انہیں موقع ملتا تھا' یہ طلبہ کو درس دینا شروع کردیتے تھے۔

حکیم بوعلی سینا شمس الدولہ کے عہد میں وزارت کے مُنصب پر فائز تھا' دن میں اسے موقع نہیں ملتا تھا'۔ لیکن رات کو وہ درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھتا تھا' طالب علموں کو الشفاء اور القانون کا درس دیتا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی باوجود اپنی گونا گوں مشغولیتوں کے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو خود تعلیم دیتا تھا۔

نظام الملک طوسی (۴۸۵۔۴۸) سلاجقہ عظام کا وزیراعظم تھا' وزارت کے باوجود وہ بغداد اور نیشاپور دونوں جگہ مسجد میں درس حدیث دیتا تھا' بڑے بڑے علماء اس کے درس میں شریک ہوتے تھے۔

اکبر بادشاہ کا سمدھی مرزا قلیچ بیگ لاہور کا گورنر تھا' وہ روزانہ تدریس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا' طلوع آفتاب سے لے کر اڑھائی گھنٹے دن تک وہ طلبہ کو

اپنے گھر پر تفسیر' حدیث اور فقہ کی تعلیم دیتا تھا' اس کے بعد وہ کچہری جاتا تھا۔

مغل امراء اور منصب داروں کی یہ روایت انگریزی حکومت کے آغاز تک باقی رہی۔ شاہ الفت حسین عظیم آبادی نوابان مرشد آباد کی جانب سے انگریز لارڈ ایلن بارد اور لارڈ ہارڈنگ کا زمانہ دیکھا وہ دفتر جانے سے قبل دو ڈھائی گھنٹہ تک گھر میں پہلے طلبہ کو تعلیم دیتے تھے پھر دفتر جاتے تھے۔

## جیل خانے میں تدریس:

انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں بھی وہ تدریس کے فرائض سے دست کش نہیں ہوتے تھے۔ احمد بن طولون والی مصر کا امیر الموفق سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ سلطان احمد نے وقت کے نامور خطیب اور عالم بکار بن قتیبہ سے کہا کہ وہ خطبہ میں الموفق پر لعنت بھیجے مگر بکار نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا' ابن طولون نے اس کو جیل خانہ میں ڈال دیا' دو سال تک وہ جیل میں بند رہے اس دوران میں تدریس کا مشغلہ بدستور جاری رہا' جیل کی دیوار میں ایک اچھا خاصا سوراخ تھا۔ طلبہ باہر اس سوراخ کے گرد بیٹھ جاتے تھے اور بکار اندر سے درس دیتے تھے۔ شمس الائمہ محمد بن سہل سرخسی بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ قراخانی بادشاہ کسی مسئلہ پر ان سے ناراض ہو گیا فرغانہ کے قریب اور جند کے ایک اندھے کنوئیں میں ان کو مقید کر دیا۔ دس بارہ سال تک وہ اس حال میں رہے' اس حال میں انہوں نے تدریس کا کام جاری رکھا شوقین طلبہ کنوئیں کی منڈیر پر آ کر بیٹھ جاتے تھے استاد کنوئیں کے اندر سے حافظہ سے ان کو پڑھاتے تھے اور املا کراتے تھے یعنی لیکچر دیتے تھے۔

## ناسازگار حالت میں تدریس:

۱۸۶۸ء کے مقدمات بغاوت کے بعد صادق پور پٹنہ کے خاندان کے ایک عالم دین ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی پکڑ دھکڑ سے بچ کر نیپال چلے گئے تھے' وہاں

انہوں نے ایک قطعہ اراضی صاف کیا تا کہ کاشت کریں اور رزق حلال کھائیں' وہ کاشت اس طرح کرتے تھے کہ بیل کی جوڑی سامنے ہے ہل پر ہاتھ ہے' گلے میں غلیل لٹکی ہوئی ہے کہ اگر فرنگی نظر پڑا تو غلہ مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دیں' مگر اس حال میں بھی فرائض تدریس سے غافل نہیں' ایک طالب علم مشکوٰۃ شریف کھولے ہل کے برابر ساتھ ساتھ چلتا رہتا تھا' اس حال میں بھی حدیث کا درس جاری رہتا تھا۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے برسر اقتدار آ کر ۱۹۲۴ء میں ترکی میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا' تمام مدارس بند کر دیئے' عربی زبان کی تعلیم و تدریس ممنوع قرار دے دی' علماء پر سخت تشدد کا دور تھا لیکن علماء خاص طور پر استاد بدیع الزمان سعید نورسی کے شاگرد ''طلاب نور'' اس حال میں بھی کسی نہ کسی طرح دینی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے رہے انہوں نے زمین دوز تہہ خانوں میں مدرسے جاری کئے تہ خانے کے دونوں جانب دروازے ہوتے تھے' دروازوں کے پاس موچی یا درزی کو بٹھائے رکھتے تھے' جو اپنے کام میں مشغول رہتا تھا' پولیس کے سپاہیوں کو وہ آتا دیکھتا تھا تو اندر اطلاع کر دیتا تھا' استاد اور طلبہ مخالف دروازے سے فرار ہو جاتے تھے۔

تیس سال تک دور ابتلاء میں ان علماء اساتذہ نے جان کی بازی لگا کر دینی تعلیم کا تسلسل باقی رکھا۔ اس میں انحطاط واقع نہیں ہونے دیا۔ جب ۱۹۵۲ء میں عدنان مندریس انتخابات میں کامیاب ہوئے تب نئی حکومت نے دینی مدارس کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

## سخت سیاسی انتشار کی حالت میں بھی ناغہ نہیں

عجیب آہنی عزم کے حامل تھے یہ لوگ جو سخت سیاسی انتشار کی حالت میں بھی فرائض تدریس سے غافل نہیں ہوتے تھے' درس میں کسی صورت میں ناغہ نہیں کرتے تھے۔ ہلاکو خان نے ۶۵۷ھ میں عروس البلاد بغداد کو تباہ و غارت کر دیا۔ بنی عباس کی

عظمت کو پیروں تلے روند ڈالا ہفتوں قتل عام اور آتش زنی کا بازار گرم رہا' اہل بغداد کے سر پر ایک قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی جب قدرے امن و امان قائم ہوا تو ہلاکو خان اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کر اجڑے شہر کی سیر کو نکلا اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی' جب اس نے دیکھا کہ مدرسہ مستنصریہ بغداد میں حسب سابق مسند تدریس بچھی ہوئی ہے' استاد اور شاگرد درس و تدریس میں مشغول ہیں۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانہ میں دہلی حملہ آوروں کی لوٹ مار کا ہدف بنا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں اس اجڑی دہلی کے مدرسہ رحیمیہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اپنے فاضل باپ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مسند تدریس پر متمکن تھے۔ ۶ سال تک ان سیاسی ہنگاموں کے دوران ان کے مدرسہ میں حسب سابق درس و تدریس کا مشغلہ جاری رہا ایک دن کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔

ان کے بعد دہلی میں مسند تدریس کو میاں جی نذیر حسین متوفی ۱۹۰۲ نے سنبھالا وہ بھی ۶ سال تک درس دیتے رہے حتیٰ کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھی ان کا درس جاری رہتا تھا۔ محمد اشرف سندھو لکھتے ہیں کہ بعض اوقات یہ حالت ہوتی تھی کہ توپ کے گولے صحن میں آ کر گرتے تھے۔ مصداق آیۂ کریمہ الا ان اولیاء اللہ لا خوف ولا ھم یحزنون۔

## مرتے دم تک تدریس:

صیمری نے لکھا ہے کہ ابراہیم بن الجراح قاضی ابو یوسف (۱۸۳ھ) کی عیادت کرنے ان کے گھر گئے' اس وقت مرض میں ذرا افاقہ تھا' قاضی صاحب نے آنکھیں کھول دیں پھر انہوں نے ابراہیم سے دریافت کیا رمی جمار میں افضل صورت کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا پھر خود ہی ان کو مسئلہ سمجھایا جو شخص قیام کرنا چاہے' وہ پا پیادہ رمی جمار کرے لیکن جو شخص قیام نہ کرنا چاہے وہ سواری پر رمی جمار کر سکتا ہے ابراہیم تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر رخصت ہوئے' تھوڑی دور چلنے کے بعد انہوں نے

رونے کی آواز سنی وہ واپس پلٹ کر آئے معلوم ہوا کہ امام ابو یوسف اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

## تدریس کے لئے جگہ کی قید نہیں تھی:

یہ بزرگ اساتذہ رسمیات سے بے نیاز تھے مسجد' مدرسہ' گھر' دکان' کارخانہ حتیٰ کہ راستہ میں بیٹھ کر بھی تدریس شروع کر دیتے تھے' حافظ عثمان خط نسخ کا امام گزرا ہے خلافت عثمانیہ ترکی میں اس سے بڑا خطاط نہیں گزرا وہ سلطان احمد خان ثالث اور سلطان مصطفیٰ خاں ثانی کا استاد تھا کہ غریب بچوں کو دیکھتا اور وہیں راستہ میں زمین پر ان کو خط کی تعلیم دینا شروع کر دیتا تھا اس میں قطعاً کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔

## تدریس میں درجہ بندی نہیں:

ان اساتذہ کا ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ یہ کسی طالب علم کو انکار نہیں کرتے تھے اس معاملہ میں وہ نہ علم کی تفریق کے قائل تھے نہ طلبہ کے درمیان کسی درجہ بندی کے قائل تھے ایک استاد بیک وقت اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کو بھی پڑھاتا تھا اور ادنیٰ تعلیم کے طلبہ کو بھی پڑھاتا تھا۔ امیر فتح اللہ شیرازی ۹۹۹ھ میں اکبر بادشاہ کا وزیر تھا' اس نے ہندوستان کی مساعت کرائی تھی' اور مال گزاری کا ایک جامع نظام نافذ کیا تھا جس کو بڑی حد تک انگریزی حکومت نے بھی برقرار رکھا' سرکاری ذمہ داریوں کے ساتھ وہ تدریس کے لئے وقت نکال لیتا تھا مگر خاص بات یہ ہے کہ جس شوق سے بڑے طلبہ کو فلسفہ کی مشکل کتابیں پڑھاتا تھا اسی دلچسپی سے بالکل چھوٹے بچوں کو قاعدہ بغدادی شروع کراتا تھا۔

## تعلیمی سفر:

مشہور عالم قاموس اللغات کے مصنف مجد الدین فیروز آبادی شاگرد ابن تیمیہ سفر پر رہتے تھے اور ان کی کتابیں اونٹوں پر لادی ساتھ سفر کرتی تھیں۔ پہلے وہ تیمور

کے دربار سمرقند گئے پھر بازید یلدرم کے پاس قسطنطنیہ گئے پھر محمد شاہ تغلق کے پاس دہلی آئے اور آخری عمر میں یمن کے قاضی بن گئے۔ سندھی عالم علی بن محمد جھونسوی بھکر (سکھر) میں پیدا ہوئے وہاں سے ملتان گئے شیخ ابوالفتح رکن الدین سے فیض صحبت پایا' وہاں سے بہار گئے شیخ منہاج کے پاس ۱۲سال تک رہے پھر شیخو پورہ میں ۲ سال رہے' پھر وہاں سے الہ آباد گئے ان کے ہاتھ پر کثیر تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے ساری زندگی سیاحت میں گزاردی۔

## ترک تدریس پر ملامت:

جو کوئی شخص درس و تدریس کا کام ترک کر دیتا تھا' اس کے اس فعل کو قابل مذمت سمجھا جاتا تھا لوگ اس کی تنقیص کرتے تھے اسماعیل بن علیہ نے تدریس کا کام ترک کر دیا اور سرکاری ملازمت قبول کر لی وہ تحصیل دار مقرر ہو گئے ان کے اس فعل پر امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور امام بخاریؒ کے استاد عبداللہ بن مبارکؒ نے ان کی مذمت کی ہے۔

① علم کو باز بنا کر غریبوں کا مال شکار کرنے والے۔
② دنیا اور اس کی لذتوں کے لئے تو نے ایسا حیلہ تراشا ہے جو سارے دین کو لے ڈوبے گا۔
③ محبت میں تو مجنوں (پاگل) بن گیا ہے حالانکہ کل تک تو جنون کی دوا تھا۔
④ ابن عون اور ابن سیرین سے وہ تیری روایتیں اب کہاں گئیں؟
⑤ وہ تیری علمی سرگرمیاں اور بادشاہوں کے آستانوں سے بیزاری اب کیا ہوئی؟
⑥ تو کہتا ہے میں مجبور ہو گیا ہوں' غلط' بلکہ علم کا گدھا دلدل میں پھنس گیا ہے۔
⑦ دین دے کر دنیا طلب نہ کرو گمراہ راہبوں کی طرح۔

## تعلیم کی اجرت:

تعلیم وتدریس کا معاوضہ لینے کے مسئلہ پر علمائے متقدمین کے درمیان اختلاف رہا ہے ایک گروہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تعلیم عبادت ہے اور عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے' اسی لئے جب نظام الملک طوسی نے ملک میں مدرسہ ہائے نظامیہ قائم کئے اور اساتذہ کے گراں قدر مشاہرے مقرر کئے تو ان علماء نے ان کی مخالفت کی علمائے ماوراء النہر (بخارا کے اطراف) نے ایک جلسہ منعقد کر کے اس فعل پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا تھا کہ اب علم کی تعلیم وتدریس میں اخلاص کا جذبہ ختم ہو گیا۔

دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تعلیم عبادت ضرور ہے مگر اس کی تحصیل ایک نظم کے تحت کی جاتی ہے' اب جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہے اور اپنا سارا وقت اس میں صرف کرتا ہے اس کی کفالت ضروری ہے ورنہ پھر کوئی بھی شخص نظم کی ذمہ داری نہیں سنبھالے گا اور نظم معطل ہو کر رہ جائے گا۔

اس گروہ کے علماء کے پیش نظر قرآن مجید کی یہ آیت رہی ہے: ﴿مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (نساء) ''جو کوئی مال دار ہو وہ تو پرہیزگاری سے کام لے اور جو کوئی غروب ہو تو وہ معروف طریقہ سے کھائے''۔ جو اساتذہ آسودہ حال یا صاحب ثروت ہوتے تھے وہ تو فی سبیل اللہ تعلیم دیتے تھے لیکن جو اساتذہ مفلس اور نادار ہوتے تھے' جن کے پاس کوئی دوسرا ذریعۂ معاش نہیں ہوتا تھا وہ بقدر ضرورت حق الخدمت کے طور پر معاوضہ لے لیتے تھے۔

مشہور فلسفی اور حکیم ابونصر فارابی سیف الدولہ حمدانی کے دربار سے وابستہ تھا' اس نے ہر قسم کے مالی انعامات اور امداد لینے سے انکار کر دیا تھا' وہ قوت لایموت کے لئے صرف چار درہم روزانہ لیا کرتا تھا۔

متاخرین علماء نے تغیر زمان اور اندیشۂ تعطل نظام دینی کے پیش نظر ہر قسم کی عبادت (اذان' امامت' تعلیم قرآن وفقہ وغیرہ) پر اجرت لینے کو جائز قرار دے

دیا ہے۔

**زہد واستغناء:**

اساتذہ کے استغناء کے واقعات سے اسلامی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ابوعبدالرحمٰن سلمی کی خدمت میں عمر بن حریث نے کچھ اونٹ بطور ہدیہ پیش کئے' انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ہم نے تمہارے لڑکے کو قرآن مجید پڑھایا ہے کتاب اللہ پر معاوضہ نہیں لیتے۔(ابن سعد) خلیل بن احمد فراہیدی نادرۂ روزگارہ شخصیت تھا وہ مختلف علوم کا مخترع تھا اس کے بہت سے شاگرد تھے مگر وہ ایک زاہد آدمی تھا استغناء اور توکل پر اس کا عمل تھا ایک دفعہ خراسان کے والی سلیمان بن مہلب نے اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے اہواز آنے کی دعوت دی' امیر کا قاصد خلیل سے جا کر ملا' خلیل نے قاصد کی سوکھی روٹیوں سے تواضع کی اور کہا میرے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جب تک مجھے سوکھی روٹی ملتی رہے گی مجھے سلیمان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔خلیل کے شاگرد نفر بن شمیل کا قول ہے ایک زمانہ خلیل کے علم کی وجہ سے روٹی کھا رہا ہے مگر وہ خود ایک جھونپڑی میں زندگی گزار رہا ہے۔مشہور عالم دین اور ماہر لسانیات ابوالبرکات انباری اگرچہ خود مفلس اور قلاش تھے' مگر شاگردوں کو بلا اجرت تعلیم دیتے تھے۔ابوبکر جورقی نیشاپوری نے ایک مرتبہ کہا تھا' میں نے تحصیل علم حدیث پر اگرچہ ایک لاکھ درہم صرف کئے ہیں' لیکن خود میں نے اس سے ایک درہم بھی نہیں کمایا۔

ہندوستان میں ٹونک کے نواب امیر خان نے ایک مرتبہ مولانا غلام علی نقشبندی دہلوی کی خدمت میں دو گاؤں بطور معافی عطا کئے مولانا کے پاس اس مضمون کا شاہی فرمان بھیج دیا' مولانا غلام علی نقشبندی نے اس فرمان کی پشت پر یہ فقرہ لکھ دیا اور اس کو واپس کر دیا۔

ما برائے فقر وقناعت نمی بریم با میر خان بگو کہ خداوند رزاق است

قناعت و استغنا کا ایک غیر معمولی واقعہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے ان کے استاد میر محمد طفیل بلگرامی بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک روز اپنے استاد میر سید مبارک محدث بلگرامی کی خدمت میں موجود تھے استاد وضو کرنے کے لئے اٹھے اور غش کھا کر گر گئے، میں نے ان کو اٹھایا پھر جب ہوش آیا تو بڑے اصرار سے میں نے دریافت کیا تو فرمایا کہ تین دن سے فاقہ ہے کوئی شے پیٹ میں نہیں گئی ہے میں فوراً اپنے گھر گیا اور ایک میٹھی شے تیار کرا کے لایا مجھ سے بہت خوش ہوئے مگر فرمایا: ''ہم فقیروں کی اصطلاح میں یہ طعام اشراف ہے (جس کی توقع قائم ہو جائے) فقہاء کے نزدیک اگر چہ اس کا کھانا جائز ہے مگر فقیروں کے نزدیک اس کا کھانا ناجائز ہے اس لئے میں نہیں کھاتا'' میں نے وہاں سے کھانا اٹھالیا اور گھر آ گیا تھوڑی دیر وقفہ کرنے کے بعد پھر وہی خوان ان کے سامنے لاکر رکھ دیا اور کہا اب یہ غیر متوقع طور پر آیا ہے اب یہ طعام اشراف نہیں ہے شیخ میری فراست پر بہت خوش ہوئے اور کھانا تناول فرمالیا۔

مسلمان اساتذہ کی یہ روایات انگریزی حکومت کے آغاز تک باقی تھیں۔ ۱۸۴۸ء میں انگریزوں نے پنجاب فتح کیا ہے یہاں کے نظام تعلیم کا جائزہ لینے کے لئے مسٹر آرنلڈ نے ۱۸۵۶ء میں ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ اس میں وہ لکھتا ہے: سکھ حکومت کے زمانہ میں شعبۂ تعلیم سے وابستہ تقریباً تمام ہی افراد مسلمان ہیں، مسلمان اساتذہ کی غالب اکثریت تدریس کے شغل کو عبادت سمجھ کر فی سبیل اللہ اختیار کئے ہوئے ہے وہ کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتے ہیں''۔

مولانا حمید الدین فراہی حیدر آباد دکن کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن ''پھریہ'' آ گئے تھے، یہاں سے وہ مدرسہ اصلاح سرائے میر میں تعلیم و تدریس کے لئے جاتے تھے جو ان کے گھر سے غالباً دس بارہ میل کے فاصلہ پر تھا، وہ کئی کئی روز یہاں قیام کرتے تھے وہ گھر سے کئی دن کا کھانا پکوا کر ساتھ لاتے تھے اور وہی کھاتے

تھے مدرسہ کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔

ڈاکٹر جسٹس سر شاہ سلمان جونپور (۱۹۴۱ء) ہندوستان کی سپریم کورٹ کے مسلمان جج تھے جہاں سے ان کو گراں قدر مشاہرہ ملتا تھا' وہ عربک کالج دہلی کی انتظامیہ کے صدر تھے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلز بھی مقرر ہو گئے تھے' انہوں نے علی گڑھ میں ہفتہ وار تعطیل جمعہ کی مقرر کی تھی' اتوار کی چھٹی کے دن وہ دہلی سے علی گڑھ آجاتے تھے۔ وہ اپنے فرائض بڑی باریک بینی سے انجام دیتے تھے اور حسبۃً اللہ انجام دیتے تھے۔

علی گڑھ اسٹیشن سے تانگہ میں بیٹھ کر وہ یونیورسٹی جاتے تھے کسی پروفیسر کی کار وہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ دن بھر کا کھانا ناشتہ دان میں اپنے ساتھ لاتے تھے' کسی پروفیسر کے ہاں کھانا نہیں کھاتے تھے ان کے جنازے میں جج وکلاء' مشاہیر اور عمائدین سلطنت کے علاوہ ایک اچھی خاصی تعداد ان بیوہ اور مساکین عورتوں کی تھی' جن کو شاہ صاحب ماہانہ تنخواہ دیا کرتے تھے اور ان کی موت سے ان غرباء کی روزی کا سلسلہ بند ہو گیا تھا شاہ صاحب تقویٰ اور پرہیز گاری میں اسلاف کا نمونہ تھے۔

## سیر چشمی وفیاضی:

جو اساتذہ صاحب ثروت ہوتے تھے وہ بڑے سیر چشم اور فیاض ہوتے تھے' وہ اپنے شاگردوں پر فراخ دلی سے خرچ کرتے تھے امام شافعی بیان کرتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم کے لئے عراق کی جانب روانہ ہوا اور امام مالک سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے مجھے پچاس دینار سرخ دیئے اس کے بعد سے امام مالک ہر سال امام شافعی کی تین ہزار دینار سے امداد فرمایا کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کا طرز عمل اپنے طلبہ کے ساتھ بہت مشہور ہے۔ مشہور فلسفی محمد شاہ تغلق کے استاد مولانا عضد الدین ایجی کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے ضعیف استاد کو چالیس لاکھ تنکہ زر بخش دیئے تھے۔

## طلبہ کے درمیان مساوات:

ان اساتذہ کی نگاہ میں ہر طالب علم یکساں قدر و قیمت کا حامل ہوتا تھا۔ طالب علموں کے درمیان وہ دولت یا حکومت کی بنا پر کسی تفریق کے قائل نہیں تھے۔ بنی عباس کے جلیل القدر خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک (۱۷۹ھ) سے گزارش کی کہ شہزادگان امین اور مامون کو گھر آ کر تعلیم دیں' امام مالک نے یہ درخواست رد کر دی فرمایا یہ علم کی توہین ہے کہ عالم چل کر متعلم کے گھر جائے۔

پھر خلیفہ نے دوسری درخواست کی کہ اچھا یہ لڑکے پڑھیں تو مسجد میں ہی' مگر آپ ان کو علیحدہ وقت دیں اور ان کو علیحدہ بٹھائیں امام مالک نے یہ درخواست بھی رد کر دی اور فرمایا میں تعلیم میں تفریق نہیں کر سکتا یہ سب کے ساتھ بیٹھیں اور سب کے ساتھ پڑھیں۔

گزشتہ صدی میں ہندوستان کے ایک عالم مولانا غلام احمد فروغی تجاردی بھوپالی اس طریقۂ کار پر سختی سے کاربند تھے۔ فروغی عربی' فارسی' ترکی کے زبردست عالم تھے' وسط ہند میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ وہ بھوپال کے مدرسہ سلیمان ہائی سکول میں ہیڈ مولوی تھے' وہ خود تو فقیر منش آدمی تھے مگر علم کی تحقیر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک مرتبہ نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال نے ولی عہد صاحبزادہ حمید اللہ خان کے ہمراہ اتالیق بنا کر ان کو علی گڑھ کالج میں بھیجنا چاہا انہوں نے انکار کر دیا اور کہا یہ علم کی توہین ہے۔ پھر صاحبزادہ جنرل عبید اللہ خان نے اپنے لڑکوں وحید الظفر خان اور سعید الظفر خان کی تعلیم کے لئے ان کو اپنے گھر بلایا انہوں نے محل میں جا کر پڑھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں علم کو فروخت نہیں کرتا۔

ان کے کثرت درس کا یہ حال ہوتا تھا کہ سکول جاتے اور آتے وقت طلبہ کے گروہ ساتھ ساتھ سبق پڑھتے چلتے تھے۔ ان کے والد کو ریاست کی جانب سے وظیفہ ملتا تھا وہ ان کو بھی جاری رہا' پھر ان کا اپنا مطب تھا' ساری زندگی اس پر قناعت کی' نہ

سکول سے تنخواہ لی اور نہ آخر میں پنشن لی۔

## طالب علم کی قدر:

علم کے طالبوں کی یہ اساتذہ دل سے قدر کرتے تھے۔اس کا اندازہ مولانا فضل امام خیرآبادی کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے ان کے فرزند فضل حق بڑے باپ کے بیٹے تھے' سب نے بڑے چاؤ اور شوق سے پڑھایا' چھوٹی سی عمر میں سر پر دستار فضیلت بندھ گئی باپ نے مسند تدریس پر بٹھا دیا' طلبہ کو پڑھانا شروع کر دیا' ایک بڑی عمر کا پٹھان طالب علم ان سے پڑھتا تھا' مگر وہ غبی اور کند ذہن تھا بڑی مشکل سے سبق کو سمجھتا تھا' مولانا کا عنفوان شباب تھا' تحمل اور بردباری کی کمی تھی ایک دن پڑھاتے پڑھاتے تنگ آکر غصہ میں کتاب اس کے سر پر دے ماری' وہ منہ بسورتا ہوا ان کے والد مولانا فضل امام کے پاس گیا اور شکایت کی' وہ سیدھے درس گاہ میں آئے اور بیٹے کے اس زور سے تھپڑ رسید کیا کہ دستار فضیلت دور جا کر گری اور غصہ میں فرمایا: تو تمام عمر بسم اللہ کے گند میں رہا' ناز ونعم میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی دی' اس نے خاطرداری سے پڑھایا طالب علم کی قدر تو کیا جانے؟ اگر مسافرت اختیار کرتا' بھیک مانگتا' مسجدوں میں قیام کرتا اور طالب علم بنتا تو تجھ کو حقیقت معلوم ہوتی طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔

## طلبہ پر شفقت:

اساتذہ طلبہ کی نہ صرف قدر کرتے تھے بلکہ ان کے حق میں بڑے شفیق اور مہربان ہوتے تھے' مصائب اور مشکلات میں ان کا سہارا بنتے تھے' ان کی ہر قسم کی معاونت کرتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ (۱۸۰ھ) امام ابو حنیفہؒ کے درس میں شریک ہوتے تھے' وہ ایک بیوہ ماں کے بیٹے تھے' ماں کا اصرار تھا کہ وہ محنت مزدوری کریں اور کچھ کما کر لائیں اور درس میں شریک نہ ہوں اس لئے وہ درس میں ناغہ سے شریک

ہوتے تھے استاد کو جب اصل صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے طالب علم کا اور ان کی والدہ کا وظیفہ مقرر کر دیا تا کہ وہ معاش کی جانب سے بے فکر ہو کر تحصیل علم میں مشغول رہیں۔ یہی وہ طالب علم تھے جو آگے چل کر بنی عباس کے جلیل القدر خلیفہ ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے' جن کے فتاوے ساری مملکت بنی عباس میں مراکش سے لے کر ملتان تک نافذ العمل ہوتے تھے۔

اسد بن فرات جو آگے چل کر جزیرہ صقلیہ میں گورنر بنے وہ امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے پاس مؤطا امام مالک پڑھنے کے لئے آئے' استاد کے پاس صرف عشاء کے بعد کا وقت تھا۔ نوجوان طالب علم سارے دن کا تھکا ہارا عشاء کے بعد استاد کے سامنے درس کے لئے بیٹھتا تھا' وہاں اس کو اکثر نیند آ جاتی تھی' شفیق استاد نے پانی کا گلاس اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ جب شاگرد کو نیند آئے تو وہ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار دیں اور اس کو ہوشیار کر کے پھر پڑھاتے تھے۔

ربیعہ بن سلیمان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام شافعی مسجد میں درس دے رہے تھے۔ وہاں دھوپ آ گئی' کسی نے ان کی توجہ اس دھوپ کی طرف دلائی' وہ وہاں سے ہٹ گئے اور یہ شعر پڑھا ۔

اهين لهم نفسی لا کرم مابهم
ولن تکرم النفس حتی لا تهينه

میں اپنے نفس کی اہانت کرتا ہوں تا کہ وہ عزت حاصل کریں' کسی نفس کو عزت حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ اس کی اہانت نہ کی جائے''۔

علماء فرنگی محل کے فاضل عالم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی مدرسہ عالیہ رامپور میں تدریس کے لئے گئے ان کی شہرت سن کر دور دراز علاقوں سے طلبہ رامپور پہنچ گئے' نواب رامپور مدرسہ کے اخراجات محدود رکھنا چاہتے تھے' وہ طلبہ کی کثرت کو ناپسند کرتے تھے' مولانا کو نواب صاحب کا رویہ ناگوار گزرا۔ وہ رامپور چھوڑ کر اپنے

طالب علموں کو ساتھ لے کر بہار' برودان' بنگلہ دیش چلے گئے منشی صدرالدین نے ان کو اپنے مدرسہ بلا لیا وہ اپنے ایک ہزار روپیہ کی تنخواہ کا بیشتر حصہ بھی طلبہ پر خرچ کر دیتے تھے' جب مفتی صدرالدین کا رویہ بھی بدلا ہوا پایا تو وہاں سے ہجرت کر کے نواب آرکاٹ مدراس کے پاس چلے گئے مگر ہر حال میں طالب علم ان کے ساتھ رہے۔

مولانا علی مدرس دہلی کالج بیمار طلبہ کی عیادت اور ان کی دلجوئی ان کے گھروں پر جا کر کرتے تھے۔ بیشتر طلبہ مسجد کے حجروں میں رہتے تھے اس زمانہ میں دارالاقامہ کا رواج نہ تھا' مولانا حجروں میں جا کر طلبہ کی مزاج پرسی کرتے تھے۔

حکیم برکات احمد ٹونکی کے یہاں بعض طلبہ کو کھانا بھی کھلایا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسی تنگی آئی کہ گھر کے اخراجات پورے کرنے مشکل ہو گئے' حکیم صاحب کی اہلیہ نے مخفی طور پر ایک لائق طالب علم کے ذریعہ اپنے سونے کے کنگن فروخت کروائے اور طلبہ کے اخراجات پورے کئے یہ معلوم نہیں بیگم صاحبہ نے یہ معاملہ حکیم صاحب کے علم کے بعد کیا یا بغیر علم کے کیا۔

## طالب علم سے لڑکی کی شادی:

بعض اساتذہ اپنے شاگردوں سے اس درجہ خوش ہوتے تھے کہ ان کو اپنی دامادی کے لئے قبول کر لیتے تھے اپنی لڑکی کی ان سے شادی کر دیتے تھے حضرت سعد بن میتب' سید التابعین تھے' ایک غریب طالب علم ابو وداع چند روز تک ان کے درس سے غیر حاضر رہا جب وہ دوبارہ آیا تو انہوں نے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا' ابو وداع نے جواب دیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا' اس وجہ سے حاضر نہ ہو سکا استاد نے تعزیت کی اور کہا مجھے اطلاع کیوں نہ دی گئی' میں بھی جنازہ میں شرکت کرتا' پھر تھوڑی دیر سوچ کر دریافت کیا کہا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے' ابو داع نے کہا میں کیسے شادی کر سکتا ہوں میری پونجی میں کل تین درہم ہیں۔

حضرت سعید بن میتبؒ نے اپنے غریب طالب علم سے اپنی لڑکی کی شادی کر

دی واضح رہے یہ وہی لڑکی ہے جس کے لئے وقت کے خلیفہ ولید بن عبدالملک کا پیغام آیا تھا مگر حضرت سعید نے اس کو رد کر دیا تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ دہلی میں ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ پیش آیا آغاز میں وہ کٹرہ پنجابیاں کی مسجد میں مولوی عبدالخالق سے تعلیم حاصل کرتے تھے' مولوی عبدالخالق کے بیٹے مولوی عبدالحامد تھے' اس وقت کے دستور کے مطابق مدرسہ کے طلبہ گھر گھر سے روٹیاں جمع کرتے تھے ڈپٹی نذیر احمد سب سے چھوٹے تھے اس لئے یہ گھر گھر جا کر روٹیاں لاتے تھے آگے وہ خود بیان کرتے ہیں '' حامد میاں کے یہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا اُدھر میں نے دروازہ میں قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے پکڑا جب تک سیروں مسالا مجھ سے نہ پسوا لیتی' گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی جہاں میں سست پڑا' وہیں اس نے انگلیوں پر بٹہ دے مارا بخدا جان ہی نکل جاتی تھی' مولوی صاحب چلتے چلتے تاکید کر دیتے کہ حامد میاں کے گھر ضرور جانا بہر حال اس مار دھاڑ میں روزانہ وہاں جانا ہوتا تھا ہر روز یہی مصیبت جھیلنی پڑی تھی تم سمجھے یہ لڑکی کون تھی؟ یہ وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں' مولوی عبدالخالق نے اپنی پوتی کی شادی مولوی نذیر احمد سے کر دی تھی۔

## وعظ و تلقین:

تعلیم و تدریس کے بعد دوسرا شعبہ جس کی ذمہ داری یہ علماء اور اساتذہ اٹھائے ہوئے تھے' وہ عوام مسلمانوں کی عمومی تعلیم اور عمومی ہدایت تھی۔ وارث انبیاء ہونے کے اعتبار سے وہ وعظ و نصیحت' تقریر و خطبات کے ذریعے عوام کو دین کی تعلیم دیتے تھے' وہ عوام کو عقائد' خانگی اور اجتماعی معاملات' اخلاق و کردار کی تعلیم دیتے تھے۔ لوگوں کو گنہگاری کی زندگی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دینی فریضہ ادا کرتے تھے۔ قرآن کی آیات احادیث رسول ﷺ حکایات صحابہؓ اور صلحا بیان کرتے تھے۔ عوام کے دلوں سے گناہ اور نافرمانی کا زنگ

دور کرتے تھے ان کو راہِ ہدایت کی تلقین کرتے تھے بسا اوقات غلط کار لوگوں کے دل ان کے مواعظ سن کر موم ہو جاتے تھے۔ وہ ان کے دست حق پرست پر توبہ کر لیتے تھے تائب اور نادم ہو کر از سر نو نیک زندگی کا آغاز کرتے تھے۔ مساجد کے منبر و محراب ان علماء کے دم سے آباد تھے ان کے خطبات عوام کے لئے باعث کشش ہوتے تھے۔

یہ علماء اور اساتذہ عوام الناس کے اندر زندگی گزارتے تھے عوام کے اندر پائی جانے والی ایک ایک خرابی سے واقف ہوتے تھے وہ ہر قسم کی خرابیوں کا سد باب کرتے تھے۔ اصلاح معاشرہ پر ان کی نگاہیں جمی رہتی تھی۔ باطل کے خلاف وہ نبرد آزما رہتے تھے علماء اور اساتذہ کا یہ طبقہ شر و فساد کی تمام قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا تھا نتائج اور عواقب سے بے نیاز باطل کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا تھا شر و فساد کی قوتیں ان کے نام سے کانپتی تھیں یہ استاد درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وعظ و نصیحت کا فریضہ ادا کرتے تھے۔

عبدالرحیم بن نباتہ فاروقی صلیبی دور کا مشہور واعظ اور خطیب تھا جس کے مواعظ کی بڑی دھوم تھی' اس نے لوگوں کے دلوں کو ہلا مارا تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی بغداد کی مسجد میں خطبہ دیتے تھے' شیخ کی زبان میں خداوند تعالیٰ نے عجیب تاثیر رکھی تھی اس لئے ہزاروں مسلمان تائب ہو کر پابند شرع بن جاتے تھے' ہزاروں یہود و نصاریٰ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے بنی عباس کے خلیفہ اور امراء ان کی سخت تنقیدوں سے لرزاں اور ترساں رہتے تھے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آغاز میں بڑے بڑے خطیب اور واعظ موجود تھے قاضی منہاج الدین سراج جرجانی مدرسہ مغربیہ اچ بہاولپور میں مدرس تھے پھر وہ دہلی چلے گئے امراء پر سخت تنقید کرتے تھے۔ ولی اللہ خاندان میں درس و تدریس کے ساتھ وعظ و تلقین کا سلسلہ بھی چلا آ رہا تھا سرسید احمد خان لکھتے ہیں: میں شاہ اسحٰق کے وعظ میں شریک ہوتا تھا باہر مردوں کا ہجوم ہوتا تھا زنان خانے میں عورتیں جمع

ہوتی تھیں' نہ ڈولیوں کا شمار ہوتا تھا نہ پالکیوں کا شاہی محلات کی بیگمات تک شریک ہوتی تھیں امراء کے یہاں سے کھانے کی دیگیں پک کر آتی تھیں' جو طلبہ میں اور عوام میں تقسیم ہوجاتی تھیں خود شاہ صاحب معمولی چپاتی اور شوربا گاڑھے کے دستر خوان پر رکھ کر کھاتے تھے۔ متاخرین میں مولانا اشرف علی تھانوی کے مواعظ بہت مشہور ہیں طبع ہوجانے کے بعد ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔

## کلمہ حق:

معاشرے میں برائیاں پروان چڑھنے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ شر اور فساد اخلاق کا حمایتی اور پشتیبان حکومت کے امراء اور خواص کا طبقہ بن جاتا ہے۔ طبقہ بالا کے ذریعہ یہ برائیاں معاشرے میں دور تک نفوذ کر جاتی ہیں چونکہ یہ طبقہ صاحب اقتدار ہوتا ہے اس لئے کوئی شخص ان کا احتساب کرنے اور مواخذہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا ہے۔

مگر اسلامی تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ہر دور میں اور ہر ملک میں ایسے علماء حق پرست پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے ہر قسم کے خطرات کو برداشت کر کے بے لاگ تنقید و احتساب کا فریضہ انجام دیا ہے' انہوں نے بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق ادا کیا ہے' ان بوریا نشین علماء کی آواز سے ایوانِ حکومت میں لرزہ پڑ جاتا تھا۔

حجاج بن یوسف کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ حطیط زیات کو بلا کر سوال کیا کہ تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں تجھ کو دشمن خدا خیال کرتا ہوں۔ حجاج نے دوسرا سوال کیا کہ امیر المؤمنین عبدالملک کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ حطیط نے جواب دیا خدا کا اصل دشمن تو وہی ہے تو تو اس کی ایک شاخ ہے۔ حجاج نے اُن کے قتل کا حکم دے دیا مگر انہوں نے مطلق پروا نہیں کی۔

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر اندلسی نے قرطبہ کے پاس خوبصورت شہر الزہراء تعمیر کرایا' وہ اس تعمیر میں اس قدر منہمک ہوگیا کہ مسلسل تین جمعہ تک جامع مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نہیں آیا چوتھے جمعہ کو جب وہ آیا تو قاضی نے مندرجہ ذیل آیت پڑھی:

﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ﴾ (شعراء)

''یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے''۔

اور پھر تقریر شروع کردی جس میں عمارتوں پر فضول خرچی کرنے پر سخت ترین الفاظ میں تنقید کی' بلکہ مذمت کی موت سے اور آخرت سے لوگوں کو ڈرایا اس تقریر سے سامعین کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں' خلیفہ پر بھی رقت طاری ہوگئی مگر اس کو یہ خیال ہوا کہ قاضی منذر نے براہ راست مجھ پر حملہ کیا ہے' گھر جا کر اپنے بیٹے الحکم سے اس نے کہا ''قاضی نے سب کے سامنے میری تذلیل کی ہے اب میں اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا بیٹے نے کہا یہ کون سا مشکل کام ہے آپ اس قاضی کو معزول کردیں اور دوسرا خطیب اس کی جگہ مقرر کردیں' خلیفہ نے جواب دیا نہیں قاضی منذر جیسے آدمی کو رکھنا ضروری ہے خواہ تم کو ولی عہدی سے معزول کرنا پڑے وہ ایسا آدمی ہے جو تم کو نفس کی گمراہیوں سے بچاتا ہے مجھے افسوس ہے کہ میری نماز جمعہ میں قاضی منذر جیسا متقی اور صاحب ورع آدمی میرا شفیع نہ ہو' اس کے بعد سے اس نے قاضی کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کردی۔

ایک موقع پر شعراء قصر الزہراء کی تعریف میں قصیدے پڑھ رہے تھے' ان کو سن کر قاضی نے فی البدیہہ یہ اشعار سنائے۔

اے قصر زہراء کے بانی تو اپنے اوقات کو اس میں غرق کئے ہوئے ہے کیا تو اس سے باز نہیں آتا واللہ اس کی رونق خوب ہے مگر اس کی خوبصورتی ایک دن فنا ہو جانے

والی ہے۔

ہلاکوخان جیسے ظالم ستمگر کے روبرو شیخ سعدی نے برملا کہا تھا ''گر ترا ظالم نہ گویم من ظالمم'' اگر میں تجھ کو ظالم نہ کہوں تو میں ظالم بن جاؤں گا۔

بغداد کو تباہ و غارت کرنے کے بعد تاتاری لشکر کیتو بغا کی سرکردگی میں مصر فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا ملک ظاہرالدین بیبرس نے عین حالات کے معرکہ میں تاتاری افواج کو شکست فاش دی جنگ سے قبل ایک مصری وفد تاتاری امیر سے گفت و شنید کرنے کے لئے تاتاری لشکر میں آیا۔ اس وفد میں دوسرے علمائے کرام کے ساتھ فاضل اجل امام تقی الدین ابن تیمیہ بھی تھے۔ جس وقت وفد وہاں پہنچا' تاتاری امیر کے لئے دستر خوان بچھایا جا چکا تھا۔ اس نے وفد کو بھی کھانے کی دعوت دی' سب لوگ شریک ہو گئے' مگر ابن تیمیہ نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تاتاری امیر نے دریافت کیا کہ یہ شخص کھانا کیوں نہیں کھا رہا ہے اس پر امام ابن تیمیہ نے جواب دیا اور ظالم کے سامنے کلمہ حق ادا کر دیا۔ انہوں نے کہا جس شخص کی گردن پر لاکھوں مسلمانوں کا خون ہے میں اس کے دستر خوان سے لقمہ نہیں کھا سکتا اس جواب سے وفد کے ارکان کو یقین ہو گیا تھا کہ بس اب ابن تیمیہ کی گردن ماردی جائے گی مگر معلوم نہیں اس منحنی شخص کی نحیف سی آواز میں کیا جلال تھا کہ تاتاری سردار نے گھور کر دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ

''ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے''۔

ہندوستان کے بادشاہ سلطان محمد تغلق نے فتوحات میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس ترنگ میں ایک دن شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ ''جب فیض خدا منقطع نہیں ہے تو فیض نبوت منقطع کیوں ہے اور اگر کوئی شخص آج دعویٰ نبوت کرے اور معجزہ بھی دکھا دے تو اس کی تصدیق کی جائے گی یا نہیں؟ اس نے یہ

گفتگو دربار کے عالم مولانا عماد غوری سے کی مولانا عماد غوری نے طیش میں آ کر کہا ''گوہ مخور'' پاخانہ مت کھا اگرچہ قاضی صاحب کی جان گئی مگر بادشاہ کو پھر کسی کے سامنے دوبارہ یہ جملہ کہنے کی ہمت نہ ہوسکی۔

ایک مرتبہ مشہور فاتح سلطان احمد شاہ ابدالی نے عید کی نماز مسجد وزیر خان لاہور میں ادا کی مولوی محمد رمضان نے نماز پڑھائی نماز کے بعد خطبہ میں مولوی رمضان نے احمد شاہ کو ''امام عادل'' کہا اور انگلی سے اس کی جانب اشارہ بھی کیا مسجد کے ایک کونہ میں مولوی محمد شہریار بیٹھے تھے جو مولوی محمد رمضان کے استاد تھے وہ کھڑے ہو گئے اور مولوی محمد رمضان سے کہنے لگے ''جس شخص کی وجہ سے لاہور اور دہلی کے درمیان ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہو گئے عورتیں بیوہ ہو گئیں' بچے یتیم ہو گئے' مکانات مسمار ہو گئے تو اس شخص کو امام عادل کہتا ہے کل قیامت میں خداوند تعالیٰ کو کیا منہ دکھائے گا''؟

خطاب تو اگرچہ مولوی رمضان سے تھا مگر اس کی براہِ راست زد احمد شاہ ابدالی پر پڑ رہی تھی یہ گفتگو سن کر بادشاہ مولوی محمد شہریار سے مخاطب ہوا۔ کیا آپ جانتے ہیں' میں کون ہوں؟ مولوی صاحب نے جواب دیا آپ احمد شاہ ابدالی ہیں اور پھر فرمایا میں نے بچپن میں چار باتوں کی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی حفظ قرآن مجید' تحصیل علم دین' حج بیت اللہ شریف اور شہادت فی سبیل اللہ تین سعادتیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل کر چکا ہوں شاید آج چوتھی سعادت کے حصول کا دن ہے' بادشاہ یہ ساری گفتگو سن کر دم بخود رہ گیا آخر میں اس نے مولوی صاحب کو جالندھر میں جلاوطن کر دیا۔

ایبٹ آباد کے ایک جلسہ میں غلام محمد گورنر جنرل پاکستان تقریر کر رہا تھا' خطیب شہر مولانا محمد اسحاق ہزاروی بھی وہاں موجود تھے تقریر انگریزی میں ہو رہی تھی جو مولانا کی سمجھ سے باہر تھی' مگر ملا ملا کے الفاظ سمجھ میں آ رہے تھے اس پر مولانا نے اپنی چھڑی کو زور سے زمین پر مارا اور چلا کر کہا علماء کے متعلق کچھ کہنا ہے تو اردو میں کہو تا

کہ اس کا جواب بھی دیا جا سکے اور آپ کی تقریر کا جواب ان شاء اللہ آئندہ جمعہ کو خطبہ میں دوں گا یہ کہہ کر مولانا درمیان سے اٹھ کر چلے آئے سب لوگ مولانا کی جرأت پر حیرت کرتے رہ گئے غلام محمد اگرچہ تندخو آدمی تھا مگر وہ بھی مرعوب ہو گیا اور کچھ نہ کر سکا اللہ کے بندوں سے خدا کی زمین خالی نہیں رہتی۔

مسلمان معاشرہ میں عوام کے حقوق کے محافظ علماء اور اساتذہ ہوتے تھے' خطرات اور مصائب سے بے نیاز ہو کر یہ عوام کے حقوق کے لئے لڑتے تھے۔

## مفادشریعت کا تحفظ:

یہ علماء اور اساتذہ ملکی سیاست سے عام طور پر کنارہ کش رہتے تھے' بادشاہوں کی آپس کی چپقلش اور اکھاڑ پچھاڑ سے دور رہتے تھے۔ دارالسلطنت میں بادشاہتوں کی تبدیلی ہوتی رہتی تھی مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا یہ بدستور اپنے فرائض دیار و امصار میں انجام دیتے رہتے تھے۔

مملکت کا قانون شریعت اسلامی تھا' قانون کی تعبیر' تشریح اور تفہیم علمائے کرام کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ نافذ اس کو بادشاہ اور امراء کرتے تھے۔ قانون میں وہ کوئی تغیر یا تبدیلی لانے کے مجاز نہیں تھے۔ اسی طرح مملکت میں نافذ نظام تعلیم و تربیت خالصتاً استادوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا بادشاہ امراء اور اہل خیر حضرات خیرات' صدقات عطیات سے مدارس کی مالی امداد ضرور کرتے تھے مگر نصاب تعلیم' نظم مدرسہ' تقرر اساتذہ ان میں سے کسی کام میں ان کو دخل نہیں تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر بادشاہتوں کی تبدیلی کے باوجود نفاذ شریعت کا کام بدستور جاری رہتا تھا' مفاد شریعت کا تحفظ ہوتا رہتا تھا' سیاسی تبدیلیوں کا اثر دینی اداروں پر نہیں پڑتا تھا مسلمان معاشرہ کا استحکام علماء اور اساتذہ کی ذات سے قائم تھا۔

علماء کو ہر دم مفاد شریعت کا خیال رہتا تھا وہ خود کو دین محمدی اور شریعت اسلامیہ کا محافظ سمجھتے تھے اس معاملہ میں وہ خوف اور لالچ دونوں سے بے نیاز تھے طیش میں آ کر

وہ کوئی ایسا اقدام کرنے سے گریز کرتے تھے، جس سے بالآخر شریعت کے مفاد کو نقصان پہنچ جائے۔ مغل حکومت کے آخری زمانہ میں اخلاقی زوال پوری طرح چھا چکا تھا نہ سابقہ نظم وضبط رہا تھا نہ سنجیدگی اور متانت رہی تھی تخت حکومت پر محمد شاہ رنگیلا بیٹھا ہوا تھا، ہر طرح کی اخلاقی گراوٹ عام تھی دربار حکومت میں ڈوم، میراثی، سفلہ لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا، شریعت اور ثقہ لوگوں کا وہاں مذاق اڑایا جاتا تھا قاضی القضاۃ بھی ان کے مذاق سے نہیں بچتا تھا، کبھی ان کی داڑھی کا مذاق اڑایا جاتا تھا، کبھی ان کے شملہ کا مذاق اڑایا جاتا تھا دربار کے ایک امیر کو قاضی کی یہ توہین ناگوار گزری اس نے ایک دن قاضی صاحب سے کہا "آپ کیوں دربار میں آتے ہیں، کیوں ان سے اپنی بے عزتی کراتے ہیں، کیا آپ کے گھر میں کھانے کے لئے نہیں ہے" قاضی نے اس کے جواب میں کہا: "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بے شک یہاں میری داڑھی کا مذاق اڑایا جاتا ہے میری عبا کا مذاق اڑایا جاتا ہے مگر ابھی تک پوری مملکت میں میری قلم کے فیصلے نافذ العمل ہیں اگر ذاتی توہین سے طیش میں آ کر یہ جگہ چھوڑ دی اور پھر کوئی لفنگا اس منصب پر آ کر بیٹھ گیا تو وہ تو شریعت کو بھی مذاق بنا دے گا" اس وجہ سے مجھے اپنی ذاتی توہین گوارا ہے لیکن شریعت محمدی کی توہین گوارا نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زوال اخلاق کے زمانہ میں بھی ایک عالم کو مفاد شریعت کا کس قدر خیال رہتا تھا؟

حفظ شریعت کا ایک عجیب واقعہ تاریخ مرآت احمدی تاریخ گجرات میں ملتا ہے۔ مغل حکومت کے زمانہ میں گجرات کے قاضی حماد تھے وہ بڑے صوفی اور مجذوب تھے وہ اپنے فیصلوں میں لکھتے تھے یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے گویا وہ خود کو خدا یا خدا کا مظہر قرار دیتے تھے اس بات کی شکایت دارالحکومت دہلی میں کی گئی وہاں سے تحقیق حال کے لئے قاضیوں کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا اس بورڈ میں ان کے استاد قاضی محمد میاں اور ان کے حقیقی بھائی شامل تھے تحقیقی بورڈ نے ان کو شرک جلی کا مجرم پایا جو ارتداد ہے اس

لئے متعلقہ شخص واجب القتل ہے۔ جب قاضی حماد نے اپنے خلاف یہ فتویٰ سنا تو کہا محمد میاں زندہ نہیں رہے گا اس بات کو سن کر محمد میاں نے کہا میں جانتا ہوں کہ قاضی حماد کی بات سچی ہوتی ہے مگر فیصلہ میرا حق ہے میں نے یہ فتویٰ اپنے ایمان اور ضمیر کے مطابق دیا ہے' شریعت کے مفاد میں دیا ہے قاضی حماد کو پھانسی دے دی گئی اور چند دن کے بعد قاضی محمد میاں کا بھی انتقال ہوگیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ حقیقی استاد نے اور حقیقی بھائی نے شریعت کے نفاذ میں کوئی رعایت نہیں کی۔

مفاد شریعت میں دور بینی کا ایک عجیب واقعہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے منقول ہے ایک مولوی وعظ کہنے کے لئے میوات کے علاقہ میں گیا' میوات کے مسلمان برائے نام مسلمان تھے ورنہ تمام طور طریقے ہندوؤں کے استعمال کرتے تھے اسلام سے وابستگی یہ تھی کہ محرم کے زمانہ میں تعزیہ نکالتے تھے اور ماتم کرتے تھے۔ مولوی نے یہاں کی ساری صورت حالات لکھ کر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں بھیجی اور مشورہ طلب کیا کہ کیا میں تعزیہ کے خلاف وعظ کہوں؟ مولانا نے جواب میں لکھا: اسلام سے پہلے ان کا رشتہ تعزیہ اور محرم کے ذریعہ جڑا ہوا ہے' اگر اس کو بھی کاٹ دیا پھر باقی کیا رہ جائے گا' ان کے اور اسلام کے درمیان دوسرے رشتے قائم کرو' جب وہ رشتے مستحکم ہو جائیں' تب تعزیہ اور محرم کی بدعات کے خلاف وعظ کہنا چاہئے اس سے پہلے نہیں۔

## مفاد ملت کا تحفظ:

قومی مفادات کی حفاظت اور مفاد ملت کی پاسبانی کا فریضہ بھی یہ علماء ادا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں انہوں نے بڑی دور بینی کا ثبوت دیا ہے۔ ایک ایسا ہی معاملہ فہمی کا واقعہ انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں پیش آیا۔ پہلے گورنر جنرل لارڈ ورن ہسٹنگو نے کلکتہ میں ۱۷۸۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ قائم کیا۔ انگریزی حکومت کی نیک نامی اور مدرسہ کی مقبولیت کے لئے وہ چاہتا تھا کہ مشہور علماء اس مدرسہ میں آ کر تدریس کا

کام سنبھالیں۔ اس نے علامہ تفضّل حسین کاشمیری لکھنوی کے ذریعہ کوشش کی کہ سر تاج علمائے ہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو حاصل کرے مگر شاہ صاؒحب نے صاف انکار کر دیا۔ ۱۸۳۷ء میں انگریزوں نے بریلی میں کالج قائم کیا' انگریزی حکومت کی خواہش تھی کہ اس کالج میں مستند علماء کو استاد بنایا جائے تاکہ مستند علماء کے تعاون سے عوام میں انگریزی حکومت کو مقبول بنایا جاسکے یہ بات علماء پر بھی واضح تھی اس لئے وہ حکومت سے گریز کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔

بریلی کے کلکٹر ہاکنس نے یہ کوشش کی کہ مولوی عبدالرحیم رامپوری کو کالج میں لے آئے مولوی صاحب نے ابتداء میں حیلے بہانے تراشنے شروع کئے کبھی لکھا یہاں کے غریب عوام طالب علم محروم رہ جائیں گے' انگریز نے کہا ہم ان سب کو بریلی لے جائیں گے اور مفت تعلیم دیں گے' پھر کہا میرے گھر میں ایک بیری کا درخت ہے اس کے بیر مجھے پسند ہیں' انگریز نے کہا ہم ایسا انتظام کر دیں گے کہ اس کے بیر آپ کو بریلی میں مل جائیں آخر میں مجبور ہو کر انہیں صاف صاف کہنا پڑا کہ میں تمہارے ساتھ تعاون نہیں کرسکتا کل خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اس پر انگریز چپ ہوگیا۔ واضح رہے کہ رامپور میں عبدالرحیم کو صرف دس روپیہ تنخواہ ملتی تھی اور انگریز نے ان کو ڈھائی سو روپیہ کی پیشکش کی تھی یہ علماء اور اساتذہ ملت کے نگہبان تھے' کتنی ہی بڑی رقم پیش کی جائے یہ کسی صورت میں ملت کے مفاد کو ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

## تحصیل علم اور سیاحت:

علم کی کوئی حد نہیں ہے ''ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہے'' اس لئے کسی ایک عالم سے بڑھ کر تحصیل علم کا شوق پورا نہیں ہوسکتا' اس لئے کہ ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی عالم ملے اس سے فیض اٹھایا جائے خواہ اس کی خاطر دور دراز کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ معلوم ہوا کہ خضر علیہ السلام کو ان باتوں کا علم ہے جو انہیں معلوم نہیں تو وہ ان کی تلاش میں نکل پڑے۔ جس جذبے کے ساتھ

وہ اس سفر پر نکلے تھے قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے: ''اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ اس مقام پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں یا یونہی زمانہ دراز چلتا رہوں گا۔'' رسول اکرم ﷺ نے بھی تحصیل علم کے لئے سفر کرنے پر زور دیا ہے اور جو شخص تحصیل علم کے دوران میں وفات پا جائے وہ حدیث کی رو سے شہید ہے ہر عالم کے اوپر چونکہ ایک عالم ہے' اس لئے تعلیم دراصل عمر بھر کا مشغلہ ہے اس کے لئے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کی کوئی شرط نہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرے۔

## حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا تعلیم کی خاطر چھوٹی عمر میں سفر اختیار فرمانا:

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ابھی انتہائی چھوٹی عمر ہی کے تھے تقریباً بارہ' تیرہ سال کے تو ان کی والدہ محترمہ نے ان کو ابتدائی تعلیم مکمل کروانے کے بعد حکم ارشاد فرمایا کہ اب یہ رقم پکڑو جو کہ میری عمر بھر کی جمع پونجی ہے۔ وہ رقم لے کر بذریعہ بحری جہاز دوسرے شہر کے لئے نکلے۔

راستہ میں ایک قزاق اُن کا محرم حال بن بیٹھا اور اس نے جان لیا کہ بچے کے پاس اتنی اشرفیاں ہیں۔ اس نے اگلے ہی دن سویرے سویرے شور مچا دیا کہ میری فلاں رنگ کی پوٹلی جس میں اتنی اشرفیاں تھیں چوری ہوگئی ہے۔ پکڑو' پکڑو...... کسی نے چوری کر لی۔ تمام جہاز کی تلاشی لی گئی لیکن کسی کے پاس سے نہ ملی۔ بات آئی گئی ہوگی۔ اگلے دن وہ بڑی خاموشی سے قریب آیا اور پوچھنے لگا: برخوردار تمہارے پاس جو پوٹلی تھی میں نے یہ سب چکر اس کی خاطر چلایا تھا لیکن تم نے وہ چھپائی کہاں......؟

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرمانے لگے میں نے وہ دریا میں پھینک دی۔ وہ کہنے لگا: جانے دو' یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے۔ فرمانے لگے میں علم کی تلاش و جستجو

میں جارہا ہوں اور مجھے یہ بالکل اچھا معلوم نہ ہوا کہ میں بعد میں لوگوں کو تعلیم دو اس بات سے متہم ہو کر کہ اس شخص پہ کبھی چوری کا الزام لگا تھا۔

یہ تھی ہمارے مشاہیر کے نزدیک استاد کی اہمیت کا احساس۔ دنیاوی دولت چاہے کتنی ہی جائے تو جائے لیکن استاد کی شان میں کمی نہیں آنے دیتے تھے۔

اللہ عزوجل ہم سب کو توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی ان اسلاف کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۱۳

# نظریہ تعلیم وتربیت

## باب : ⑬

یہ یورپ کا ایک فرسودہ نظریہ ہے کہ بچے فطری اور پیدائشی طور پر مرتکب گناہ ہوتے ہیں۔ درحقیت یہ تصور عیسائیت کے اس عقیدہ کا پرتو ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے۔

### پیدائش کے وقت تو ہر انسان معصوم ہوتا ہے:

جبکہ اسلام نے دنیا کو بتایا کہ ہر انسان پیدائشی طور پر معصوم اور پاک وصاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے ماہرین نفسیات جب بھی بچوں کی نفسیات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا ذہنی پس منظر یہی ہوتا ہے کہ ہر بچہ کو گناہ کی آلودگی وراثت میں ملتی ہے۔ ان کے مطابق بچوں کو متمدن، تہذیب یافتہ اور دیانتدار شہری بنانے کے لئے بچپن ہی سے پورے نظم وضبط کے تحت رکھنا اور ان کی لغزشوں کی پاداش میں سخت سے سخت سزائیں دینا بھی ضروری ہے۔

### یورپ کے فرسودہ نظریہ کی تقلید:

بدقسمتی سے ہمارے اسلامی معاشرے میں بھی اس قسم کے لوگ موجود ہیں جو اس غیر فطری اور غیر انسانی رویے کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کے حامی ہیں۔ ایسے لوگوں چاہے اساتذہ ہوں یا والدین، نام نہاد نظم وضبط کی آڑ میں بچے کو چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر مارتے پیٹتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں سمجھانے کی کوشش کی جائے تو وہ اپنی مثالیں دینے لگتے ہیں کہ ہمارے والدین اور اساتذہ نے ہمیں فلاں فلاں سزائیں دی ہیں تب ہم اس مقام تک پہنچے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ فرسودہ نظریہ یورپ کا ہے اسلام کا نہیں۔ بچے کی تعلیم وتربیت کے ضمن میں اسلام نے والدین اور اساتذہ کو

بچے کی نشو و نما اور تعلیمی ترقی کے لیے بہترین اور سازگار ماحول مہیا کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور جسمانی سزا کے عام اور مطلق استعمال کی سخت ممانعت کی ہے۔

## حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات:

اگر مسلمان دیگر تمام مفکرین سے بڑھ کر ہادی اعظم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مقدسہ کی طرف رجوع کریں تو انہیں معلوم ہو جائے ہوگا کہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''عنقریب زمین تمہارے لئے مسخر کر دی جائے گی اور تمہارے پاس کم عمر آئیں گے جو علم کے بھوکے اور پیاسے ہوں گے' تفقه في الدين کے خواہشمند ہوں گے اور تم سے سیکھنا چاہیں گے۔ بس جب وہ آئیں تو انہیں تعلیم دینا' مہربانی سے پیش آنا' ان کی آؤ بھگت کرنا اور حدیث بتانا''۔

(جوامع البیان)

## بے جا مار پیٹ کے نقصانات:

تجربہ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ مار پیٹ اور سخت کلمات کی بہ نسبت نرم کلمات زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔ خوف دلانے اور دباؤ ڈالنے سے خواہ وقتی طور پر کام چل جائے مگر یہ کامیابی عارضی ہوتی ہے بلکہ آج کل تو وقتی کامیابی بھی حاصل نہیں ہوتی' الٹا فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے جو اراکین اور ذمہ دارانِ ادارہ کے لئے انتہائی پریشانی اور مدارس کے مستقبل کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

## اساتذہ کے اوصاف:

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استاد کو بردبار اور حلیم الطبع ہونا چاہئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا جب تک تیرا غصہ باقی ہے اپنے آپ کو اہل علم میں شمار نہ کر۔

ہمارے اکابر کو اپنے شاگردوں سے اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر محبت تھی۔ وہ مہرو محبت کے پیکر اور مجسمہ رحم تھے۔

## طالبِ علم سے محبت کی انتہا:

حضرت مولانا سید ظہور الاسلام صاحبؒ بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے زمانہ میں ایک بنگالی طالبِ علم سخت بیمار ہوا اور حالت اخیر معلوم ہونے لگی۔ مولانا تشریف لے گئے تو اس طالبِ علم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حضرت مولانا نے تسلی دی اور فرمایا گھبراؤ نہیں، تم ان شاء اللہ اچھے ہو جاؤ گے اور اس کے بعد سجدہ میں دیر تک دعا مانگتے رہے۔

فرمایا اے اللہ! اگر جان ہی لینا طے ہو تو ظہور الاسلام کا بچہ عطیۃ اللہ حاضر ہے۔ یہ طالبِ علم پردیسی ہے، میری امانت میں ہے، اس کو صحت عطا فرما۔ حضرت الاستاد نے فرمایا کہ تھوڑی دیر میں گھر سے اطلاع آئی کہ عطیۃ اللہ کی حالت غیر ہے، جلد تشریف لائیے۔ حضرت مولانا پہنچے تو انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت کا یہی اکلوتا اور ہونہار لڑکا تھا۔

(آداب المعلمین)

## حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات:

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ نے تو سبق یاد نہ ہونے پر بھی استاد کے مارنے کو منع فرمایا ہے۔ چنانچہ خانقاہ میں سخت تاکید تھی کہ کوئی استاد طالب علم کو نہ مارے، اس کی اطلاع تعلیم کے ذمہ دار کو دی جائے، وہ مناسب سزا تجویز کرے گا۔ استاد کی طرف سے طالب علم کے دل میں اگر تکدر ہو گیا تو پھر اس کو فیض نہیں پہنچ سکتا۔ نیز بسا اوقات جو کچھ یاد ہوتا ہے، مارنے کے خوف کی وجہ سے بھول جاتا ہے۔ بعض اساتذہ تو چہرے پر مارنے سے بھی اجتناب نہیں کرتے حالانکہ حدیث پاک میں اس

کی سخت ممانعت آئی ہے۔ یہ مارنے والے اس پر غور کریں کہ ہم اپنے بارے میں کیا چاہتے ہیں۔ کیا طالب علمی کے زمانہ میں ہماری بھی خواہش رہی ہے کہ روزانہ بدن پر چھڑیاں لگوائی جائیں، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر شاگرد کے لئے کیوں پسند کیا جا رہا ہے؟

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک موقعہ پر انتہائی حیرت و تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ میں تو بڑی سخت پریشانی کا شکار ہوں۔ جب بھی اس معاملے میں سوچتا ہوں تو پریشانی دوچند ہوئی جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان اگر حقوق العباد ادا نہ کرے تو چلو کسی موقعہ پر تو اس کو پشیمانی ہونے کا بہرحال چانس رہتا ہی ہے لیکن شاگرد کو مارنا اور سخت مار مارنا تو ایسی حیرت انگیز غلطی ہے کہ آج ماری اور کل بھول بھی گیا۔ شاگرد بھی آگے اور آگے تعلیم کی خاطر چلتا گیا اور استاد بھی ہوسکتا ہے کہ اس مدرسے کے ساتھ وابستہ نہ رہے تو اب معافی مانگی بھی جائے تو کس سے۔

سبحان اللہ! حکیم الامت نے کتنے احسن انداز میں اساتذہ کرام کو یہ بات باور کرا ڈالی کہ اس معاملے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ایک اور واقعہ سنئے:

## حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ☆

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک عمر رہا۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے کبھی مارا ہو۔ چلو مار تو جانے دو مجھے تو کبھی سخت الفاظ سے بھی نہیں بلایا۔

فرمانے لگے: ہاں! یاد آیا کہ ایک دفعہ گھر کچھ مہمان آئے تو نبی کریم ﷺ نے بازار سے کچھ منگوانے بھیجا۔ میں نے راستے میں بچوں کو کھیلتے دیکھا تو میں بھی ساتھ شامل ہوگیا اور یاد بھی نہ رہا کہ گھر سے کس مقصد کے تحت نکلا تھا۔

کچھ دیر کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میری گردن پیچھے سے دبوچ کر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے: کیا تجھے یہ چیز لانے بھیجا تھا......؟

بس اس کے علاوہ تو کبھی ایسی تادیب کا موقع بھی نہ آیا۔

جناب الحاج محمد احمد صاحب نے بچوں کی جسمانی سزا سے متعلق اپنے بیٹے ظفر احمد کو ایک طویل خط لکھا جس میں جسمانی سزا کے لئے دینی اور دنیاوی نقصانات سے آگاہ فرمایا۔ یہ مکتوب دینی مدارس کے اساتذہ اور عامۃ المسلمین کے فائدہ کے لئے نذر قارئین ہے۔

# ابتدائی مدارس میں تعلیم و تربیت کی بابت چند مفید ہدایات

برخوردار حافظ ظفر احمد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ!

تم کو تعجب تو ہوگا کہ مجھے یہ خط تمہارے پاس بھیجنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ تو یہ تعجب پوری تحریر ہذا پڑھ لینے سے رفع ہوگا۔

تمہید:

تمہارے علم میں ہے کہ حافظ خلیل احمد کے دو بچے عمیر (عمر ۶ سال) اور طلحہ (عمر ۹ سال) اور امیر احمد کا ایک بچہ نسیم احمد (اویس) عمر ساڑھے چھ سال ہے مدنی مسجد میں حفظ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جارہے ہیں۔ ان کے والدین کو حق تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی۔ خلیل احمد صبح اپنی گاڑی میں لے جاتے ہیں اور بعد عشاء بچوں کو لے آتے ہیں۔ تمہارے علم میں یہ بھی ہے کہ یہ تینوں بچے محلّہ کے سکول میں

پڑھتے تھے۔ ان کے والدین کو حق تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی کہ سکول سے ہٹا کر مدنی مسجد میں تعلیم حفظِ قرآن کے لیے بٹھایا۔ اس وقت تک عمیر اور اویس سورۂ بروج تک حافظہ میں پہنچے ہیں اور طلحہ نے ڈیڑھ پارہ حفظ کر لیا ہے۔ یہ تینوں بچے ایک ہی مدرس صاحب کے درجہ میں تعلیم پاتے ہیں۔

داخلہ کے بعد میں نے عمیر اور اویس کے متعلق مدرس صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ بھی تحریر کیا تھا کہ بچے کم عمر ہیں اور صحت کے لحاظ سے بھی کمزور ہیں' ان کی اس حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر تعلیمی مشقت کا ایسا مناسب بار رہے کہ بچے دلجوئی سے اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اوقاتِ مدرسہ میں ان کے کھانا کھانے کا بھی خیال فرمائیں کیونکہ اکثر کھانا شام کو واپس لے آتے ہیں۔ کھانا نہیں کھاتے یا تھوڑا کھاتے ہیں۔ مقصد اس عرضداشت سے یہی تھا کہ بچے اطمینان اور سکون سے اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں اور ان کی صحت پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔

تجزیہ:

رمضان المبارک کے بعد اب ان کے اوقاتِ مدرسہ صبح ۸ بجے سے شب کو نمازِ عشاء تک ہیں۔ عشاء کی نماز کے بعد خلیل احمد ان کو گھر لاتے ہیں۔ ان مذکورہ بالا امور کا علم کم و بیش تم کو بھی ہے۔ جب سے عمیر اور اویس کے قاعدے ختم ہوئے ہیں اور پارہ عم کی سورتوں کا حفظ شروع ہوا تو ان کی مار پٹائی بھی شروع ہو گئی۔ اویس کے گھر آنے پر قریباً روزانہ میں یہی سوچتا تھا کہ آج تو پٹائی نہیں ہوئی ہے۔ اویس جسمانی لحاظ سے کمزور ہے اس لئے مدرسہ سے آ کر گھر میں بستر پر مضمحل پڑ جاتا تھا۔ کبھی بدن میں درد' کبھی سر میں درد' پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پٹائی ہوئی ہے اور اس کے اثرات بھی بدن پر مار کے نشانات سے ظاہر ہوتے تھے۔ گال پر طمانچہ کی وجہ سے نشان بھی معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال گھر والے صبر ہی کرتے رہے۔ اویس کی والدہ نے مجھ سے کہا بھی کہ بچوں کی مار پٹائی کی متعلق میں ایک پرچہ قاری صاحب کی خدمت

میں لکھ دوں۔ اولیس کی پٹائی اکثر اس امر پر ہوتی کہ اس کو بلند آواز سے اور زور سے پڑھنے کو کہا جاتا اور اس طرح چلّا کر پڑھنے سے اس کا گلا جواب دے جاتا اور اس کی آواز نکلنا بند ہو جاتی اور وہ بلند آواز سے پڑھنے سے معذور ہو جاتا۔

قاری صاحب یہ سمجھتے کہ خاموش بیٹھا ہے اس پر اس کی پٹائی ہو جاتی۔ بلند آواز سے مسلسل پڑھنے کی وجہ سے گلا بیٹھ جاتا جو بظاہر جسمانی کمزوری کی وجہ سے ہوتا تھا اس لئے خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا اور دواء المسک صبح و شام اس کو استعمال کرائی جاتی ہے کہ بلند آواز سے پڑھنے کی قوت قائم رہے۔ گزشتہ بروز بدھ خلیل کے چھوٹے بچے عمیر کی مدرسہ میں ایسی شدید پٹائی ہوئی کہ وہ گھر آکر اس لائق بھی نہ تھا کہ چت لیٹ سکے۔ اس کے کمر، پیر اور ہاتھ میں جگہ جگہ مار کے نشانات تھے کہ وہ الٹا ہو کر لیٹ سکا۔ آیوڈکس کی مالش گھر والوں نے کی۔ میرے علم میں یہ تشددانہ مار پیٹ دو دن کے بعد آئی۔ خلیل نے بھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا۔ جمعرات کو مدرسہ میں بچہ کی بے چینی اور درد کی تکلیف کا حال خلیل نے قاری صاحب سے بیان کر کے درخواست کی کہ اتنی شدید مار پیٹ نہ فرمایا کریں۔

## مار پٹائی کا پس منظر:

اس پر جیسا خلیل احمد نے مجھے بتایا قاری صاحب نے فرمایا کہ بعد میں مجھے بھی اس کا احساس ہوا اور پھر میرے دریافت کرنے پر گھر والوں نے بتایا کہ پٹائی بھی اس پر ہوئی کہ شام کے وقت بچہ اگلا سبق نکالتا ہے۔ چنانچہ عمیر کے اگلا سبق نکالنے پر غلطی ہوئی ہوگی یا ٹھیک نہ نکال سکا تو اس پر مار پڑی۔ جب خلیل کے گھر جا کر میں بچہ کو دیکھنے گیا تو خلیل کی اہلیہ نے بتایا کہ ان کا ایک عزیز کا بچہ بھی مدنی مسجد میں پڑھتا تھا۔ اس بچہ کو ایسا سخت تھپڑ کان پر مارا کہ اس کا کان زخمی ہو گیا اور منہ پر ورم آ گیا اور کان میں درد شدید ہوا۔ شبہ ہوا کہ شاید کان کا پردہ پھٹ گیا۔ ایکسرے کرایا گیا تو ڈاکٹر نے بتایا کہ پردہ کان کا تو نہیں پھٹا مگر زخمی ہو گیا ہے۔ بچہ کی اس حالت پر اس کے والد اور

چچا وغیرہ مدرسہ میں اس کو لے گئے اور بچہ کی حالت دکھائی اور شکایت کی جس پر جانبین میں سخت کلامی اور ہاتھا پائی کی نوبت آئی۔

بہرحال معلوم ہوا کہ مدنی مسجد میں طالب علموں خصوصاً کم عمر معصوم بچوں کی مار پٹائی کا عمل بے دردی سے جاری ہے۔ ادھر اویس کی صحت کو دیکھا گیا تو وہ بھی پہلے سے کافی کمزور ہوگیا ہے۔ ایک دن سبق یاد نہ کرنے پر پٹائی ہوئی تو اس لئے پوچھا کہ سبق یاد کیوں نہیں کیا تھا؟ تو وہ کہنے لگا کہ اتنی زیادہ لائنوں کا سبق دے دیا تھا' مجھ سے کیسے یاد ہوتا؟ بچوں کی ایسی مار پٹائی کی حالت دیکھ کر اور معلوم ہوا کہ میری طبیعت میں بھی سخت ناگواری پیدا ہوئی اور بچوں کی طرف سے خدشہ ہوا کہ خدانخواستہ کہیں کسی دن ضربِ شدید سے بچہ کو کوئی ایسی اذیت نہ پہنچ جائے جو اس کی زندگی پر اثر انداز ہو جائے یا مدرسہ سے دلبرداشتہ ہو کر مدرسہ جانے سے گھبرانے لگے اور بھاگنے لگے اور اس کی مثال بھی علم میں آئی۔

مولوی ولی محمد صاحب جو اسی محلّہ کی تبلیغی جماعت کے امیر ہیں' ان کا پوتہ بھی مدنی مسجد میں پڑھتا ہے۔ اس کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ دومرتبہ مدرسہ سے فرار ہوا اس ڈر سے کہ سبق یاد نہیں ہے اور مدرسہ میں پٹائی ہوگی اور وہ محلّہ کی مسجد عثمان میں آ کر بیٹھ گیا۔

گویا مار پیٹ سے بچنے کے لئے بچہ نے یہ فرار ہونے کی تجویز اختیار کی۔ اگر یہی عادت فرار ہونے کی پختہ ہو جائے تو پھر گھر سے بھی فرار ہو جانے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور والدین کے لئے ایک اذیت کا سبب ہوتا ہے اور یہ سب امور تجربہ میں دیکھے گئے ہیں۔

## نگران کمیٹی کی ذمہ داری:

گھر میں گفت وشنید ہوتی رہی تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کی نگران کمیٹی بھی ہے۔ منیر نے بتایا کہ ظفر بھی اس کمیٹی کے ایک ممبر ہیں اور دو ایک نام اور بتائے۔ اب مدرسہ

میں معصوم بچوں کی مار پیٹ کا جو سلسلہ جاری ہے تو اس کی اصلاح اور ذمہ داری نگران کمیٹی کی ہدایات ہی سے ہو سکتی ہے اور بچوں پر یہ ایک طرح کا ظلم اور زیادتی ہے جو عقلاً و شرعاً قابل مذمت ہے جیسا کہ ہمارے اکابر نے اس کی تصریح قرآن و حدیث سے فرمائی ہے۔ تم چونکہ نگران کمیٹی کے ایک ممبر ہو اس لئے یہ امور تمہارے علم میں لایا جانا ضروری خیال کیا تا کہ نگران کمیٹی کے ممبر حضرات اس معاملہ میں غور و فکر فرمائیں۔ معصوم چھوٹے بچوں کے لئے تو مدرس کی ایک ڈانٹ ڈپٹ ہی کافی ہونا چاہئے کہ ایسے تھپڑ رسید کئے جائیں کہ جو کان کے پردہ تک پھٹ جائیں اور ہو سکتا ہے کہ بچہ شنوائی سے تا زندگی محروم ہو جائے۔ تم بھی ماشاء اللہ حافظ قرآن ہو تمہارے حافظہ کی تکمیل میں جب غیر معمولی تاخیر محسوس ہوئی تو حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دوئی آنے پر میں نے مشورہ لیا کہ میں تم کو دیوبند بھیج دوں۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے مشورہ دیا کہ میں تم کو مولانا ابرار الحق صاحب کے مدرسہ میں تعلیم کے لئے ہردوئی بھیج دوں، وہاں تعلیم و تربیت کا بہت اچھا انتظام ہے اور حیدر آباد دکن تک سے بچے آ کر ان کے ہاں تعلیم پا رہے ہیں۔ حضرت مولانا کے مدرسہ کا تعلیمی ماحول تم خود دیکھ چکے ہو۔ کیا تم نے وہاں معصوم بچوں کی کٹائی پٹائی اس بے رحمی سے ہوتے ہوئے دیکھی تھی؟ پھر بغیر کٹائی پٹائی بچے حافظ ہو کر نہیں نکلے۔ پھر وہاں تعلیم کے ساتھ تربیت کا یکساں اعلیٰ اصلاحی نظام تھا۔ بچوں کی نگرانی کس شفقت و پیار سے ہوتی تھی۔ یہی بچپن کی تعلیم و تربیت ساری زندگی سنور جانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

## حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں مار پٹائی پر پابندی:

تھانہ بھون میں حضرت اقدس حکیم الامت کی خانقاہ میں بھی مدرسہ میں بستی کے بچے طالب علم تھے۔ حضرت تھانوی کی ہدایت تھی مدرسین کو کہ کسی بچہ کو قطعاً مارا پیٹا نہ جائے۔ جو شکایت بچہ سے ہو وہ اس کے سرپرست سے کہہ دی جائے۔

اب ماشاء اللہ تبلیغی جماعت جو دین کے اعلیٰ پیمانہ کی داعی، حامل اور عامل جماعت سمجھی جاتی ہے اس کے مرکز مدنی مسجد میں معصوم طلبہ جو قرآنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے ہیں، ان پر ایسی سخت مار پٹائی کا تشدد کیسے روا ہو گیا؟ دینی مدرسہ کی تعلیم وتربیت دین کے موافق ہونی چاہئے کیونکہ یہ تو مسلّمہ اَمر ہے کہ دین کا کوئی کام دین کے طریقہ ہی پر کرنے سے باعث اجر وثواب ہے ورنہ دینی احکام کے خلاف باعثِ گناہ وعذاب ہے۔

## اکابر کی تحریریں:

① اس سلسلہ میں رسالہ ''البلاغ'' میں ایک مضمون بعنوان ''بچوں کو سخت سزا دینے کی ممانعت'' شائع ہوا جو حضرت اقدس حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی تالیفات و مواعظ سے لیا گیا ہے جس کی فوٹو اسٹیٹ نقل منسلک کی جارہی ہے۔ مسجد کے مدرسہ کی تعلیمی نگرانی کمیٹی اس کو ذرا غور سے ملاحظہ کرے اور اگر کمیٹی مناسب خیال کرے تو بہ نیت تبلیغ واصلاح مدرسین کو بھی سنا دیا جائے۔

## طالب علم کی بھلائی حضور ﷺ کی وصیت:

② حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی مشہور ومعروف تصنیف ''اصلاح انقلابِ امت'' سے ایک مضمون بعنوان ''طالب علم کے ساتھ بھلائی کرنے کے متعلق آنحضرت ﷺ کی وصیت'' (صفحہ نمبر ۲۹۰) کی فوٹو سٹیٹ کاپی منسلک کی جاتی ہے برائے ملاحظہ:

**((عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ان الناس لکم تبع و ان رجلا یأتونکم من اقطار الارض یتفقهون فی الدین فاذا اتوکم فاستو صوابهم خیرا))**

(رواہ الترمذی)

''جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اور لوگ تمہارے تابع ہیں تمہارے پاس دور دراز ملکوں سے لوگ علم دین سیکھنے اور سمجھنے کو آئیں گے' ان کے بارے میں میری وصیت کے موافق بھلائی سے پیش آنا''۔ (ترمذی)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص علم دین طلب کرنے کے لئے آئے اس کے حق میں جناب رسول اللہ ﷺ خیر کی اور حسن معاملہ کی وصیت فرماتے ہیں۔ گو ابھی تحصیل بھی شروع نہیں کی اور بعد تحصیل کے تو اور بھی تعلقات وخصوصیات جو کہ مقتضیات زیادت وتاکید حقوق ہیں زائد ہوں گے۔

پس حقوق اور بھی کماً وکیفاً کثیر اور قوی ہو جائیں گے اور چونکہ دوسرے نصوص سے صاحبِ افادہ کو تنگ کرنے کی ممانعت ثابت ہے: **کما قال تعالیٰ ﴿ولا یضار کاتب ولا شهید﴾** یعنی لکھنے والے اور گواہ کو تکلیف نہ پہنچانا چاہیے''۔

اس سے یہ بھی مفہوم ہو گیا کہ طلباء کو بھی اپنے حوائج علمیہ **وما یتعلق بھا** کی درخواست معلمین اور مہتمین سے اسی درجہ تک کرنی چاہیے کہ ان کو کلفت نہ ہو' یہ ان کے ذمہ واجب نہیں کہ جتنے طلبہ آئیں سب کے لئے طبق اور سبق کا انتظام ضرور ہی کر دیا کریں۔ البتہ بشرطِ سہولت اس کا انتظام اور پھر بعد کام شروع کر دینے کے ان کے مصالح علمیہ کی رعایت حسبِ حدیث ضروری ہے۔ (اصلاح انقلاب امت)

## شاگردوں میں نشاط وشوق کی انگیخت:

اصلاحِ انقلاب امت ہی کے صفحہ ۲۹۴ کی فوٹو سٹیٹ نقل منسلک کی جاتی ہے برائے ملاحظہ۔ مضمون جو بعنوان ''شاگردوں کے نشاط وشوق باقی رکھنے کی بھی رعایت کرنی چاہیے'' شائع ہوا ہے:

**((عن شقیق قال کان عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنه یذکر الناس فی کل خمیس فقال له رجل یا ابا عبد الرحمن لودت**

**انك ذكرتنا في كل يوم قال اما انه يمنعني من ذالك اني اكره ان املكم واني اتخولكم بالموعظة كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها مخافة السامة علينا))** (متفق عليه)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے۔ کسی شخص نے عرض کیا کہ حضرت! روز وعظ کیجئے تو آپؓ نے فرمایا کہ مجھے روز وعظ کہنے سے یہ امر مانع ہے کہ میں تم کو ملول نہیں کرنا چاہتا اور تمہاری خبر گیری اور نگہداشت ایسی ہی کرتا ہوں جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری خبر گیری فرمایا کرتے تھے کہ ہم ملول نہ ہوں''۔ (بخاری ومسلم)

## طلب علم میں اُکتاہٹ سے بچایئے:

اس حدیث سے مستفیدین للعلوم کا ایک حق یہ معلوم ہوا کہ ان کے نشاط وشوق کے باقی رکھنے کو بھی رعایت کرلے پس اس میں یہ بھی داخل ہوگیا۔ سبق اتنا نہ پڑھائے اسی طرح کتابیں اتنی نہ شروع کرادے کہ اکتا جائیں اور اگر وہ اس مقدار کی متحمل بھی نہ ہوں یعنی اس کا مطالعہ اور تکرار وضبط دشوار ہو تو بدرجہ اولی محل منع ہوگا۔ اسی طرح وقت میں اس کی رعایت کریں کہ ان کی طبیعت تازہ ہو۔ کھانے کا تقاضا کسل اور اسی طرح نیند کا غلبہ یا اور کسی سبب سے دماغ پریشان نہ ہو جیسے بعض مدرسین طلبہ کو ان امور کے اہمال سے اس قدر زچ کردیتے ہیں کہ یا تو وہ بھاگ جاتے ہیں یا استعداد حاصل نہیں ہوتی اور وہ اسی میں مست ہیں کہ ہم طلبہ کے ساتھ خوب محنت کرتے ہیں حالانکہ وہ سب محنت اکارت جاتی ہے۔ اسی کی نظیر ہے ارشاد حق تعالیٰ کا یہ مضمون:

**﴿الذين ضل سعيهم في الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا﴾** (الآية)

''یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گزری ہوئی اور (وہ بوجہ

جہل کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں''۔

اسی طرح ہفتہ میں کم از کم ایک تعطیل ہونا ضروری ہے۔ بعضے تعطیل میں بھی طالب علموں کی جان مارتے ہیں اور اس کو اپنی بڑی کارگزاری سمجھتے ہیں۔

دوستی بے خرد چوں دشمنی است

## جب نا اہل دینی خدمات کے متولی بن جائیں:

اسی حضرت حکیم الامت کی تالیف ''اصلاح انقلاب امت'' کے صفحات ۲۹۵، ۲۹۶ کی فوٹو سٹیٹ نقل منسلک کی جاتی ہے برائے ملاحظہ جہاں بعنوان ''نا اہلوں کا دینی خدمات کا متولی بننا قیامت کی علامت ہے'' اور دوسرا عنوان ''شاگردوں کے تین حقوق'' ہے:

**((عن ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه فی حديث طويل قال النبی صلی الله عليه وسلم۔ اذا وسد الامر الی غير اهله فانتظر والساعة))**

(صحيح البخاری)

''جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب دینی خدمات نالائقوں اور نا اہلوں کے سپرد ہو جائیں تو قیامت کا انتظار کرنا چاہئے''۔ (صحیح بخاری)

اسی حدیث کے عموم میں یہ بھی داخل ہو گیا کہ اگر کسی طالبِ علم کا کوئی سبق کسی دوسرے کے سپرد کرے تو اس کا لحاظ رکھے کہ وہ شخص اس کا اہل ہو۔ اگر نا قابل و بد استعداد یا غیر شفیق کو سپرد کرے گا تو شرعاً مذموم ہوگا۔ یہ بھی شاگرد کا ایک حق ہے۔

## شاگرد کے تین حقوق:

**((عن عبدالله بن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما قال تخلف عنا النبی صلی الله عليه وسلم فی سفرة سافرناها فادركنا وقد**

**ارهقنا الصلوٰة ونحن نتوضأ فجعلنا نمسح علی ارجلنا فنادی باعلی صوته ویل الاعقاب من النار مرتین او ثلاثا))**

(صحیح البخاری)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ ﷺ کسی سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے۔ آپ ﷺ ہم سے ایسے وقت آ کر ملے کہ نماز کا وقت آ گیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے۔ جلدی کی وجہ سے ہم نے پاؤں دھونے میں بہت جلدی کی کہ کچھ سوکھا رہ گیا۔ آپ ﷺ نے دیکھ کر دو تین بار فرمایا: خبردار ہو جاؤ...... عذابِ دوزخ ان ایڑیوں کے لئے ہے جو سوکھی رہ جائیں''۔

(بخاری)

اس حدیث سے تین حق شاگردوں کے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ صرف ان کے تعلیم علوم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے اعمال و اخلاق کی بھی حتیٰ الامکان نگرانی رکھے جس طرح حضور ﷺ نے بعض لوگوں کے پاؤں کے خشک رہ جانے پر متنبہ فرمایا اور یہ باب بالکل ہی مسدود ہو گیا ہے۔ اساتذہ صرف سبق پڑھا دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی طرف توجہ نہیں فرماتے اور علمی غلطی پر متنبہ نہ کرنا تو اور بھی غضب ہے کیونکہ اس کا تو انہوں نے بالتصریح التزام کیا ہے جیسا بعض معلمین قرآن کی عادت دیکھی گئی ہے کہ شاگرد پہلو میں بیٹھا ہوا غلط پڑھ رہا ہے اور یہ بہرے گونگے بنے بیٹھے ہیں اور اس سے بدتر یہ ہے کہ بعضے اساتذہ شاگردوں سے ایسے کام لیتے ہیں کہ ان کے اخلاق اور تباہ ہوتے ہیں تو اگر اصلاح نہ کرے تو فساد تو نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی وجہ سے احتمال ہو کہ بدون آواز بلند کئے ہوئے آواز نہ پہنچے گی مثلاً حلقہ درس بڑا ہے یا اور کوئی عارض ہے تو بلند آواز سے تقریر کرنا حق ہے

شاگرد کا ورنہ تقریر ہی بیکار ہے۔ دیکھئے حضور ﷺ نے کس طرح آواز بلند فرمایا۔

تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار تقریر کرنے سے طلباء نے نہ سمجھا ہوگا تو دوسری تیسری بار بھی تقریر کر دینا مناسب ہے۔ جس طرح حضور ﷺ نے دو تین بار فرمایا۔ اور آئندہ حدیث میں حضور ﷺ کی بھی عادت مستمرہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

**((عن انس رضی اللہ عنہ انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثہ حتی تفھم عنہ))** (رواہ البخاری)

''جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات مہتم بالشان فرماتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے کہ لوگ خوب سمجھ لیں''۔ (بخاری)

## طلباء کی استعداد بھی ملحوظ رہے:

⑤ اسی تالیف ''اصلاح انقلاب امت'' کے صفحہ نمبر ۲۹۷ تا ۲۹۹ کا فوٹوسٹیٹ منسلک ہے جہاں مضامین بعنوان ''تعلیم میں شاگردوں کی استعداد کا لحاظ رکھنا چاہئے' شاگردوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرنا چاہئے' شاگرد کے لئے اللہ سے علمِ نافع کی دعا بھی کرنا چاہئے' شاگرد کی دلجوئی کے متعلق ایک مثال:۔

**((قال علی رضی اللہ عنہ حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ))** (رواہ البخاری)

''حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی بات کرو جو وہ سمجھیں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی تکذیب کریں''۔

اس حدیث سے ایک یہ بات معلوم ہوئی کہ طالب علم کی تعلیم میں اس کے فہم و استعداد کا لحاظ رکھے اور اسی کے لحاظ سے ترتیبِ کتب و مقدار و عدد سبق تجویز کرے جیسا کہ ارشاد حق ﴿کونو ربانیین﴾ کی ایک تفسیر امام بخاری نے یہ بھی نقل کی ہے: ''الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ'': حدیثِ آئندہ سے بھی مرفوعاً اس کی اصل نکلتی ہے۔

## کوئی فن یا کتاب کسی طالبِ علم کے لئے مضر ہوتو روکنا چاہئے:

((عن انس رضی اللہ عنہ قال ذکر لی ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قال لمعاذ رضی اللہ عنہ من لقی اللہ لا یشرك به شیاء دخل الجنة قال الا ابشر به الناس قال لا انی اخاف ان یتکلوا))

(رواہ البخاری)

''جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جو شخص مرے اور خدا سے ملے اور وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ سمجھتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤں فرمایا کہ مت سناؤ کیونکہ میں خوف کرتا ہوں کہ اس پر تکیہ کرلیں گے''۔(بخاری)

یہ حدیث نص ہے اس میں کہ باوجودیکہ مضمون ''لقی اللہ ...... الخ'' کا مقاصد عظیمہ شرعیہ سے تھا مگر بعض لوگوں تک اس کا پہنچنا اس لئے پسند نہیں کیا گیا کہ وہ اس سے متضرر ہوتے پس اسی طرح جو کتاب یا کوئی فن کسی خاص طالبِ علم کے لئے نامناسب ہو اس کو اس سے روکنا بذمہ معلم لازم ہے اور اس طالبِ علم کو بھی اس میں اطاعت ضروری ہے۔

## شاگردوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرنا چاہئے:

((عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا)) (رواہ البخاری)

''جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دینی اُمور میں لوگوں سے آسانی کرو، تکلیف میں مت ڈالو، خوشخبری سناؤ اور دین سے نفرت مت دلاؤ''۔(بخاری)

اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوا کہ طالبِ علم کے ساتھ درس میں بھی تیسیر و عدم تنفیر کی رعایت رکھے۔ تقریر میں بھی ایسی صاف وسلیس کرے جو ذہن نشین ہو جائے اور مقدار و اعدادِ سبق میں بھی اس پر زیادہ بار نہ ڈالے۔ اسی طرح ایک حق یہ بھی معلوم ہوا کہ تنبیہ و تادیب میں اتنی سختی نہ کرے کہ شاگرد کو وحشت ہو جائے اور اس میں میاں جی لوگ بکثرت مبتلا ہے۔

## شاگرد کے لئے اللہ تعالیٰ سے علمِ نافع کی دعا بھی کرنی چاہئے:

((عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: ضمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال اللّٰھم علمہ الکتاب)) (رواہ البخاری)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو سینہ سے لگالیا اور یوں فرمایا کہ یا اللہ! اس کو قرآن کا علم عطا فرمادے''۔ (بخاری)

## شاگرد کی دلجوئی کے متعلق ایک مثال:

((عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بینما انا نائم اتیت بقدح لبن فشربت حتی انی لادی الری یخرج فی اظفاری ثم اعطیت فضلی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قالوا فما اولت یا رسول اللہ قال العلم)) (رواہ البخاری)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا آپؐ فرماتے تھے کہ خواب میں مجھے ایک پیالہ دودھ کا دیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا کہ ناخن تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا۔ پھر میں نے بچا ہوا دودھ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! اس کی تعبیر کیا ہوئی؟ فرمایا دودھ سے مراد علم ہے''۔ (بخاری)

اس حدیث سے دو امر معلوم ہوئے۔ ایک باعتبار صورت لبن کے ایک باعتبار معنی لبن کے۔ اول یہ کہ شاگرد کو گاہ گاہ اپنے کھانے پینے میں بھی شریک کرلیا کرے کہ اس کا دل بڑھتا ہے اور محبت زائد ہوتی ہے۔ جس قدر اس کو استاد سے محبت ہوگی اسی قدر علم میں برکت ہوگی۔

دوسرا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی برکت عطا فرمادے تو شاگرد سے اس کو دریغ نہ کرے۔ غرض غذا ظاہری و باطنی کا کچھ حصہ اس کو بھی دے دے۔

## اگر کوئی بات غصہ میں کہنے سے شاگرد کے لئے بہتر ہو تو کہے:

**((عن ابی مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ قال قال رجل یا رسول اللہ لا اکاد ادرك الصلوة مما یطول بنا فلان فما رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی موعظة اشد غضبا من یومئذ فقال یا ایها الناس انکم منفرون فمن صلی بالناس فلیخفف فان فیهم المریض والضعیف وذالحاجة))** (رواہ البخاری)

''حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! فلاں شخص نماز طویل کرنے کی وجہ سے قریب ہے کہ میں نہ پاسکوں (یعنی بد دل ہو کر جماعت چھوڑ دوں) تو جناب رسول اللہ ﷺ اس قدر برافروختہ ہوئے کہ ایسے کبھی میں نے برافروختہ ہوتے آپ ﷺ کو نہ دیکھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ جو آدمی نماز میں امامت کرے اس کو چاہئے کہ (قرأت میں) تخفیف کرے کیونکہ مریض اور ضعیف اور حاجت مند سب قسم کے لوگ نماز میں ہوتے ہیں''۔ (بخاری)

اس حدیث سے دو امر متعلق طالب علموں کے ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ اگر کچھ اسباق کسی اپنے شاگرد یا ماتحت مدرس کے سپرد کئے جائیں اور وہ طالب علم اس کی شکایت کرے تو شکایت سننا چاہئے اور تحقیق کے بعد اس کا انتظام کرنا چاہئے۔ یہ نہیں

کہ محض اس کے طالب علم ہونے کے سبب اور کو اور اس کی بات کو محض لاشے سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی طالبِ علم سے کوئی امر نامناسب صادر ہو اور کسی طور سے معلوم ہو جائے کہ غضبناک ہو کر کہنے سے زیادہ نفع ہوگا تو وہاں اس کی مصلحت کے واسطے غصہ ہی کرنا افضل ہے اس سے اس کی اصلاحِ کل ہو جائے۔

(اصلاحِ انقلاب امت)

## بیوی کی تربیت وتادیب کا شرعی حکم:

سورۃ النساء آیت نمبر ۳۴ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الرجال قوامون علی النساء﴾ اس آیت میں شوہروں کے حقوق کے سلسلہ میں ارشاد ہے کہ جن بیویوں سے مرد کو بد دماغی اور بدخوئی کا قوی احتمال ہو تو ان کی تادیب اور تنبیہ کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے تین ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔ اوّل زبانی نصیحت وفہمائش کرنے کا حکم، دوسری ہدایت ان کو بستروں اور خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دینے کا حکم، تیسری ہدایت آخری درجہ میں ان کو مارنے کی بھی اجازت کا حکم۔

اب مفسرین نے بیویوں کو مار مارنے کی جو تشریح کی ہے اور ائمہ دین سے فرمائی ہے اس کو ذیل میں درسِ قرآن، جلد دوم، صفحہ نمبر ۱۰۶ سے نقل کرتا ہوں:

> ''اگر وہ (یعنی بیویاں) شریفانہ سزا اور تنبیہ سے بھی متاثر نہ ہوں تو پھر ان کو معمولی مار مارنے کی بھی اجازت ہے مگر مار ایسی ہو کہ عورت کے بدن پر نشان نہ پڑے۔ ہڈی ٹوٹنے یا زخم لگنے کی نوبت نہ آئے اور چہرہ پر مارنے کو مطلقاً منع فرما دیا گیا ہے۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ مسواک وغیرہ سے مارے جس سے کہ مار کا اثر وزخم نہ ہو۔ مگر اس تیسرے درجہ کی سزا کو رسول کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا کہ شریف اور بھلے لوگ ایسا نہیں کریں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مارنا گو مباح اور جائز ہے مگر نہ مارنا افضل ہے۔

بہر حال اگر اس معمولی مار پیٹ سے بھی معاملہ درست ہوگیا تو مقصد حل ہوگیا۔ تو مردوں کو عورتوں کی اصلاح کے لئے یہ تین اختیارات دیئے گئے اور ان تدابیر سہ گانہ کے ذریعہ اگر وہ تابعدار ہو جائیں تو پھر مردوں کو بھی چشم پوشی اور معمولی باتوں پر الزام تراشی کی تلاش کرنے کی ممانعت کا حکم دیا گیا ہے''۔

## شاگردوں کی تادیب کیسی ہو:

اب یہاں قرآنی لفظ ﴿واضربوھن﴾ کی جو تفسیر نقل کی ہے وہ یہ جتلانے کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شوہروں کے حقوق بیویوں پر جو قرآن وحدیث میں بیان کئے ہیں وہ نہایت اہم ہیں اور ظاہر ہے کہ استاد اور شاگرد کے حقوق اس درجہ کے اہم نہیں تو تیسرے اور آخری درجہ میں جب بیویوں کو مارنے کی اجازت دی تو ایک استاد کو شاگرد پر اگر کسی حالت میں شرعاً مارنے کا بھی حق ہو تو استاد کی یہ مار شوہر کی مثال کے مثل بحکم قرآنی ہے۔ اگر کم نہ سہی تو زیادہ سے زیادہ اتنی ہی مان لی جائے تو مدرسین کو بس اس درجہ کی مار کی اجازت ہونی چاہئے اور وہ بھی آخری درجہ میں۔ اول نصیحت و فہمائش جس میں ڈانٹ ڈپٹ بھی شامل ہو سکتی ہے۔ دوسرے درجہ میں سرپرست سے شکایت۔ تیسرے درجہ میں مار۔ مگر ایسی مار جو اوپر نقل کی گئی اور منہ پر مارنے کی ممانعت ہے۔ ہمارے بعض مدرسین مدرسہ اور مسجد میں بیٹھ کر قرآن و حدیث پڑھاتے ہیں مگر قرآن اور حدیث کے احکام سے بے بہرہ اور غافل ہو کر۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

الغرض میں نے اپنے جذبات کو سکون پہنچانے کے لئے بڑی تعب اٹھائی ہے اور کئی جلسوں میں یعنی کسی نہ کسی طرح اس تحریر کے خاتمہ پر آیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت نصیب فرمائیں اور دین کے کام دین کے طریقہ پر بجا لانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اب میں نے خلیل احمد اور امیر احمد سے کہا ہے کہ وہ فی الحال بچوں کو مدرسہ بھیجنا بند کردیں اور اس خط کے جواب کا انتظار کریں۔ اگر یہ تحریر کسی درجہ میں سودمند

ثابت ہوسکی اور نگران تعلیمی کمیٹی نے مدرسین مدرسہ کو فہمائش و ہدایت فرما کر اس ظالمانہ مار پیٹ کو بند کرادیا اور جواباً تم نے مجھے اس سے مطلع کیا تو بچے پھر مدرسہ میں جانا شروع کردیں گے۔ اسی لئے میرا تم کو مشورہ ہے کہ تم جملہ نگران کمیٹی کے ممبر حضرات کو میری تحریر پیش کر کے مجھ کو اس تحریر کا جواب جلد از جلد دینے کی کوشش کرنا۔

جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزا

راقم بندہ محمد احمد عفی عنہ

حضرتؒ کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ استادوں کو شاگردوں کے ساتھ ان کے مذاق واستعداد کو سامنے رکھ کر رفق وملاطفت کا معاملہ کرنا چاہئے۔ ان کے نشاط وشوق کے باقی رکھنے کی بھی رعایت کرنی چاہئے اور استاد صرف ان کے تعلیم علوم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے اعمال واخلاق کی بھی حتی الامکان نگرانی کرے۔

# نظریہ تعلیم وتربیت

آج ہر طرف ناچ گانے کی ثقافت کلچر کے نام سے متعارف کرا کے نئی نسل کے قلوب واذہان میں راسخ کی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ عریاں مغربی میڈیا کی یلغار اور لارڈ میکالے کا نظام تعلیم مستزاد ہے۔ ہماری نئی نسل کا نمائندہ نوجوان صبح جب اخبار اٹھاتا ہے تو عریاں تصاویر کا پلندہ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور جب سکول' کالج اور یونیورسٹی کا رُخ کرتا ہے تو اس کے فکر ونظر کی معراج مغربی تہذیب میں لتھڑے ہوئے جنسی لٹریچر پر پہنچ کر اس کے پراگندہ ذوق کی تسکین پر ختم ہوتی ہے۔ اذہان بدل گئے' معیار بدل گئے' خیر وشر کا پیمانہ بدل گیا' نیکی اور بدی کی کسوٹی تبدیل ہوگئی۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا' جنوں کا نام خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

نسل تو تباہی کی طرف رواں دواں ہے اور کسی کو پرواہ تک نہیں۔ معاشرے کا ہر فرد آئندہ آنے والے خطرات سے بے نیاز ہو کر سہل پسندی اور تن پرستی کے گنبد میں بند ہے۔ لارڈ میکالے کی ہڈیاں خاک میں مل کر ریزہ ریزہ ہوچکی ہوں گی' لیکن اس کا نظام تعلیم اس کی منشاء اور مرضی کے مطابق آج بھی ہم پر مسلط ہے۔ وہ نظام تعلیم جس کے متعلق خود لارڈ میکالے نے کہا تھا' اگر اسی نظام سے مسلمان عیسائی نہ بنیں تو نہ بنیں' لیکن وہ مسلمان بھی نہیں رہیں گے۔ آج بھی کالجز' یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے' اس سے انسان کے پیٹ کا مسئلہ تو حل ہوسکتا ہے لیکن ہم اس تعلیم کا عقیدہ' اعمال اور حسن اخلاق کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں۔ آج ہم اپنے اعمال کی سزا

بھگت رہے ہیں کہ نئی نسل کا کوئی پرسان حال نہیں۔ نئی نسل' ڈاکٹر' انجینئر' پروفیسر الغرض سب کچھ بن سکتی ہے اور بن رہی ہے لیکن انسانیت کا وہ بلند مقام جو مطلوب و مقصود ہے اس تک رسائی ممکن نہیں۔

مولوی صاحب فرشتہ ہوں تو ہوں
آدمی بننا بڑا دشوار ہے

انسانیت کے بلند مقام کے حصول کے لئے قرآن وحدیث کے علوم سے رشتہ جوڑنا نئی نسل کی بقا اور تحفظ کے لئے از بس ضروری ہے۔ الحمدللہ دینی مدارس اس ضرورت کو کما حقہٗ پورا کر رہے ہیں' لیکن......ع

ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں

کی تلاش میں دینی مدارس نے باہمی مشورے اور وقت کے حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھ کر اپنی تعلیمی اور تربیتی پالیسی پر ہمیشہ نظر ثانی کی ہے اور اپنے اکابر اور اسلاف کی آراء اور مشوروں کو مقدم رکھا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ الحدیث نے دارالعلوم حقانیہ میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے اجلاس میں چند مشورے دیئے تھے' جو افادہ عام کی غرض سے نذر قارئین ہیں۔

# تعلیم

ا) طلبہ کو بالکل ابتدائی زمانہ ہی سے نوشت وخواند اور حساب کتاب سکھانے کا خاص اہتمام کیا جائے۔ بلکہ ہو سکے تو قرآن کریم ناظرہ کے دوران ہی اس کا آغاز کسی حد تک کر دیا جائے' حفظ کے طلبہ کا کچھ وقت اس کام کے لئے مخصوص کیا جاسکتا ہے اور درس نظامی کے درجہ اعدادیہ واولیٰ سے طلبہ کو باقاعدہ تحریر وکتابت کا عادی بنایا جائے اور عربی و اردو میں انشاء کی مشق کرائی جائے۔

ب) اسباق کی تیاری کے لیے اساتذہ کرام اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے گہرے اور وسیع مطالعے کا اہتمام فرمائیں' جو ہمارے اسلاف کا شعار رہا ہے اور ایسے مشاغل کو زہر سمجھیں جو اس کام میں ادنیٰ خلل کا باعث ہو سکتے ہیں۔

ج) طلباء کو مطالعہ اور تکرار کا پابند بنایا جائے اور اس کی بطور خاص نگرانی کی جائے اور دوسرے مشاغل مثلاً اخبار بینی' جلسے جلوس لایعنی مجالس اور بازاروں میں گھومنے سے پورے اہتمام کے ساتھ ان کو روک کر ان کی تمام تر توجہ اپنی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دی جائے۔

د) درس حتیٰ الامکان اردو میں ہونا چاہئے تاکہ بعض طلباء اردو میں نہ جاننے کے باعث دوسرے مدارس کے طلباء سے پیچھے نہ رہ جائیں اور عالم دین بن کر قومی زبان کے ذریعہ دین کی مفید' وسیع اور مؤثر خدمات انجام دے سکیں اور سوشلزم' قادیانیات' انکار حدیث اور بدعت والحاد جیسے فتنوں کا مقابلہ کر سکیں' جو زبان

کے راستے سے داخل ہو رہے ہیں۔

و) مدارس کے ماحول میں زیادہ سے زیادہ عربی زبان کو رائج کرنے کی کوشش کی جائے۔ جمعرات کو طلبہ تقریر و خطابت کی مشق کرتے ہیں، اس مشق میں عربی تقریروں، عربی نظموں اور مشاعروں کا بھی اہتمام کیا جائے۔

ادب عربی کے اسباق میں انشاء عربی کی مشق پر خصوصی توجہ دی جائے اور امتحانی نمبروں میں بھی ان کو ملحوظ رکھا جائے۔ مدارس میں تمام تختیاں اور بورڈ اردو کے ساتھ عربی زبان میں بھی ہونے چاہئیں اور درسِ نظامی کے تمام درجات کے داخلہ فارم عربی زبان میں رائج کرنے کی کوشش کی جائے۔

ان تدابیر پر بتدریج عمل کرنا مشکل نہیں۔ تھوڑے سے اہتمام اور کوشش سے یہ کام ہوسکتا ہے۔ ہمارے بزرگانِ دیوبند نے اردو کے علاوہ عربی زبان میں بھی ایسی نادرۂ روزگار تصانیف چھوڑی ہیں جن کو بلاشبہ گزشتہ صدی کا بہترین علمی سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔

آج عرب کے علماء کرام ہمارے بزرگوں کے ان محققانہ و ادیبانہ کارناموں پر رشک کر رہے ہیں۔

ز) بعض مدارس تعلیمی سال کے آغاز پر اسباق بہت تاخیر سے شروع کرتے ہیں اور بعض مدارس میں اختتام سال شعبان کے بجائے رجب ہی میں ہو جاتا ہے، بلکہ بعض مدارس میں تو نوبت سال جمادی الثانی تک آ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ مدت تعلیم کم ہو جانے سے تعلیم کا سخت نقصان ہوتا ہے اور استعدادیں بہت ناقص رہ جاتی ہیں۔ اہل مدارس اہتمام فرمائیں کہ اسباق ۱۵ شوال تک شروع ہو جائیں اور رجب کے اواخر تک جاری رکھیں۔

ز) مدارس، اساتذہ اور طلبہ کو عملی سیاست سے دور رکھا جائے اور ان کی پوری توجہ

تعلیم و تربیت پر مرکوز رکھنے کے لئے تمام ممکنہ وسائل و تدابیر اختیار کی جائیں۔

(الحق)

دینی مدارس کے دو ہی بنیادی مقاصد ہیں''تعلیم دین اور دینی تربیت'' اگر تعلیم ہو اور تربیت نہ ہو تو بھی اعلیٰ ترین رجال کار اور جید علماء کی تیاری مشکل ہے...... دینی معاشرے کے احیاء اور بقا کے لئے دینی مدارس میں تربیت بھی ضروری ہے۔ جس کی بابت ہم علیحدہ فصل کی صورت میں کچھ درج کئے دیتے ہیں۔

# تربیت

## قرآن وحدیث اوراسلاف کی نظر میں

ا) تعلیم جتنی ضروری ہے اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم اورضروری چیز اخلاقی تربیت ہے۔قران کریم نے آنحضرت ﷺ کے مقاصد بعثت میں تزکیہ کا ذکر تعلیم سے بھی مقدم کیا ہے۔﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ......﴾ احقر کے نزدیک تربیتِ اخلاق کے لیے مندرجہ ذیل تین تدابیر فوری طور پر اختیار کرنے کی ضروری ہے۔

۱) اساتذۂ کرام اپنے درس میں اور درس کے باہر بھی طلبہ کی اخلاقی تربیت کا فریضہ اپنے دیگر فرائض منصبی کی طرح انجام دیں اور اپنے قول وعمل سے ان کے سامنے اسلاف کا نمونہ پیش فرمائیں۔

۲) ہفتہ وار اور دیگر چھوٹی بڑی تعطیلات میں طلبہ کو ترغیب دی جائے کہ وہ کسی متبع سنت شیخ طریقت کی خدمت میں کچھ وقت گزار کریں۔

۳) اور جن کو اس کے مواقع میسر نہ ہوں اور وہ اپنی تعطیلات کا کچھ وقت اور کچھ ایام تبلیغی جماعت میں لگائیں۔

ب) ایک چیز جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ آج ہمارے ان مدارس کو طرح طرح کے فتنوں اور بے شمار الجھنوں کا سامنا ہے جن کے لئے ممکنہ تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، لیکن یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت کے حصول کا سب سے مؤثر ذریعہ تقویٰ اور اخلاص ہے: **ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب**۔ اس آیت مبارکہ میں ہمارے

مدارس کے بھی تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ لہٰذا اس وعدۂ خداوندی کے حصول کے لئے تمام مدارس کے منتظمین اور اساتذۂ کرام کا فرض ہے کہ وہ تقویٰ' اخلاص' زہد وتوکل اور استغناء کو سب سے پہلے اپنا شعار بنائیں۔ اگر ہم نے یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر لئے تو طلبہ ان اوصاف میں خود بخود ڈھل جائیں گے' ورنہ یہ اوصاف محض تقریروں اور مواعظ سے پیدا نہیں ہو سکتے۔

ج) آج ہمارے مدارس میں جہاں اور بہت سے مفاسد پیدا ہو گئے ہیں' ایک مفسدہ یہ بھی نظر آنے لگا ہے کہ خلاف شرع امور مثلاً تصاویر' مخرب اخلاق لٹریچر' ناجائز لہو ولعب اور وضع قطع سے اتنی احتیاط نہیں کی جاتی جتنی کہ شرعاً واجب ہے۔ اتباع سنت مسلک دیوبند کی سب سے بڑی اور بنیادی خصوصیت ہے۔ آج ہمارے مدارس میں اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بے شمار سنتیں آج ہمارے مدارس میں مردہ ہو چکی ہیں۔ اگر ہمیں مسلک دیوبند کو زندہ رکھنا ہے تو سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی ایک ایک سنت کو اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں زندہ کرنا ہوگا۔ اگر دینی مدرسوں میں بھی یہ کام نہ ہو سکا تو باہر کے معاشرے اور عامۃ المسلمین میں محض زور خطابت اور مناظروں کے بل بوتے پر کوئی سنت زندہ نہیں کی جا سکے گی۔ اگر ہم نے اتباعِ سنت میں اپنی اور طلبہ کی زندگیوں کو نہ ڈھالا تو تاریخ ہمارا یہ جرم کبھی معاف نہیں کرے گی اور مستقبل کا مورخ جب مسلک دیوبند کو نقصان پہنچانے والوں کو شمار کرے گا تو ہمارا نام بھی ان میں شامل کرنے پر مجبور ہوگا۔ **ولا فعلھا اللہ۔**

د) آج مسلک دیوبند پر جتنی شدید یلغار بیرونی حملوں کی ہے اندرونی فتنوں کی یلغار اس سے کم نہیں۔ اندرونی فتنہ سب سے بڑا یہی ہے کہ ہمارے مدارس میں اتباع سنت میں بہت ڈھیل اور سستی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم اپنے اسلاف کی

جفاکشی، سادگی، تواضع، خشیت اخلاص، زہد وتوکل اور استغناء کو بھولتے جارہے ہیں، حب جاہ اور حب مال کے فتنے ہماری کارکردگی پر ضرب کاری لگا رہے ہیں، یہ ہمارا اندرونی فتنہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ اندرونی فتنہ بیرونی حملوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، بلکہ درحقیقت بیرونی حملوں کو بھی اندرونی فتنوں سے شہ ملتی ہے، اس لئے اس خطرناک اندرونی فتنہ کا سد باب ہماری سب سے پہلی اور سب سے اہم ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور ہم بھی سستیاں چھوڑ کر سچے دِل سے اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔

# نظم ونسق اور باہمی تنظیم

ا) مدرسوں کا نظم ونسق مثالی ہونا چاہئے۔ ہر کام میں شائستگی، سلیقہ اور صفائی ستھرائی اگر ہوگی تو دینی تعلیم میں کشش پیدا ہوگی اور ابنائے زمانہ کا رجوع ان مدارس کی طرف زیادہ ہوگا۔

ب) ہر مدرسہ میں ہر شعبہ عمل کے لئے قواعد وضوابط مرتب اور ان پر عمل کرنا اس زمانے میں بہت اہم ہوگیا ہے۔ ہر مدرسہ اپنے حالات کے مطابق ضابطے خود مقرر کرے، پھر جو ضابطے مقرر ہو جائیں، ان کی تکمیل ہر خورد و کلاں سے کرائی جائے اور کسی سفارش یا منت سماجت کا ہرگز لحاظ نہ کیا جائے ورنہ بے شمار فتنہ پیدا ہوتے رہیں گے۔

ج) وفاق المدراس کو مفید، مؤثر اور فعال بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد (جو طبع شدہ ہیں) ان کی تکمیل کے لئے بھرپور کوشش کی جائے۔ وفاق بحیثیت وفاق کی جملہ کارروائیاں انہیں اغراض و مقاصد کی حدود میں رہنی چاہئیں، ان حدود سے باہر کے کام اگرچہ فی نفسہ کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں اگر ان میں وفاق کی توانائیاں اور وسائل خرچ کئے گئے تو ہماری توانائیاں بکھر کر رہ جائیں گی اور کوئی کام بھی پائیدار نہیں ہو سکے گا۔

## مدارس کی اصلاح اور تصحیح نیت:

موجودہ دینی مدارس کی ترقی اور نظام تعلیم و تربیت کے لئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہٗ کے ایک سوال نامہ کے جواب میں فرمایا:

''مدارس کے اصلاح اور مردم خیز ہونے کے لئے اوّلین شرط تصحیح نیت ہے کہ

اربابِ مدارس، مدارس قائم کرنے، اس کو چلانے اور اساتذہ وطلبہ اپنے تمام تر تعلیم وتعلم کی غرض اور مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضا اور آخرت کی فلاح و سعادت سمجھیں اور ارشادِ ربانی: ﴿فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهو فی الدين والينذر واقومهم اذا رجعوا اليهم﴾ کو ہمہ وقت منظور نظر رکھیں، دینِ محمدی ﷺ پر خود عمل مقصود ہو اور دنیا کی ظلمتوں میں نورِ اسلام پھیلانا مطمع نظر ہو۔ اگر طلبہ و اساتذہ ﴿کنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر﴾ کا مصداق ہوں۔ تفقه فی الدين اور امر بالمعروف و نهی عن المنكر کا مظہر ہوں۔ اتامرون بالبر واتنسنو انفسكم وانتم تتلون الكتب کا مصداق نہ ہو تو پوری امت پر اس کے نہایت بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔ اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا ارشاد...... العلماء ورثة الانبياء منجملہ جوامع الکلم ہے کہ مقام و مرتبت کی بلندی اور ذمہ داریوں کی نزاکت کا سارا نقشہ اس میں آجاتا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کی اخلاقی اصلاح اور کردار کی تربیت کی طرف توجہ نہایت ضروری ہے۔ مدارس میں اساتذہ ایسے ہوں، جو اسلامی کردار کا بہترین نمونہ ہوں۔ اخلاقی کمالات سے بھرپور ہوں اور ظاہر و باطن میں شریعت اور علوم شریعت کے فدائی ہوں۔ صوم و صلوٰۃ اور اخلاق حسنہ سے متصف ہوں۔ مطالعہ اور علمی ذوق تحقیق ان کا اوڑھنا بچھونا ہو۔ مدارس کے مردم خیز ہونے میں اساتذہ و منتظمین کے اخلاص وللّٰہیت اور بلند کردار و با اخلاق ہونے کا بنیادی حصہ ہے۔ اس کے علاوہ حصول علم کی راہ میں فنائیت، تواضع، مسکنت اور انکسار، سادگی، قناعت، زہد و توکل کی زندگی اور علوم وفنون کے ادب واحترام کا ہمہ وقت لحاظ ضروری ہے"۔

## جامع نصاب تعلیم:

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے شائع کردہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی غرض سے ۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو ملتان میں وفاق کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ حضرت شیخ

الحدیث بھی کئی وجوہ سے مجوزہ نصاب کو نا تمام اور قابل ترمیم سمجھتے تھے اور حضرت کی یہ خواہش تھی کہ وفاق المدارس کے ارباب حل وعقد اور نصاب کمیٹی نئے حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے درس نظامی کے دوسو سالہ کامیاب نصاب تعلیم' اس کے نتائج وثمرات اور اکابر کے مشاہدات و ارشادات اور اصول و تجربات کو بھی ملحوظ رکھیں۔ چنانچہ ۲۶ نومبر ۱۹۸۳ء کو آپ نے دارالعلوم حقانیہ کے اساتذہ کی میٹنگ بلائی اور خود بھی باوجود تکلیف وشدت ضعف ونقاہت کے میٹنگ میں موجود رہے' جو ساڑھے تین گھنٹے جاری رہی' جس میں اس نصاب تعلیم پر کافی غور وخوض ہوا۔ اہم تجاویز اور ترمیم زیر بحث آئیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث اور دارالعلوم کے اساتذہ کی آراء وتجاویز پر احقر نے بطور نمائندہ شیخ الحدیث ۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو وفاق کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ملتان میں پیش کیں اور بحث میں حصہ لیا۔ حضرت کی بات مؤثر رہی' سب نے احقر کی ان باتوں کو جو دراصل حضرت کی باتیں تھیں تصدیق کی۔ نصاب کے بارے میں اکیس رکنی کمیٹی قائم کر دی گئی۔ جس نے درس نظامی کو باقی رکھتے ہوئے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر نصاب کی تشکیل جدید کا کام کیا۔ اس موقع پر حضرت شیخ الحدیث کا وفاق کی مجلس عاملہ کے نام خط بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے جس سے حضرت شیخ الحدیث کے نصاب تعلیم اور تعلیمی معیار کے ہدف کی نشان دہی ہوتی ہے۔

''عالم اسلام کے موجودہ دورِ زوال وانتشار اور لادینیت ومغربیت' مادہ پرستی و معدہ پرستی کے عالمگیر سیلاب کے موقع پر علماء اسلام کی بالعموم اور وفاق المدارس کے حالیہ اصلاحِ نصاب کے اجلاس کے شرکاء کی بالخصوص ذمہ داریاں پہلے سے کئی گناہ زیادہ ہو جاتی ہیں۔ نصاب تعلیم میں غور وفکر اور ترمیم واضافہ کا مطمع نظر مدرسہ کی تعلیم' مدرسہ کے طالب علم کی ذمہ داری' اسباق کی تربیت اوقات کا لحاظ' محنت ومطالعہ اور تکرار کے اوقات' دماغی سکون اور دماغی صلاحیت کو جلا دینے اور صیقل کرنے والے ذرائع' اکابر واسلاف کے علوم ومعارف سے وابستگی' علمی

کمالات، امتیاز و اختصاص، صدق و اخلاص کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں اس کا کردار، دنیا کے نقشہ میں اس کی حیثیت اور جاں بلب ملتِ مرحومہ اور مطلق انسانیت کے لئے اس کی مسیحائی و جاں نوازی اور اس کے عظیم علمی و دعوتی مقاصد اور فوائد کی اہمیت ہونا چاہیے''۔

تعلیم کا بنیادی مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل ہے، اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا اہتمام نہ ہو تو اس ہدف تک پہنچنا کارے دارد۔ طلبہ کی اخلاقی و عملی تربیت کا مسئلہ اور اس کی اہمیت کسی طرح بھی تعلیم معیار قائم رکھنے سے کم اہمیت کی حامل نہیں۔ طلبہ کی اخلاقی اصلاح اور سیرت و کردار کی تربیت نہایت ضروری ہے۔ مغربی نظام تعلیم میں تعلیم کی کمی نہیں تربیت کی کمی ہے۔ اسی تربیت کے فقدان کی وجہ سے کالج اور یونیورسٹیز کے تعلیم یافتہ مذہب سے دور اور اخلاق سے عاری ہوتے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

علم مغرب بھی پڑھا زائر لندن بھی ہوئے
مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جوان دین سے بدظن بھی ہوئے
صفت طائر گم کردہ نشیمن بھی ہوئے

حضرت شیخ الحدیثؒ! فرماتے تعلیم کے ساتھ تربیت ہماری اخلاقی زندگی کے لئے ہوا میں سانس لینے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

# سیکولر تعلیم اور اقبال

ہم نے تو حتیٰ الوسع کوشش کر ڈالی کہ ایسے نوجوانوں کو جو استاد بننے کی نا صرف اپنے اندر استعداد رکھتے ہیں بلکہ خواہش بھی رکھتے ہیں ان کے لئے ایک رول ماڈل مہیا کیا جائے۔ اس کتاب کی تیاری میں جتنی تحقیق درکار تھی یقین جانئے کہ ہم نے تو اپنے طور پر (دامے درمے سخنے) ادا کرنے کی سعی بلیغ کی۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ سمندر سے قطرہ بھی سمیٹ نہ پائے یہاں آ کر محسوس ہوا کہ نوجوان نسل جو کہ دینی تعلیم سے بالکل ہی بے بہرہ ہے اُن کو جہاں قرآن و حدیث اور دیگر ذرائع کی ہدایت کے بابت تنبیہات کر ڈالیں وہیں شاعرِ مشرق کے خیالات کا کچھ پرچار بھی کر دیا جائے' سو ملاحظہ کیجئے۔ کیونکہ علم تو ہماری گم گشتہ معراج ہے جہاں سے ملے حاصل کرو۔ (حافظ محبوب)

بات یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ مجھے ایک تقریب میں تقریر کے لئے بلایا گیا تو مجھ سے پہلے ایک مقرر (پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب) نے پوری سعی کر ڈالی کہ کسی طرح ثابت کریں کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سیکولر تعلیم کے حامی تھے۔ بندہ نے وہاں بھی اس کا کچھ جواب دیا اور اب مزید تفصیل درج ہے:

## اقبال سیکولر تعلیم کے مخالف ہیں:

۱۹۳۳ء میں والیِ افغانستان اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے ڈاکٹر اقبال' سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کو افغانستان کے نظام تعلیم اور افغان یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں مشورہ دینے کے لئے دورۂ افغانستان کی دعوت دی تھی۔ اس دورہ پر روانہ ہونے سے قبل ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو علامہ اقبال نے اخبارات کو ایک بیان دیا'

جس میں انہوں نے کہا:

''شخصی طور پر میں یقین رکھتا ہوں کہ تعلیم کو مکمل طور پر لادینی بنا دینے سے کہیں بھی اور خصوصاً مسلم ممالک میں اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے''۔

ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''بحیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم و تربیت میں مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی بے لگام انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔ شاید ایک نئی جنگ کی صورت میں وہ اپنی ہلاکت کا باعث خود ہی ہو''۔

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

''یورپ میں تعلیم کا خالصتاً دنیاوی طریق بڑی تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دوچار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگان ایشیا یورپ کے خالص مادی رویے کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یکجا کیا جائے گا''۔

اقبال نے مندرجہ بالا اقتباسات میں سیکولر (لادینی یا دنیاوی) تعلیم کی مخالفت کی ہے۔ ہمارے خیال میں یہی وہ کلید ہے جس کے ذریعہ سے اس تضاد اور الجھن کو رفع کیا جا سکتا ہے جو علوم جدیدہ سے متعلق اقبال کے افکار کا مطالعہ کے بعد ذہن میں پیدا ہوتی ہے اور یہی اُس سوال کا صحیح حل ہے، جو تیسرے باب کے آخر میں اٹھایا گیا ہے۔

## اصطلاح سیکولر کا مفہوم:

اقبال نے ''سیکولر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کو پوری طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور مختلف لوگوں نے اس کو مختلف معنی پہنا رکھے ہیں۔ ہم یہاں اس اصطلاح کی ایک

جامع تشریح وتوضیح کرنے کی کوشش کریں گے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں سیکولر کے معنی ہیں:

''وہ جس کا تعلق اس دنیا کے معاملات سے ہو''۔

اور سیکولرازم کے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں:

''یہ اصول کہ اخلاق کی بنیاد غیر مذہبی ہو، مملکت کے زیر نگرانی مدارس سے مذہبی تعلیم کو خارج کردینے کی پالیسی''۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے:

سیکولر ایک ایسا لفظ ہے، جس کے معنی کی دو خاص شاخیں ہیں:

۱) دائمی یا طویل اور غیر معینہ عرصہ تک برقرار رہنے والا۔

۲) غیر روحانی، جس کا مذہب یا روحانی معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو۔

پہلا مفہوم براہِ راست کلاسیکی لاطینی زبان سے لیا گیا ہے۔ اس کا استعمال خاص طور پر طریق عمل یا مظاہر کے سائنسی اطلاقات میں ہوتا ہے، مثلاً زمین کا سیکولر (مدامی) طور پر ٹھنڈا پڑ جانا وغیرہ۔

## اصطلاح سیکولرزم کے واضع کا تعارف:

اس اصطلاح کو جارج جیکب ہولی اوک سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ شخص برنگھم (برطانیہ عظمیٰ) میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین دستکار تھے۔ اس کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی، لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد گرجا گھروں میں معاشرتی ہمدردی کے فقدان کو دیکھ کر وہ مذہب سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ پھر اس نے اوین کی اشتراکی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا۔ بالآخر وہ انتہا پسند بن گیا۔ ۱۸۴۱ء میں اس نے خدا کا انکار کیا اور اس کو ارتداد کے جرم میں قید کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد وہ مسیحیت کا دشمن بن گیا۔ لیکن بایں ہمہ وہ مزعومہ الحاد کا ہمدرد بھی نہیں تھا۔ ۱۸۵۰ء میں اس کی ملاقات تحریک الحاد کے مشہور علمبردار بریڈلا سے ہوئی اور اس کے ایک سال

بعد یعنی ۱۸۵۱ء میں اس نے سیکولرزم کی اصطلاح وضع کی۔ بریڈلا اور اس کے دوسرے رفقاء چالیس والٹس، جی ڈبلیوفوٹ وغیرہ ملحد تھے اور یہ سب ہولی اوک کی تحریک میں بھی شریک تھے۔ اس نے اپنی تحریک کو ان لوگوں کے الحاد سے ممیّز کرنے کے لیے سیکولرزم کی اصطلاح تراشی۔ گویا ہولی اوک نہ تو دینیت کا قائل تھا اور نہ الحاد کا علمبردار تھا۔ دینیت کا مفہوم مختصراً یہ ہے کہ خدا کے وجود کو اس طرح مانا جائے کہ وہ خالق کائنات ہے، پاک ومنزہ ہے۔ وہ کائنات کی مشینری کو ایک مرتبہ خلق کرا سے اس کے حال پر چھوڑ کر بیٹھ نہیں گیا ہے کہ وہ اپنے آپ چلتی رہے، بلکہ وہ ہر آن اس کائنات پر محیط ہے۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔ روح انسانی سے اس کا رابطہ و تعلق ہے۔ وہی فطرت کی رہبری کرتا ہے اور انسانوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس الحاد کا مفہوم یہ ہے کہ نہ تو کوئی خدا ہے اور نہ کسی ایسی قادر مطلق ہستی کا وجود ہے، جو کائنات کی خالق، اس کو چلانے والی اور اس کی رہبری کرنے والی ہے۔ ہولی اوک ان دونوں مکاتیب فکر کا قائل نہ تھا۔ وہ نہ تو حامیانِ مذہب کی طرح یہ کہتا تھا کہ خدا ہے اور اس کی طرف سے ہدایت آتی ہے اور نہ ملحدین کی مانند اس امر کا ادعا کرتا ہے کہ نہ تو خدا ہے اور نہ کوئی ہدایت آتی ہے۔ یہ ایک عجیب وغریب طرزِ عمل تھا، جس میں ایک طرف مذہب سے بے تعلقی بلکہ بیزاری نمایاں ہوتی تھی، مگر دوسری طرف الحاد سے لگاؤ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اس عجیب وغریب رجحان کو اس نے سیکولرازم کا نام دیا ہے۔ دینیت اور الحاد ایک دوسرے سے متصادم بھی ہیں اور ایک دوسرے کے نقیض بھی ...... لیکن سیکولرزم کے حامیوں، ہولی اوک اور اس کے ساتھیوں کا ادعا یہ تھا کہ وہ نہ تو مذہب کے مخالف ہیں اور نہ الحاد کے موافق بلکہ دونوں سے بے تعلق ہیں۔

یہ تو تھا سیکولرازم کی اصطلاح اور اس کے واضع کا مختصر سا تعارف۔

لغت وانسائیکلو پیڈیا کے بیانات، ہولی اوک اور اس کے پیروؤں کی تصریحات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرازم مذہب سے محض بے تعلقی کا نام ہے اور سیکولر تعلیم

سے مراد ایسی تعلیم ہے، جس میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہ ہو...... تعلیم کا مقصد و منشا بھی یہ ہے کہ مظاہر فطرت، آثار کائنات اور واقعات و کوائف عالم کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے اندر چھپے ہوئے حقائق کا پتہ چلایا جائے۔ پھر یہ مطالعہ بھی بے لاگ طریقہ پر ہوتا کہ حقیقت کما حقہ یعنی جیسی کچھ کہ وہ ہے، نظر آ جائے۔ اسی کو ہم معروضی طریقہ کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سیکولر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انکشاف حقائق میں مذہبی رجحانات کو اثر انداز ہونے نہ دیا جائے اور معروضی طریقہ کا منشا بھی یہ ہے کہ حقائق کا مطالعہ ہر قسم کے داخلی و خارجی اثرات سے آزادرہ کر کیا جائے۔ گویا سیکولر تعلیم اور معروضی طریقۂ تحقیق ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ معروضی طریقہ میں ہر قسم کے اثرات کو خارج کر دیا جاتا ہے اور سیکولر تعلیم میں مذہبی اثرات کے اخراج پر زور دیا جاتا ہے...... پھر جب بات اتنی سی ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال سیکولر تعلیم کے مخالف کیوں ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ بات اتنی سی نہیں ہے اور سیکولرازم کی حقیقت بھی صرف وہی نہیں ہے جو لغت اور ہولی اوک کی تصریحات سے ظاہر ہوتی ہے۔ درحقیقت سیکولرازم صرف ایک اصطلاح ہی نہیں ہے بلکہ وہ اب موجودہ مہذب و ترقی یافتہ دنیا کا اندازِ فکر اور اس کا طرزِ زندگی بن چکا ہے۔ اقبال دراصل اس اندازِ فکر و نظر اور طریقۂ حیات کے مخالف ہیں۔ پھر یہ طرز فکر و طریقۂ حیات بس یوں ہی معرض وجود میں نہیں آ گیا، بلکہ اس کے پیچھے بعض عوامل و محرکات کارفرما رہے ہیں اور ان سب کا ایک تاریخی پس منظر ہے، جسے پیش نظر رکھے بغیر سیکولرازم کی حقیقی نوعیت اور اس کی پوری ماہیت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

## اقبال اور سیکولرازم:

اقبال کی فکر بنیادی طور پر اسلامی ہے۔ وہ واشگاف انداز میں کہتے ہیں:

"میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام، اس کے نظام شریعت و سیاست، اس کی ثقافت اس کی تاریخ و ادب کے بغائر نظر مطالعہ میں گزارا ہے۔ اسلام کی

روح (جو وقت پر اپنے آپ کو آشکارا کرتی ہے) سے اتصال دائمی نے مجھ میں ایسی بصیرت پیدا کر دی ہے' جس کی رو سے' میں اسلام کی اہمیت کا ایک عالمی حقیقت کی حیثیت سے ادراک کر سکتا ہوں۔

ان بیانات سے یہ بات بلاشبہ پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ اسلام ہے۔ لیکن ہمارے موضوع کے لحاظ سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب کی سے حیثیت سے اسلام کے متعلق اقبال کا کیا تصور ہے؟ کیا وہ بھی اس کو ایک پروھتی طرز' ایک پیشوائی طریق یا کلیسائی نظام سمجھتے ہیں؟

وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کوئی کلیسا نہیں ہے''۔

ایک اور جگہ وہ ذرا وضاحت سے کہتے ہیں:

''اسلام میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں' کیونکہ اسلام میں کلیسا جیسی کسی ایسی تنظیم کا وجود نہیں ہے' جو ازمنۂ وسطیٰ کی مسیحیت کے مشابہ ہو اور جو ایک مسمار کنندہ کو دعوت تخریب دیتی ہو''۔

کیا اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں بھی عہد قدیم کے پراچین بھارت کے براہمن راج کی مانند کوئی ملا راج ہے؟ یا ان کا یہ تصور ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کی پاپائی حکومت کی طرح اسلام بھی پیشوائی حکومت کا نقشہ پیش کرتا ہے؟ کیا اسلام بھی ایک ایسی گھٹیا سیاسی تنظیم ہے' جس میں مذہب ایک ایسے جتھے کا آلۂ کار بن جاتا ہے' جو معصومیت کا ردا اوڑھے' بزرگی کا جامہ پہنے' تقدس کا نقاب منہ پر ڈالے' اپنے اختیارات کا ادعا کرتا اور اپنے ہی جیسے انسانوں پر اپنی حاکمیت و بالادستی قائم کرنے کے لئے عدالت ہائے احتساب کا وحشیانہ نظام رائج کرتا ہے؟

اقبال جواب دیتے ہیں کہ اسلام نہ تو پروھت راج ہے اور نہ ہی پاپائی نظام۔ اسلام میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ تو کوئی معصوم عن الخطا ہے اور نہ زبانی اختیارات کا حامل نائب خدا۔ نظری لحاظ سے اسلام میں حاکمیت و فرمان کسی فرد' گروہ یا جتھے کو یا

مجموعۂ افراد یعنی عوام کو حاصل نہیں' بلکہ حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اسلام بحیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندگی عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔اس کا مطالبۂ وفاداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت وتاج کے لئے اور چونکہ ذاتِ باری تمام زندگی کی قطعی روحانی اساس سے عبارت ہے' اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت کی اطاعت کیشی اختیار کرتا ہے''۔

آمری از ماسوا اللہ کافری است

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری

عملی طور پر اسلامی نظام حکومت نام ہے' اس طریقۂ حکمرانی کا جس میں اسلام کے عظیم اور مثالی اصول کارفرما ہوں۔یہاں کوئی ایک فرد یا چند افراد ربانی اختیارات کے حامل نہیں ہیں بلکہ صرف ان اصولوں کو عملی طور پر نافذ کرنے والے ہیں اور بس! اقبال لکھتے ہیں:

''از روئے اسلام ریاست کا مطلب ہوگا' ہماری یہ کوشش کہ یہ عظیم الشان اور مثالی اصول زمان ومکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔وہ گویا ایک آرزو ہے' ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں مشہود دیکھنے کی لہٰذا اسلامی ریاست کو حکومت الٰہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو انہی معنوں میں۔ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمام اقتدار کسی ایسے خلیفۃ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں دے دیں' جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جور واستبداد پر ہمیشہ ایک پردہ ڈال رکھے''۔

اسی سلسلہ میں وہ ذرا آگے چل کر واضح طور پر کہتے ہیں:

''اسلامی نقطہ نظر سے ریاست کے معنی ہوں گے ہماری یہ کوشش کہ ہم جسے روحانی

کہتے ہیں اس کا حصول اپنی ہیئت اجتماعیہ میں کریں۔لیکن پھر ان معنوں میں تو
اس ریاست کو حکومت الٰہیہ ٹھہرایا جائے گا جس کی بناء استیلاء اور تغلب کی بجائے
مثالی اور عینی اصولوں پر ہے''۔

جب اسلام میں نہ تو کسی فرد یا ٹولہ کی فرماں روائی ہے اور نہ کسی کو خدائی اختیارات حاصل ہیں تو پھر عدالت ہائے احتساب کا کیا سوال؟ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ مذہبی بنیادوں پر اگر معاشرے کی تشکیل کی جائے تو لازمی ہے کہ عدالت ہائے احتساب کا ادارہ بھی وجود میں آجائے۔علامہ نے پنڈت جی کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا:

''یہ خیال درحقیقت مسیحیت کی تاریخ کی روشنی میں صحیح ہے' لیکن اسلام کی تاریخ پنڈت جی کی منطق کے برخلاف' یہ بتاتی ہے کہ اسلام کی گزشتہ تیرہ سو سالہ زندگی میں ادارہ ''عدالت احتساب'' قطعی طور پر مسلمان ممالک کے لئے ایک غیر معروف شے ہے۔قرآن مجید واضح طور پر اس قسم کے ادارے کی ممانعت کرتا ہے۔وہ کہتا ہے ''دوسروں کی کمزوریوں کی کھوج میں نہ پڑو اور اپنے بھائیوں کے خلاف افسانے نہ تراشو''۔حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے پنڈت جی پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ یہودی اور عیسائی اپنے ملکوں کی مذہبی سزاؤں سے بچنے کے لئے اسلامی ممالک میں پناہ لیا کرتے تھے''۔

الغرض اقبال کی نظر میں اسلام نہ تو کلیسائی نظام ہے نہ پروہتی و پیشوائی راج۔ نہ اس میں پروہتوں و پادریوں کی مانند ملاؤں کی حکومت ہوتی ہے اور نہ یہاں کوئی عدالتِ احتساب ہی قائم ہے۔تو پھر کیا اسلام' روح و مادہ کی ثنویت اور اس طرح دین و دنیا کی جدائی کا حامی ہے؟ اس سوال کے جواب سے پہلے ذرا اقبال کی زبان سے یہ حقیقت بھی مختصراً سن لیجئے کہ روح و مادہ کی ثنویت اور اس طرح دین و دنیا کی جدائی کا تخیل کس طرح پیدا ہوا اور یہ کہ روح و مادہ کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس قدیم غلط خیالی (یعنی روح و مادے کی دوئی) کا سبب وہ تفریق ہے' جو ذاتِ انسانی کی وحدت میں یہ سمجھتے ہوئے' پیدا کی گئی ہے کہ ہمارا وجود دو الگ الگ حقیقتوں کا مجموعہ ہے لیکن جو باہم اتحاد و اتصال کے باوجود بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں' حالانکہ یہ روح ہی تو ہے کہ جب اسے زمان و مکان کے حوالے سے دیکھا جائے تو مادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا انسان عبارت ہے جس وحدت سے کیا اس کے اعمال و افعال کا مشاہدہ عالم خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو ہم اسے بدن لیکن جب ان کی حقیقی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی گئی تو روح کہیں گے''۔

## سیکولر تعلیم کا مفہوم:

آیئے اب ذرا سیکولر تعلیم پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں سیکولر تعلیم کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے: ''یہ ایک طریقۂ تربیت ہے جس سے قطعی طور پر مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا گیا ہو''۔

ماہرین تعلیم نے علوم کی دو بڑی قسمیں قرار دی ہیں:

① علوم طبیعی یا فطری۔

② علوم عمرانی۔

## علوم طبیعی یا فطری:

علوم فطری یا طبیعی سے مراد وہ علوم ہیں جن کا موضوع مظاہر فطرت ہیں یعنی جن میں کائنات کے کسی مظہر یا اس کے جزو کو لے کر اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً کیمیا' طبیعیات' نباتیات' حیوانیات وغیرہ۔ ان علوم کو علوم صحیحہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے مطالعہ میں مشاہدہ' تجزیہ و تحلیل سے کام لیا جاتا ہے اور اس مطالعے کے نتائج میں سے بیشتر کو تجربہ گاہوں میں چھان پھٹک کر ایسے حقائق اخذ کئے جاتے ہیں جو بالعموم صحیح ہوتے ہیں۔ ان ہی علوم کو آج کل عرف عام میں سائنس کہا جاتا ہے۔

## علوم عمرانی:

علوم عمرانی سے مراد وہ علوم ہیں جن کا موضوع انسان اور مختلف حالتوں میں اس کا رویہ ہے یعنی وسیع معنی میں ان علوم میں انسان کے اس طرز عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو وہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے اختیار کرتا ہے مثلاً معاشیات' عمرانیات' سیاسیات وغیرہ۔ ان علوم میں بھی مطالعہ کے دوران مشاہدہ' تجزیہ وتحلیل سے کام لیا جاتا ہے' مگر ان کے نتائج کو تجربہ گاہوں میں چھان بین کر کے ان کے متعلق صحت و عدم صحت کا حکم قطعی نہیں لگایا جا سکتا' اسی لئے ان کو علوم غیر صحیحہ کہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ علوم غلط ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی صحت وعدم صحت کا وہ معیار نہیں ہے' جو علوم طبیعی کا ہوتا ہے۔

سیکولر تعلیم کا مفہوم یہ ہے کہ علوم کو چاہے وہ علوم طبیعی ہوں یا علوم عمرانی اس انداز سے پڑھایا جائے کہ ان پر کسی مذہب کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے پائے۔ مثلاً علم طبیعیات میں اگر مادہ کے متعلق تعلیم دینی ہو تو اس کی قسمیں' اس کے خواص وغیرہ کا تفصیلی مطالعہ' مشاہدہ اور تجزیہ وتحلیل وغیرہ کیا جائے لیکن اس کے متعلق یہ نہ بتایا کہ اسلام یا کسی مذہب نے اس کے آغاز وانتہا کے متعلق کیا خیال پیش کیا ہے۔ بالفاظ دیگر مظاہر کائنات میں سے ہر مظہر یا اس کے کسی جزء کا مطالعہ معروضی انداز میں کیا جائے۔ یہی حال سیکولر انداز سے علوم عمرانی سیکھنے اور سکھانے کا ہے کہ یہاں بھی کسی مسئلہ میں اس امر سے قطعی تعرض نہ کیا جائے کہ مذہب کیا کہتا ہے مثلاً علم معاشیات میں اس امر کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ انسان نے اپنی غیر محدود ضروریات وخواہشات کو پورا کرنے کے لئے کس طرح اپنے محدود وسائل سے کام لیا ہے اور اس کا اس تمام جدوجہد میں کس قسم کا طرز عمل رہا ہے اور اس نے کون کون سے ادارے بنائے اور ان سے کیا کیا کام لیا۔ اس مطالعہ میں اس امر سے بالکل اغماض برتا جائے گا کہ انسان کی اس جدوجہد کو مذہب نے کس رخ اور کس نہج پر ڈالنے کی کوشش کی اور کشمکش

حیات نے اس شعبہ میں اس کی کیا رہنمائی کی۔ یہ مطالعہ بھی بالکلیہ معروضی ہوگا۔

## علوم طبیعی کی سیکولر تعلیم اور اقبال:

جہاں تک علوم طبیعی کی سیکولر تعلیم کا تعلق ہے' اسلام ان علوم کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ہم اوراق گزشتہ میں تفصیل سے ذکر کر آئے اور اسلام مشاہدۂ فطرت پر زور دیتا ہے۔ فطرت کے مختلف مظاہر پر تدبر کرنے' غور وفکر کرنے' ان کا تجزیہ وتحلیل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ استقرائی طرزِ استدلال کا مؤید بھی ہی نہیں داعی بھی ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید کے بیشتر دلائل کی نوعیت استقرائی ہے۔ اسی طرح وہ تجربی تحقیق کا ہمنوا ہے۔ اس نے انسان کو حقائق معلوم کرنے کے لئے تجربہ کا طریقہ تحقیق استعمال کرنے کی توجہ دلائی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے پچھلے اوراق میں علامہ اقبال کے خیالات تفصیل کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ پھر مشاہدہ' تجزیہ وتحلیل اور تجرباتی طریق تحقیق کے بعد علوم طبیعی کے اخذ کردہ جو نتائج سامنے آتے ہیں' وہ اسلام کے پیش کردہ حقائق سے کسی طرح متعارض یا متصادم نہیں ہیں۔ یہی خیال اقبال نے پیش کیا ہے کہ سائنس اور اسلام میں کوئی دشمنی نہیں بلکہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ البتہ بعض سائنسدانوں کے اخذ کردہ نتائج' جن کی نوعیت ''امر واقعہ'' کی نہیں بلکہ امر نظری کی ہے' اسلام کے بیان کردہ بعض حقائق سے جزءً مختلف نظر آتے ہیں۔ یہ اختلاف بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا' اس لئے کہ اول تو یہ مختلف دو حقیقتوں کے مابین اختلاف نہیں ہے' بلکہ ''واقعی'' حقیقت اور ''نظریہ'' کے درمیان ہے اور دوسرے یہ کہ اس امر کا قوی امکان ہے کہ آئندہ جوں جوں انکشافات سے جدید حقائق منظر عام پر آئیں گے تو سائنسدان خود اپنے ان ''نظریات'' پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ گویا بقول اقبال اسلام اور سائنس میں آئندہ زیادہ اہم آہنگی پائے جانے کا قوی ترین امکان ہے۔ یوں علوم طبیعی یا علوم صحیحہ یعنی سائنس کی تعلیم اگر سیکولر انداز میں ہو تو اسلام کے نقطہ نظر سے بادی النظر میں چنداں ہرج کی بات دکھائی نہیں

دیتی۔ لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ مسئلہ بھی اتنا سیدھا سادا نہیں ہے۔

اگر علوم طبیعی یعنی سائنس کی تعلیم از اول تا آخر بالکل سیکولر انداز میں دی جائے اور مذہب کی کوئی بھنک تک طالب علم کے کان میں نہ پڑنے پائے تو پھر اس سے ایک ایسے ذہن کے پیدا ہونے کا خطرہ ہے' جو لازماً انسان کو الحاد کی طرف لے جائے گا۔ یعنی اگر ایک طالب بس یہی پڑھتا رہے کہ مادے کے فلاں فلاں خواص ہیں' پھر اس پر خاص خاص عوامل کے یہ یہ اثرات ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور اسی انداز سے اس کے ذہن کی تعمیر تعلیم کے ابتدائی منازل سے لے کر آخری مراحل تک ہوتی رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ وہ ان مختلف مظاہر کو قائم بالذات یعنی اپنے آپ پیدا شدہ اور اپنے آپ محرک و عامل سمجھنے لگے گا اور اس کا ذہن اس بات کو قبول کرنے سے گریز کرے گا کہ ان مظاہر فطرت کے پیچھے کارفرما کوئی اور طاقت وقوت بھی ہے۔ اس طرح ذہنی طور پر وہ الحاد کی طرف لڑھکتا جائے گا...... یا نہیں تو بدرجۂ اقل وہ اس ''کارفرما طاقت'' کی اہمیت کا قائل نہیں رہے گا۔ بالفاظ دیگر سائنس کی تعلیم ''خالص سیکولر'' انداز سے دی جائے تو اس امر کا خطرہ ہے کہ بالآخر طالب علم کا ذہن الحاد کی طرف مائل ہو جائے گا اور یا تو وہ خدا اور مذہب کے وجود ہی سے انکار کر بیٹھے گا یا پھر خدا و مذہب کو غیر اہم قرار دے کر ان سے فرار کی راہ اختیار کرے گا۔ اسی لئے اقبال اکبر الٰہ آبادی کے ہمنوا ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''مولانا اکبر الٰہ آبادی...... نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اٹھتے ہیں:

شیخ محرم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

''شیخ مرحوم سے کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا سے' جو مغربی تعلیم کے بارے میں سرسید احمد خان مرحوم کے ساتھ مدت العمر بڑا

جھگڑا کیا' آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بے چارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہیں تھا۔
کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے''۔

سائنس کی سیکولر تعلیم کے ان اثرات کا اقبال نے صرف نظری طور پر ایک گونہ اندازہ ہی نہیں لگایا تھا بلکہ عملی طور پر انہیں اس کا تجربہ بھی ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے عمرانی' اخلاقی' سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔ روحانی طور پر بہ منزلۂ ایک بے جان لاش ہے اور اگر موجودہ صورت حال اور بیس سال قائم رہی تو وہ اسلامی روایات جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے' ہمارے جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی''۔

اسی لئے یہ ضروری ہے کہ ان علوم کو سکھانے سے پہلے ہی طالب علم کو ابتداء ہی میں' اس کے غور و فکر کے لئے ایک نقطہ آغاز دے دیا جائے تاکہ وہ جوں جوں تعلیمی ترقی کے مراحل طے کرتا جائے' اس نقطہ آغاز کی روشنی میں اس کے ذہن کا ایک مخصوص سانچہ بنتا رہے اور اس طرح وہ سیکولر تعلیم کے مذکورہ بالا نقصان سے محفوظ رہے۔ اقبال کی نظر میں یہ نقطہ آغاز ہے قرآن مجید کی تعلیم! چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہئے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے''۔

یہاں قرآن مجید کی تعلیم سے اقبال کی مراد وہ تعلیم نہیں جو بالعموم مسلمان خاندانوں میں ماضی قریب میں رائج تھی یا اب بھی کہیں کہیں رائج ہے یعنی قرآن کا ناظرۃً پڑھا دینا' کیونکہ اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو اقبال کے پیش نظر ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم سے مراد اس کی بامعنی تعلیم ہے۔ اگر بچہ کو ابتداء ہی سے قرآن مجید بامعنی پڑھا دیا جائے اور اس کے مطالب ذہن نشین کرا دیئے جائیں تو اس کے شعور

اور تحت شعور میں یہ بات رچ بس جائے گی کہ یہ کائنات یوں ہی عدم سے وجود میں نہیں آ گئی اور یہ کہ اس کے اندر جتنے مظاہر نظر آتے ہیں وہ کتنے ہی محیر العقول کیوں نہ ہوں' بہر حال ان کے پیچھے ایک عظیم الشان قوت کار فرما ہے۔ یہ کائنات اور اس کے ان گنت مظاہر' پھر ان مظاہر کا باہمی ربط و اتصال اور ان میں سے ہر ایک کی نہایت ہی پیچیدہ مشینری' اور اس مشینری کا خاص خاص اصولوں کے تحت اپنا اپنا کام انجام دیتے رہنا' یہ سب اس بات پر شاہد عادل ہیں کہ یہ کارخانہ کسی اندھی بہری قوت کے ہاتھوں نہیں چل رہا ہے بلکہ یہ سب کچھ ایک ذی شعور صاحب ارادہ وقوت ہستی کے ادنیٰ سے اشارہ (کن) کی کرشمہ سازیاں (فیکون) ہیں۔ جب طالب علم کے ذہن میں ابتداء ہی سے یہ بات بیٹھ جائے گی' تو پھر وہ جیسے جیسے سائنس کی تعلیم میں آگے کی منزلیں طے کرتا جائے گا اس کے ذہن میں یہ نقش اور زیادہ گہرا ہوتا جائے گا۔ اب اگر فرض کیجیے کہ وہ اناٹومی یا فزیالوجی کا طالب علم ہے تو انسانی جسم کے مختلف اعضا' ان کی ساخت و بناوٹ' ان کے آپس کے جوڑ اور میل' ان کی حرکات وسکنات' ان کے اعمال وظائف ان سب اُمور کے متعلق اس کا مطالعہ جتنا گہرا اور تحقیقی ہوتا جائے گا' اس کے ذہن کا ایک ایک گوشہ پکار اٹھے گا کہ فتبارک اللہ احسن الخالقین !! پھر جب وہ اس مرحلہ سے بھی آگے بڑھ کر علم کے کسی خاص شعبہ میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کی غرض سے تحقیقی میدان میں قدم رکھے گا تو اس کے ذہن پر ثبت شدہ یہ ابتدائی نقش' اس کے قدم کو لڑکھڑانے سے باز رکھے گا اور اس خصوصی شعبے میں وہ جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا' بجائے اس کے کہ اپنی قابلیت و مہارت پر اترانے لگے وہ اپنی جبین نیاز کو عجز و انکسار کے ساتھ اس حقیقتِ کلی کے آگے جھکا دے گا' جس کے پیدا کردہ ایک معمولی سے ذرہ' جوہر' میں اتنی بے حساب توانائی بھری پڑی ہے جو پوری نسل آدم کو تباہ و برباد کر سکتی ہے!! اسی لئے اقبال نے مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

''علم سے میری مراد وہ علم ہے' جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے' جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم' علمِ حق کی ابتدا ہے' جیسا کہ میں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے:

علمِ حق اول حواس آخر حضور
آخر اُو می نہ گنجد در شعور

وہ علم' جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم حق کی آخری منزل ہے' اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامہ میں کئی اشعار ہیں:

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو' جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے۔ ''بولہب را حیدر کرار کن'' اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے رحمت ہے''۔

یہ تو تھا اقبال کے افکار کی روشنی میں علوم طبیعی یعنی سائنس کی تعلیم کا طریقہ۔ اب ذرا علوم عمرانی کی سیکولر تعلیم پر غور کیجیے۔

## اقبال اور علوم عمرانی کی سیکولر تعلیم:

علوم عمرانی کی سیکولر تعلیم کا مفہوم جیسا کہ بتایا جا چکا ہے' یہ ہے کہ ان علوم کو پڑھاتے وقت مذہب کے افکار و ہدایات سے مطلق اعتناء نہ کیا جائے۔ ہم نے یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ علوم عمرانی کو علوم صحیحہ نہیں کہا جاتا۔ اس بات پر تمام ماہرین تعلیم کا اتفاق ہے کہ آج تک ایسی کوئی تجربہ گاہ نہیں بنائی جا سکی' جہاں ان علوم کے اخذ کردہ نتائج کی چھان پھٹک کر کے' ان کی صحت ، عدم صحت کے متعلق کوئی قطعی حکم لگایا جا سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان علوم کے موضوع بحث کا سب سے بڑا

عنصر ''انسان'' ہے اور انسان کوئی ایسی شے مثلاً آکسیجن وغیرہ تو ہے نہیں جس کو تجربہ گاہ میں بند کر کے اس کا تجزیہ کیا جائے اور اس پر دوسرے عوام کے اثرات اور ردِعمل معلوم کئے جائیں۔ پھر خود انسان اور اس کا ذہن' ایک کائنات اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ وہ کوئی جامد شے نہیں ہے کہ اس کو جس طرح چاہا' تجربہ کی غرض سے اُلٹ پلٹ کر لیا۔ وہ ایک حرکی عنصر ہے جس کے عمل اور ردِعمل کے متعلق باوجود ہزارہا تجربوں کے کوئی ٹھوس اور مستحکم اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک موقع پر خاص قسم کے حالات میں وہ ایک خاص ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن دوسرے موقع پر اسی قسم کے حالات میں اس سے بالکل مختلف ردِعمل صادر ہوتا ہے۔ وہ تنہائی میں ہو تو کچھ ہوتا ہے اور اپنے اہل وعیال و اہلِ خاندان کے ساتھ ہو تو کچھ اور ہوتا ہے اور مجمع عام میں ہو تو ان دونوں مواقع سے کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ وہ خلوت میں کچھ ہے تو جلوت میں کچھ اور۔ انسان کی اس ''حرکی خصوصیت'' کے باعث علوم عمرانی میں قطعی صحیح نتائج کا حصول کارے دارد والی بات ہے۔ یہاں ہم نے مثال کے طور پر صرف ایک سبب کا ذکر کیا ہے' اس کے علاوہ بھی متعدد اسباب ہیں' جن کی بناء پر علوم عمرانی کو علوم صحیحہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم میں ہم کو متضاد نظریات و متناقض اصول ہی نہیں ملتے بلکہ ان میں مخالف و متصادم مکاتب فکر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی ایک بہت ہی نمایاں مثال ہمیں اقتصادیات میں نظر آتی ہے۔ یہاں وہ نظریات و اصول بھی ہیں جن کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ نظام عالم وجود میں آیا اور وہ افکار و تصورات بھی ہیں جنہوں نے اشتراکیت و اشتمالیت کو جنم دیا۔ اب ایک طرف تو ایک پورا مکتبِ فکر سرمایہ داری کی پشت پر ہے۔ اور دوسری طرف ایک مدرسۂ خیال اشتراکیت و اشتمالیت کا نقیب ہے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں اب مکاتبِ فکر کی حیثیت سے بھی آگے بڑھ کر خود ایک ''مذہب و دین'' بن گئے ہیں۔ علم معاشیات کے نقطۂ نظر سے فکر و نظر کی دنیا میں ان کو جو بھی درجہ دیا جائے' لیکن عملی لحاظ سے یہ دونوں حیاتِ

انسانی کے دو مختلف نظام اور زندگی کے دو متضاد نہج بن گئے ہیں۔ ان کے آپس کے اس اختلاف ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت منتہٰ سے یہ دونوں بہت دور ہیں۔ اب مصیبت یہ ہے کہ یہاں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے' ایسی کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے جس میں ان دونوں کو رکھ کر جانچا جائے اور پرکھا جائے۔ یہ تو ہم نے صرف ایک مثال دی۔ یہی حال تقریباً تمام علوم عمرانی مثلاً سیاسیات' عمرانیات' قانون وغیرہ کا ہے۔ یہاں قدم قدم پر اختلافات اور تضادات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں ان علوم کی سیکولر تعلیم کا مطلب یہ ہوگا کہ طالب علم ''حقیقت'' تک رسائی حاصل کرنے کے بجائے کسی ایک مکتب فکر کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے!۔

علوم عمرانی کے سلسلہ میں ایک خاص بات قابل غور یہ ہے کہ اسلام کا ان علوم سے متواتر سابقہ پڑتا رہتا ہے کیونکہ دونوں کا موضوع تقریباً ایک ہے۔ علوم عمرانی میں انسان اور اس کے اس طرز عمل سے بحث کی جاتی ہے' جو اس دنیا میں اپنی زندگی گزارنے کے لئے وہ اختیار کرتا ہے۔ اور اسلام بھی انسان کو اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طور طریقوں کے اصولوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے برعکس علوم طبیعی کے ''موضوعات'' کا براہِ راست اسلام سے کوئی سابقہ نہیں پڑتا۔ الغرض چونکہ اسلام کا علوم عمرانی کے موضوعات سے براہِ راست تعلق و سابقہ ہے اسی لئے اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے ان کو سیکولر طریقہ پر پڑھانے میں گوناں گوں خطرات مضمر ہیں۔

ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام کا دائرۂ عمل صرف روحانیات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی ایک عمرانی ہیئت بھی ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام کا اپنا ایک علیحدہ اور منفرد سماجی' معاشی' سیاسی اور قانونی نظام ہے۔ اب اگر فرض کیجئے کہ آپ ایک طالب علم کو معاشیات کی تعلیم سیکولر انداز میں دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس کو کلاسیکی انداز معاشیات میں وہ تمام نظریے پڑھائیں گے' جن سے سرمایہ دارانہ نظام کی تعمیر ہوئی ہے۔ یا پھر وہ اصول وقوانین پڑھائیں گے جو سائنسی اشتراکیت کے سنگ ہائے بنیاد ہیں۔ ایسی صورت میں وہ طالب علم اس

معاشی نظام سے نابلد رہ جائے گا' جس کے خدوخال کو اسلامی تصورات اور قرآنی اصولوں نے اجاگر کیا ہے۔ معروضی نقطہ نظر سے بھی یہ بات علمی دیانت کے خلاف ہے کہ انسان کی معاشی جدوجہد کے مطالعہ کے سلسلہ میں وہ افکار ونظریات تو پڑھائے جائیں جو آدم اسمتھ سے لے کر سر جان مارشل اور لارڈ کینز کے زمانے تک پیش کیے گئے یا جو رابرٹ اوین اور مزدک ایرانی سے لے کر کارل مارکس' اینگلز' ٹراٹسکی اور لینن نے پیش کیے اور نام نہ لیا جائے تو ان افکار و اصولوں کا' جن کو اسلام پیش کرتا ہے۔ یہی بات دیگر تمام علوم عمرانی کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ گویا علوم عمرانی کی سیکولر تعلیم کے معنی یہ ہوئے کہ ان علوم میں وہ افکار ونظریات' اصول اور قوانین تو پڑھائے جائیں گے جو ان علوم کے نظریہ سازوں اور مفکروں نے پیش کیے ہیں اور اسلام نے جو افکار پیش کیے ہیں' جو اصول بتائے ہیں اور جن احکام کی ہدایت دی ہے ان سے صرف نظر کر لیا جائے گا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اقبال کا تصور یہ ہے کہ اسلام کا عمرانی ...... (سماجی' معاشی' سیاسی' قانون وغیرہ) نظام اس کے روحانی نظام سے غیر منفک ہے۔ یہ سب ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے باہم اس طرح پیوست ہیں کہ ایک کے ترک کر دینے سے دوسرے کا ترک کر دینا لازم آتا ہے۔ وہ بار بار اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظام زندگی ہے۔ اس صورت میں علومِ عمرانی کی سیکولر تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ طالب علم کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ جائے گا کہ انسان کو اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے وہ طور طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو علومِ عمرانی کے ماہرین نے بتائے ہیں۔ اب رہا اسلام تو اس کے پاس یا تو اس قسم کے افکار و خیالات' اصول اور ضابطے سرے سے ہیں ہی نہیں یا اگر ہیں تو چنداں قابل اعتنا نہیں ہیں۔ طالب علم کے ذہن پر اس قسم کا نقش بٹھا دینے سے وہ یہی تاثر لے گا کہ اسلام کا اپنا کوئی قابل ذکر عمرانی نظام نہیں ہے اور یہ کہ اسلام صرف چند معتقدات کا ایک مجموعہ ہے اور بس!...... اس قسم کے تاثر کا پیدا ہونا اقبال کے نزدیک اسلام ہی کے ترک کر دینے کے مترادف ہے کیونکہ اسلام ان کی نظر میں ایک ایسا ''کل'' ہے جس کے تمام اجزاء نہ صرف ایک دوسرے سے مربوط بلکہ ایک

دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ ایک کے چھوڑ دینے سے دوسرے کے ترک کر دینا لازم آتا ہے۔ لہٰذا اقبال کے افکار کی روشنی میں یہ نتیجہ لازماً اخذ کیا جائے گا کہ علوم عمرانی کی تعلیم سیکولر انداز میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان علوم کو پڑھاتے وقت اسلامی افکار وتصورات' اصول ونظریات کو بھی ساتھ ساتھ لازماً پڑھا جائے۔

اقبال کو اسلام کے ساتھ عقیدت ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔ اسی لئے انہیں اسلامی علوم سے خصوصاً ان علوم سے جو اسلام کی عمرانی ہیئت سے بحث کرتے ہیں' غیر معمولی شغف ہے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ ان علوم کے غائر مطالعہ میں انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ گزارا تھا اور اس مطالعہ کے بعد ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے جس کا اظہار انہوں نے بڑے اعتماد اور وثوق سے اس طرح کیا:

> ''یقین جانئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتیاتی نفسیاتی عمل ہے' جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر وعمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے''۔

اسلام سے اقبال کے اس عشق اور اسلامی علوم عمرانی سے اس شغف کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عمرانی علوم کی سیکولر تعلیم کے وہ نہ صرف مخالف ہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان علوم کو اسلام کی روشنی میں پڑھایا جائے۔ ''دین کلی'' کی کسوٹی پر انہیں جانچا اور پرکھا جائے اور ضرورت ہو تو اسی نقطۂ نظر سے ان میں ترمیم وتدیلی کی جائے۔

## خلاصہ:

جو کچھ اوراق گزشتہ میں کہا گیا ہے ان کا ایک اجمالی خاکہ پیش نظر ہے:

☆ سیکولرازم مسیحیت (یا مذہب) اور حکمت جدیدہ کے مابین شدید تصادم کے نتیجے کے طور پر وجود پذیر ہوئی۔

☆ یہ بظاہر مذہب سے صرف بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے لیکن حقیقت میں فطری طور پر اس کا جھکاؤ مذہب کے برخلاف' الحاد کی طرف ہے کیونکہ سیکولرازم اور

الحاد دونوں نے کلیسا کے جبر و تشدد کے خلاف مشترکہ طور پر جنگ کی ہے۔

☆ سیکولرازم دین و دنیا کی تفریق کا شاخسانہ ہے۔ اس نے مذہب کو انسان کی اجتماعی زندگی سے خارج کر کے اس کے اجتماعی معاملات پر پوری طرح اپنا قبضہ جمالیا ہے۔ اس طرح وہ ''لادین جزوی'' ہے۔

☆ اقبال کی فکر بنیادی طور پر اسلامی ہے۔ وہ اسلام کو ''دین کلی'' سمجھتے ہیں اور انسان کی نجی، انفرادی و اجتماعی زندگی دونوں میں اس کو کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ دین کلی کی حیثیت سے اسلام کے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کا رُوحانی نظام (یا عقیدہ) اس کے اجتماعی، عمرانی نظام سے اس طرح پیوست ہے کہ ایک کے انکار سے دوسرے کا انکار لازم آتا ہے۔

☆ اسی طرح ان کی نظر میں اسلام (دینِ کلی) اور سیکولرازم (لادین جزوی) ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اسی لئے وہ سیکولرازم کے مخالف ہیں۔

☆ یورپ نے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے سیکولر طریقہ اس لئے اپنایا تھا کہ مسیحیت ان علوم کی مخالف تھی اور کلیسا کے جبر و استبداد نے ان علوم کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ اس طریقۂ تعلیم کو اپنائے بغیر یورپ کلیسا سے نہ تو اپنا گلا چھڑا سکتا تھا اور نہ ان علوم کی خاطر خواہ نشو و نما ہی ہوسکتی تھی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسلام کا رویہ ان علوم کے تعلق سے قطعاً وہ نہیں ہے جو کلیسا کا تھا۔ اسلام ان علوم کا حامی و مؤید ہے اور ان کی ترقی و نشو و نما کا زبردست خواہاں ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو ان کی تحصیل پر نہ صرف اکساتا ہے بلکہ ان علوم کو آگے بڑھانے پر بھی ابھارتا ہے۔ ایسی صورت میں سیکولر طریقۂ تعلیم کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

☆ اگر سیکولر طریقۂ تعلیم کو اختیار کیا جائے تو پھر اس کے بعض بھیانک نتائج برآمد ہونے کا خطرہ ہے۔

☆ علوم طبیعی کی خالص سیکولر تعلیم سے یہ خطرہ ہے کہ طالب علم الحاد کی طرف مائل ہو جائے گا کیونکہ سیکولرازم فطری طور پر الحاد کی دوست اور مذہب کی مخالف ہے۔ وہ غیر محسوس طریقہ پر آہستہ آہستہ طالب علم کے ذہن کا ایسا سانچہ بنا ڈالے گی کہ وہ فطرت یا اس کے مظاہر ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے گا اور ان کے پس پردہ کار فرما طاقت کا قائل ہی نہیں رہے گا۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ ان علوم کے طالب علم کو ابتداء ہی میں قرآن مجید کی بامعنی تعلیم کے ذریعہ ایک ایسا نقطہ آغاز فراہم کر دیا جائے جو اس کارفرما ہستی کی عظمت و کبریائی اور وحدانیت کا نقش اسکے دل و دماغ پر اس طرح بٹھا دے کہ وہ آگے چل کر اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ پائے بلکہ جوں جوں وہ ذہنی طور پر ترقی کرتا جائے یہ نقش گہرے سے گہرا ہوتا جائے۔

☆ علوم عمرانی کی سیکولر تعلیم کے وہ اس لئے مخالف ہیں کہ اس سے طالب علم کے ذہن میں یہ نقش بیٹھ جاتا ہے کہ اسلام صرف چند معتقدات کے مجموعہ کا نام ہے اور اس کا اپنا کوئی اجتماعی، عمرانی نظام نہیں ہے۔ گویا وہ بھی مسیحیت کی طرح ایک ''دین جزوی'' ہے، ''دین کلی'' نہیں۔ اس قسم کا تاثر اقبال کی نظر میں اسلام ہی کو ترک کر دینے کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ علوم عمرانی کے جدید نظریات کے ساتھ ساتھ اسلام کے عمرانی تصورات کی گہری تعلیم بھی لازماً دی جائے بلکہ اسلام کے ان تصورات کی روشنی میں جدید عمرانی نظریات کو جانچا و پرکھا جائے۔

☆ اقبال کا نہایت واضح اور محکم خیال یہ ہے کہ بالعموم ان تمام علوم کو جن کا تعلق حواس سے ہے (یعنی علوم جدیدہ، کیونکہ علوم جدیدہ، خواہ وہ طبیعی ہوں یا عمرانی ان سب کا ذریعہ حصول حواس ہی ہیں) مسلمان کیا جائے، خصوصاً علوم طبیعی کو کیونکہ ان سے بے پناہ قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس قوت کو قابو میں رکھنا یوں ضروری ہے کہ اسی طرح اس سے انسانیت کی تعمیر اور اس کرۂ ارضی کی خدمت

کا کام لیا جا سکتا ہے ورنہ اگر یہ بے قابو ہو جائے تو سوائے انسانیت کی تخریب اور اس کرہ ارض کے تہس نہس ہو جانے کے کچھ اور ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس کو قابو میں لانے کا اقبال کے نزدیک ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو ''دین کلی'' کے ماتحت کر دیا جائے۔

بولہب را حیدرِ کرار کن!

بقول اقبال ایسے ہی اگر استاد میسر آ جائیں جن کے ایک ہاتھ میں قرآن وسنت اور دوسرے ہاتھ میں دنیاوی تعلیم کا زیور ہو تو پھر جو طالب علم تیار ہوگا وہ......

اِک بندۂ رحمان ☆ قرآن جس کا ایمان
رسالت پر قربان ☆ سنت اس کی میزان
اسلام سے اس کی شان ☆ پکا جا کا پیان
اخلاق اس کی پہچان ☆ کردار اس کی برہان
مجبوروں کا پرسان ☆ تعلیم اس کا میدان
کھیلوں میں بھی میلان ☆ طاقتور جسم و جان
جذبوں کا اِک طوفان ☆ زندہ دِل انسان

وہ فخر پاکستان

# حرفِ آخر

''مثالی استاد''......آج کی نوجوان نسل تو یقیناً جب کتاب کے سرورق پہ یہ نام پڑھے گی تو سوچے گی کہ شاید یہ محض ایک افسانوی تخیل ہے' یا کوئی رومانی طور پر دیا گیا نام ہے لیکن یقین جانئے آج ہی سے چند سال (پچیس' تیس سال) قبل جبکہ پاک و ہند میں مغربی تعلیم کا اس طرح سے زور نہیں چلا تھا ہمیں ایسے اساتذہ کرام آسانی سے دستیاب ہو جاتے تھے جن کا مقصد محض تعلیم پہنچانا ہوتا تھا۔

دور کیوں جایئے......!! بندہ کو خود اپنے سکول' مدرسے اور بعد میں یونیورسٹی کے زمانے میں بے شمار ایسے اساتذہ ملے جن کا مطمع نظر فقط اور فقط پیسے کا حصول نہیں تھا بلکہ ان کے لئے تو اصل دولت وہ تھی جو ان کے شاگردوں کی فصل کی صورت میں تیار ہو رہی تھی۔

یہ تو عجب دور آیا کہ پرائیویٹ سکولوں کی بہتات نے تعلیم کو محض ایک کاروباری ادارہ (اور وہ بھی ہر صورت میں پہلے ہی دن سے نفع بخش) بنا ڈالا۔ وگرنہ تو صورتِ حال اتنی دگرگوں کبھی بھی نہ تھی اور اب تو مذہبی طبقے پر ایک عجب افتاد آ پڑی ہے کہ اب مدرسوں کا وجود بھی ختم کرنے کی شعوری و لاشعوری سی کوشش کر ڈالی گئی ہے۔ پہلے حفظ اور مذہبی تعلیم کے لئے مدارس کا انتخاب کیا جاتا تھا اب تو ایک نیا Trend چلا ہے کہ حفظ بھی ایسے مہنگے اداروں سے کروایا جائے جہاں غریب کا بچہ نہ تو ساتھ بیٹھے اور نہ ہی سکولوں کے باہر ان کی لائن لگی ہوئی نظر آئے۔ بلکہ حفظ کے سکولوں اور مدارس کے باہر بھی گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی ہو۔

اور بندہ دیکھ رہا ہے کہ بھیڑ چال ایسی کہ آج حفظ کیا ...... کل سکول شروع ...... پرسوں بورڈ کے امتحان اور پھر ......... رہے نام اللہ کا۔

کیا یہی وہ ڈیڑھ دو ہزار روپے لے کر قرآن حفظ کروانے والے ادارے تھے جنہوں نے مدارس کی آبیاری کی' کیا یہیں سے ایسے نابغہ روزگار علماء کرام پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف برصغیر میں بلکہ پوری دنیا میں اسلام کا جھنڈا لہرایا۔

خدارا! غور کیجئے آج اگر آپ کو اللہ عزوجل نے (چاہے آپ کی سعی تھی یا نہیں) استاد کے عظیم الشان مرتبے پر فائز کردیا ہے تو اس ذات کا ہر ممکن شکر ادا کیجئے جس نے آپ کو اس عہدہ پہ مامور کیا۔ اب اس کی قدر کیجئے اور آپ جس بھی تعلیمی شعبے میں ہیں اس میں اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی حتی الوسع کوشش سے خود بھی ایک ایسے "رول ماڈل" بنئے جو طالب علموں کی زندگی میں انقلاب بپا کرڈالے اور ایسے طالب علم بھی تیار کرڈالئے جو آگے چل کر نہ صرف خطابت و نظامت کے فرائض احسن طریقے سے انجام دے سکیں بلکہ دُنیا کی بزم و رزم میں بھی اپنا لوہا منوا سکیں۔

اللہ ہمارا اور آپ کا حامی و ناصر ہو۔

مرتب

حافظ محبوب احمد خان

ہر بچہ فطرت انسانی کے قریب پیدا ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے والدین یا استاد کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی تربیت کرے تاکہ اس کے بچے بھی قیامت کے دن کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ ہم سب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں جواب دہ ہیں، ہم سے ہمارے بچوں کی کفالت کے بارے میں ہی سوال نہ کیا جائے گا بلکہ اس کی تربیت اور اخلاق و کردار کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔

بچوں کے دلوں میں دلائل و حقائق کے ساتھ ایمان پیدا کرنا، انہیں قرآن مجید کی تعلیم دلانا، اسلامی عادات و آداب سکھانا اور ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت بٹھانا مسلم معاشرے کی ہمیشہ سے روایت رہی ہے اور اس میں اساتذہ کرام کا مقام سب سے بلند ہے۔

آج ہم اپنے معاشرے میں بھی دیکھ رہے ہیں کہ بچوں کی دینی و اسلامی تربیت سے صرفِ نظر کرنے کی وجہ سے بچے جوں جوں بڑے ہو رہے ہیں اساتذہ سے باغی ہو رہے ہیں۔ اساتذہ کی بڑی اکثریت اس وجہ سے پریشان ہے کہ شاگردان کا کہنا نہیں مانتے اور ان کا احترام نہیں کرتے۔ اگر بچوں کی صحیح اسلامی تربیت کی جائے گی تو وہ اپنے رب کے بھی فرمانبردار اور مطیع ہوں گے اور اس کے بعد اپنے اساتذہ کے بھی اور اس طرح دنیا میں بھی سکون اور ٹھنڈک محسوس ہوگی اور آخرت میں بھی انہیں بچوں کی دینی تربیت کا صلہ ملے گا اور اس تربیت کی وجہ سے ان کی روحانی اولاد بھی ان کے پیچھے پیچھے جنت میں جائے گی۔

مکتبۃ العلم